ائمہ معصومینؑ
کی سیاسی زندگی کا تحقیقی جائزہ

استاد عادل ادیب

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

[illegible]

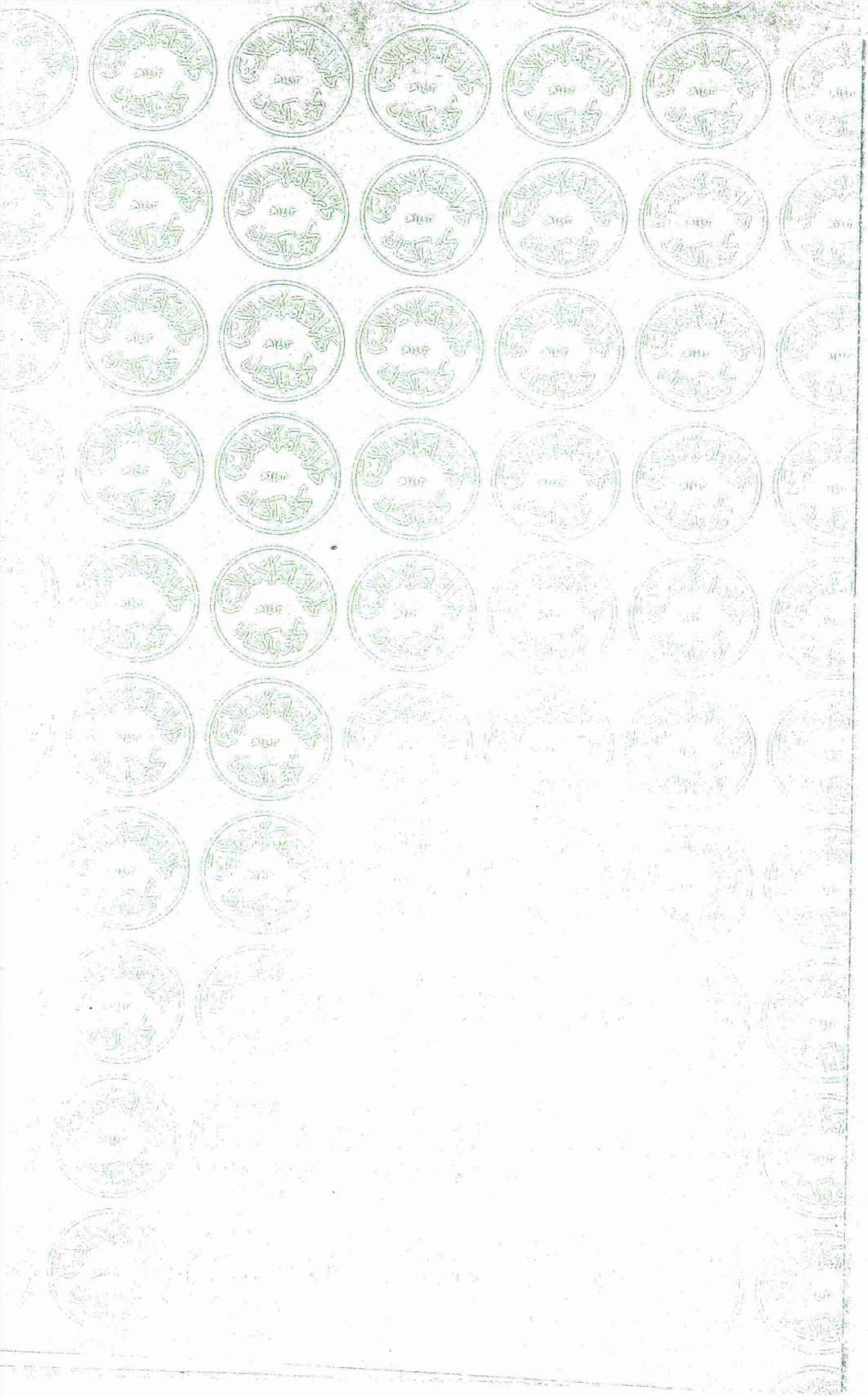

2685

ائمۂ معصومینؑ

کی سیاسی زندگی کا تحقیقی جائزہ

تالیف

استاد عادل ادیب

مترجم

محمد علی توحیدی

یکے از مطبوعات

دارالثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

۲ - جے - ۵/۴ ـــ ناظم آباد ـــ نمبر ۲ ـــ کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب ------------ ائمہ معصومین ؑ کی سیاسی زندگی کا تحقیقی جائزہ

تالیف ------------------------- استاد عادل ادیب

ترجمہ ------------------ حجۃ الاسلام محمد علی توحیدی بلتستانی

تصحیح و تہذیب --------------------- سید سعید حیدر زیدی

ناشر -------------------- دار الثقافۃ الاسلامیہ پاکستان

طبع اوّل ------------ .... ربیع الاول ۱۴۲۱ھ سنہ ۲۰۰۰ء

تعداد ------------------------------------ ۲۰۰۰

786
I

ACC No. 107008 Date 08/1/02
Section اسلام بعد سیاست Status ....
D.D. Class ....
NAJAFI BOOK LIBRARY

ترتیب

○ عرضِ ناشر ــــــــ ۱۱

○ مقدمہ ۔ اصولِ سیرت شناسی ــــــــ ۱۳

○ تمہید ۔ سیرتِ ائمہؑ کے مطالعہ کی روش ــــــــ ۵۷

پہلا زاویۂ نگاہ ــــــــ ۵۷

دوسرا زاویۂ نگاہ ــــــــ ۵۸

تاریخِ اسلام میں ائمہؑ کا کردار ــــــــ ۶۰

معاشرتی و اجتماعی امور میں اسلام کی حکمتِ عملی ــــــــ ۶۸

مذکورہ حکمتِ عملی اور ائمہؑ کی اصلاحی جدوجہد میں ہم آہنگی و ارتباط ــــــــ ۷۱

ائمہؑ کی عملی روش کی وضاحت اور اس پر بحث کے سلسلہ میں ہمارا طریقۂ کار ۔ ۸۰

○ پہلا حصہ ۔ حیاتِ پیغمبرؐ میں دعوتِ اسلامی کے مراحل ــــــــ ۸۵

حیاتِ پیغمبرؐ میں دعوتِ اسلامی کے مراحل ــــــــ ۸۷

پہلا مرحلہ ــــــــ ۸۷

دوسرا مرحلہ ــــــــ ۹۱

طائف کا سفر ـــــــــــ ۹۳
ہجرت یا نئے مرکز کی طرف منتقلی ـــــــــــ ۹۹
تیسرا مرحلہ ـــــــــــ ۱۰۱
دعوت کا مستقبل اور رسولؐ کا موقف ـــــــــــ ۱۰۳
پہلا راستہ ـــــــــــ ۱۰۴
دوسرا راستہ ـــــــــــ ۱۰۸
تیسرا راستہ ـــــــــــ ۱۱۴
○ دوسرا حصہ ۔ ائمہؑ اور عمل کے مراحل ـــــــــــ ۱۲۱
○ پہلا مرحلہ ـــــــــــ ۱۲۳
○ امام علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام ـــــــــــ ۱۲۵
مقدمہ ـــــــــــ ۱۲۵
(۱) سقیفہ کی سوچ ـــــــــــ ۱۲۶
(۲) تقسیمِ اموال میں حضرت عمر کی روش ـــــــــــ ۱۲۷
(۳) شوریٰ ـــــــــــ ۱۲۸
حضرت عثمان کے خلاف بغاوت اور حضرت علیؑ کا موقف ـــــــــــ ۱۲۹
قبولِ حکومت میں امامؑ کا موقف ـــــــــــ ۱۳۴
حضرت علیؑ منصبِ خلافت پر ـــــــــــ ۱۳۶
باہمی کشمکش میں امامؑ اور معاویہ کی پالیسیوں کی نوعیت ـــــــــــ ۱۴۵
(۱) بعض اصحاب کا رویہ ـــــــــــ ۱۶۰
(۲) ابو موسیٰ اشعری کی طرف سے لوگوں کی غلط تلقین ـــــــــــ ۱۶۱

(۳) بنی امیہ اور بنی ہاشم کی پرانی باہمی رنجش ______ ۱۶۱
کیا گٹھ جوڑ سے انکار ہٹ دھرمی کی وجہ سے تھا؟ ______ ۱۶۵
○ امام حسن ابنِ علی علیہ السلام ______ ۱۷۷
صلح توڑنے کا مطالبہ ______ ۱۸۹
امام حسنؑ کے موقف کی حمایت ______ ۱۹۴
○ امام حسین ابنِ علی علیہ السلام ______ ۱۹۵
حسینؑ قیام کرتے ہیں ______ ۱۹۸
انقلاب کو روکنے کی کوششیں اور انحراف کا مقابلہ نہ کرنے کے نصائح ______ ۲۰۱
قیام کب جائز ہوتا ہے؟ ______ ۲۰۴
مرگِ معاویہ کے بعد امام حسینؑ کا موقف ______ ۲۱۹
شکست خوردہ ذہنیت اور امام حسینؑ ______ ۲۲۷
حسینیؑ انقلاب کے آثار و نتائج ______ ۲۳۴
(۱) بنی امیہ کی دینی حیثیت کا خاتمہ ______ ۲۳۴
(۲) احساسِ جرم ______ ۲۳۵
(۳) جدید اخلاق و خصائل ______ ۲۳۶
(۴) جذبۂ مقاومت ______ ۲۳۸
○ امام علی ابنِ حسین علیہ السلام ______ ۲۴۵
امام سجادؑ احساسِ جرم و ندامت کو بڑھاتے ہیں ______ ۲۴۷
امام سجادؑ کا کردار امت کے حوالے سے ______ ۲۴۹
امام سجادؑ کے بارے میں غلط تصورات ______ ۲۵۱

○ تیسرا حصہ ____ ۲۵۹
○ دوسرا مرحلہ ____ ۲۶۱
○ امام محمد باقر علیہ السلام ____ ۲۶۳
امام محمد باقر علیہ السلام امت کی نظر میں ____ ۲۶۴
امام محمد باقر علیہ السلام تشیع کا تعارف کراتے ہیں ____ ۲۶۷
پہلا راستہ ____ ۲۶۸
دوسرا راستہ ____ ۲۶۹
امامؑ کے منصوبے اور راستے کی رکاوٹیں ____ ۲۷۱
○ امام جعفر صادق علیہ السلام ____ ۲۷۹
امتِ مسلمہ امام جعفر صادقؑ کے دور میں ____ ۲۷۹
انتخابِ راہ اور منصوبہ بندی ____ ۲۸۱
تحریک کی کامیابی کے اسباب ____ ۲۸۶
امام جعفر صادقؑ کے منصوبوں کا جائزہ ____ ۲۸۸
تحریکی اقدامات ____ ۲۸۸
(۱) اعلانیہ ٹکراؤ کا اسلوب ____ ۲۸۹
(۲) تعمیری اسلوب ____ ۲۹۰
مسلحانہ اقدام سے امامؑ کا انکار ____ ۳۰۱
○ امام موسیٰ ابنِ جعفر علیہ السلام ____ ۳۱۱
امامؑ کی سرگرمیاں اور ان کی حدود ____ ۳۲۱
(۱) آپؑ کی خفیہ سرگرمیاں ____ ۳۲۱

(۲) آپؑ کی اعلانیہ سرگرمیاں ______ ۳۲۴
امامؑ کے خلاف شکایتیں ______ ۳۲۵
○ تیسرا مرحلہ ______ ۳۲۹
○ امام علی ابنِ موسیٰ الرضا علیہ السلام ______ ۳۳۱
تمہید ______ ۳۳۱
امام رضاؑ اور علوی تحریکیں ______ ۳۳۵
امامؑ کی ہر دلعزیزی ______ ۳۳۶
اعلانیہ سرگرمیوں کی قیادت ______ ۳۳۷
امامؑ اور مطالبۂ حکومت ______ ۳۴۱
امامؑ کے بارے میں مامون کا موقف ______ ۳۴۳
امامؑ نے کیوں خلافت قبول نہ کی؟ ______ ۳۵۸
○ امام محمد تقی الجواد علیہ السلام ______ ۳۶۴
امامؑ کی کم سنی ______ ۳۶۶
پہلا مفروضہ ______ ۳۶۹
دوسرا مفروضہ ______ ۳۷۰
تیسرا اور آخری مفروضہ ______ ۳۷۲
○ امام علی نقی الہادی علیہ السلام ______ ۳۷۵
امامؑ کی نگرانی ______ ۳۷۷
چغل خوروں کی ناکامی ______ ۳۷۸
جدید حالات و مسائل اور امامؑ کا لائحۂ عمل ______ ۳۸۱

امامؑ کی منصوبہ بندی کے مقابلے میں بنی عباس کا موقف ______ ۳۸۳
علوی تحریکیں اور ''الرضا من آلِ محمدؐ'' کی طرف دعوت ______ ۳۸۵
○ امام حسن عسکری علیہ السلام ______ ۳۸۹
حالات کے مقابلے کے لئے آپؑ کا موقف ______ ۳۹۱
پہلی پالیسی (حکومت اور حکمرانوں سے برتاؤ کے لحاظ سے) ______ ۳۹۱
دوسری پالیسی (علمی، فکری و نظریاتی تربیت کے نقطہ نظر سے) ______ ۳۹۵
تیسری پالیسی (حامی عناصر کی سرپرستی اور بیداری کے سلسلے میں) ______ ۳۹۶
چوتھی پالیسی (غیبت کی تیاری کے سلسلے میں) ______ ۳۹۹
امام حسن عسکریؑ اپنے بیٹے کی غیبت کے لئے راہ ہموار کرتے ہیں ______ ۴۰۱
○ امام مہدی علیہ السلام ______ ۴۰۷
امام مہدیؑ کی ولادت کن حالات میں ہوئی؟ ______ ۴۰۹
آپؑ کی ولادت ______ ۴۰۹
امام مہدیؑ کے بارے میں امام حسن عسکریؑ کی ذمہ داری ______ ۴۱۰
جعفر بن علی کی مخبری ______ ۴۱۳
غیبتِ صغریٰ ______ ۴۱۶
حکام کی طرف سے امامؑ کی تلاش ______ ۴۱۷
امامؑ اور ٹھوس تنظیمی عمل ______ ۴۲۰
نوابِ اربعہ کا تذکرہ ______ ۴۲۳
سفارت (نیابتِ خاص) کے اہداف ______ ۴۲۶
○ اختتامیہ ______ ۴۲۹

خلاصۂ بحث ____ ۴۲۹

حکمتِ عملی کا اسلامی نظریہ ____ ۴۳۱

اسالیبِ عمل کے بنیادی محور ____ ۴۳۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

زیرِ نظر کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک منفرد اور اچھوتی تالیف ہے۔ کیونکہ اس سے قبل تک خود عربی زبان میں (جس سے کتاب کا ترجمہ کیا گیا ہے) کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جس میں ایک ساتھ تمام ائمہؑ کی سیاسی زندگی کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہو اور مشترک سیاسی ہدف کو سامنے رکھتے ہوئے ہر ایک کے جدا جدا لائحہ رعمل پر تاریخی حوالوں کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہو۔

سیرتِ ائمہؑ کا جائزہ خود ایسے موضوعات میں سے ہے جو بہت زیادہ مطالعہ اور انتہائی گہری نظر کا متقاضی ہے اور ائمہؑ کی سیاسی زندگی، تو کیونکہ حیاتِ ائمہؑ کا یہ پہلو مختلف وجوہ کی بناء پر اوجھل رہا ہے اس لئے اس کے بارے میں بحث و گفتگو مزید کٹھن اور دشوار کام ہے۔

کتابِ ہذا کے مولف استاد عادل ادیب جنہیں عراق کے انقلابی رہنما حضرت آیت اللہ العظمیٰ شہید سید محمد باقر الصدرؒ کے محضرِ علمی سے فیض کا شرف حاصل رہا ہے انہوں نے اس تالیف میں بڑی حد تک شہید صدرؒ ہی کی فکر سے استفادہ کیا ہے۔ اور تاریخی اسناد کے ساتھ تمام ائمہؑ کے دور کے سیاسی حالات، حکمرانوں کی کیفیت اور ان کے کردار کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے مقابلے کے

لئے ائمہؑ کے لائحہ عمل اور طریقہ کار پر روشنی ڈالی ہے۔

بقولِ علما قرآنِ کریم کے سوا کوئی کتاب غلطیوں سے مبرہ نہیں اور قولِ معصومینؑ کے سوا کوئی قول حرفِ آخر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لہٰذا ہر کتاب کے مندرجات سے اختلاف کی گنجائش پائی جاتی ہے اسی بنا پر اس کتاب کو بھی حرفِ آخر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ادارہ عربی، فارسی کتب کو ان کی مجموعی افادیت کے پیشِ نظر ترجمہ کے لئے منتخب کرتا ہے اور مقصود یہ بھی ہوتا ہے کہ اردو زبان میں دینی لٹریچر میں اضافہ ہو تاکہ ایک طرف تو عام افرادِ ملت اس سے مستفید ہوسکیں اور دوسری طرف ذوقِ تحقیق رکھنے والے حضرات کے سامنے خود انہی کی زبان میں مواد موجود ہو۔ کتابِ ہذا بھی اسی جذبہ کے تحت ترجمہ کی گئی ہے۔

کتاب کے ترجمہ کے لئے ہم نے حجۃ الاسلام والمسلمین جناب محمد علی توحیدی کو زحمت دی، جنہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود انتہائی امانت داری کے ساتھ اسے عربی سے اردو کے قالب میں ڈھالا، خدا ان کی زحمتوں کو قبول اور توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

ناشر

مقدمہ

اصولِ سیرت شناسی

حدیثِ ثقلین کی رو سے ثقلِ اکبر قرآنِ کریم اور ثقلِ اصغر اہلِ بیتِ معصومینؑ ہیں۔ سیرتِ معصومینؑ دراصل ثقلِ اکبر قرآنِ کریم کی عملی تفسیر ہے۔

اہلِ بیتؑ قرآنی تعلیمات کا پیکر اور جیتا جاگتا نمونہ ہیں، جو مختلف حالات و شرائط، زمان و مکان میں اپنے عمل سے قرآنی اصولوں اور تعلیمات کا عملی مظاہرہ کرتے ہیں۔ کن حالات میں قرآن کیا راہ و روش اپنانے کی تاکید کرتا ہے یہ ہمیں اہلِ بیتؑ کی سیرت و روش کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔

بعض حضرات کا یہ سمجھنا کہ سیرتِ معصومینؑ کا مطالعہ اور اس پر بحث و گفتگو کسی خاص محنت اور عرق ریزی کی محتاج نہیں، درست نہیں ہے۔ جس طرح قرآنِ کریم کی آیات کی تفسیر اور ان سے مفاہیم اخذ کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں اسی طرح سیرتِ معصومینؑ سے کوئی مطلب اخذ کرنا اور اپنے لئے رہنمائی حاصل کرنا بھی آسان کام نہیں ہے۔

بالکل اسی طرح جیسے آیاتِ قرآنی کے شانِ نزول اور ترتیبِ نزول سے ناواقف افراد قرآن فہمی سے عاجز ہوتے ہیں۔ اسی طرح سیرتِ ائمہؑ پر کلی نظر

رکھے بغیر اور معصوم کے دور کے حالات سے مکمل آشنائی کے بغیر سیرتِ معصومین سے شناسائی بھی مشکل بلکہ تقریباً ناممکن بات ہے۔

مذکورہ بالا تصور یعنی سیرتِ معصومینؑ کو سہل سمجھنے اور اس پر توجہ نہ دینے کی بنا پر رفتہ رفتہ سیرت پر تحقیقاتی کام غیر ضروری سمجھا جانے لگا اور یوں مرورِ ایام کے ساتھ سیرتِ معصومینؑ کو سمجھنا ایک معمہ کی مانند ہوگیا۔

یہی وجہ ہے کہ ائمہ معصومینؑ کے پیروکار اور ان پر سچا عقیدہ رکھنے والے بھی سیرتِ معصومینؑ کا تجزیہ کرنے سے عاجز نظر آتے ہیں اور جب معصومین کی ایک دوسرے سے متضاد روشوں کی حقیقت نہیں جان پاتے تو سیرتِ معصومینؑ کو بھی متضاد سمجھنے لگتے ہیں اور یوں ان کے بارے میں بے حساب شکوک و شبہات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور کیونکہ ائمہؑ کی عصمت کے قائل ہوتے ہیں اور انہیں نمونہ کامل سمجھتے ہیں لہٰذا جو لوگ کچھ کرنے پر تیار نہیں ہوتے، ہمیشہ حالات کا خوف اور مصلحتیں انہیں گوشہ نشینی پر اکساتی ہیں وہ اپنی اس روش کو امام حسنؑ کی صلح جوئی کی جانب نسبت دیتے ہیں۔ جو جوش و ولولہ کے ساتھ بے دریغ اقدام کو پسند کرتے ہیں وہ امام حسینؑ کی روش کو اپنے لئے نمونہ عمل قرار دیتے ہیں۔ جو فطرتاً درس و تدریس، علم و دانش کی طرف مائل ہوتے ہیں وہ اپنی اس روش کے اثبات میں امام جعفر صادقؑ کی مثال پیش کرتے ہیں۔ اس موقع پر وہ ان معصومینؑ کی روش و اسلوب کے اس فرق کی وجہ کا تجزیہ نہیں کرتے، اپنے حالات کا ان کے زمانہ کے حالات سے موازنہ نہیں کرتے۔ اگر ان حضرات میں یہ صلاحیت ہوتی تو کسی صورت ایک ہی وقت میں یہ تین روشیں اختیار نہ کرتے بلکہ اپنے لئے وہ روش منتخب کرتے جو اس معصوم نے اختیار کی تھی جسے ایسے

حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا جیسے ان کے دور میں ہیں۔ اپنے اس عمل سے یہ حضرات اس آیتِ قرآن کے مصداق بن جاتے ہیں کہ "یومن ببعض و یکفر و بعض"

اس طرزِ عمل کے نتیجے میں صورت یہ ہوگئی ہے کہ ہم میں سے ہر ایک فرد کسی ایک معصومؑ کی پیروی کرتا ہے، ائمہ اثنا عشر کی نہیں۔ جب کہ تمام معصومین نورِ واحد ہیں، سب کی سیرت سیرتِ واحدہ ہے اور یوں ہم اہلِ بیتؑ کی تاسی سے منحرف ہو چکے ہیں، ان کی پیروی چھوڑ چکے ہیں اور اس کے نتیجے میں بقولِ رسولِ مقبولؐ ضلالت و گمراہی کا شکار ہیں۔

آج ہمیں درپیش مصائب و مشکلات، ذلت و خواری اور فکری اضطراب کا بڑا سبب ثقلین سے عدم شناسائی اور عدم وابستگی ہے گو ثقلِ اکبر قرآنِ کریم کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن ثقلِ اصغر اہلِ بیتؑ کے بارے میں تحقیقی کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس سلسلہ میں ہم جو کچھ پڑھتے، سنتے ہیں وہ سب فقط تقلیدی شکل میں ہے اور وہ بھی محض بعض نکات کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے مثلاً ائمہ کی تاریخِ ولادت، تاریخِ شہادت، چند کرامات اور کچھ معجزات----

اپنی جگہ پر ان مذکورہ چیزوں سے آشنائی ضروری ہے لیکن یہ ہمارے لئے قابلِ تاسی نہیں ہم ان چیزوں میں ائمہ کی تقلید نہیں کرسکتے۔ یہ وہ فضائل و کمالات ہیں جو خاص ان کے لئے مخصوص تھے ہم حاصل نہیں کرسکتے۔ ہمارے لئے ائمہؑ کی جو چیز قابلِ تاسی ہے وہ ان کے گفتار وہ کردار ہیں، وہ ان کی عملی اور قولی ہدایات ہیں۔ ایک انسان کو اپنے ہم مذہب افراد کے ساتھ کس طرح رہنا چاہیئے، غیر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ رہن سہن کیسا ہو، اپنے مخالفین سے کیا

برتاؤ ہو' اگر برسرِ اقتدار ہوں تو کیا طرزِ عمل ہو' اقتدار سے دوری اور حزبِ اختلاف میں رہتے ہوئے کیا کردار ہونا چاہئے' کس نظامِ سیاست کی تائید کرنی چاہئے' مختلف احزاب و گروہوں سے روابط کس نوعیت کے ہونے چاہئیں---- افسوس زندگی کے ان مذکورہ پہلوؤں پر ائمہؑ کی تعلیمات کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ لیکن صد شکر کہ ابھی گزشتہ چند دہائیوں میں ان موضوعات پر بعض علماء نے قلم اٹھایا ہے جن میں شہید صدر علیہ الرحمہ اور شہید مطہریؒ سرِفہرست ہیں۔

تقلیدی انداز سے ہٹ کر ایک جامع اور واضح سیرت پیش کرنے کے لئے بہت زیادہ محنت و کوشش اور زحمت کی ضرورت ہے۔ تاہم اس موضوع میں کامیابی کے لئے دو باتیں ازبس ضروری ہیں۔ ایک تو اس سلسلہ میں خود ائمہؑ کی عنایت و توجہ لازم ہے جس کے نتیجہ میں خداوندِ متعال کوشش کرنے والے کے سامنے فکر کے نئے نئے دریچے وا کرے۔ دوسرے اربابِ فکر و نظران تحریروں کا تنقیدی نگاہ سے جائزہ لے کر ان کی خامیوں اور استدلال کی کمزوریوں سے خلوصِ نیت کے ساتھ آگاہ کریں۔

☆-----☆-----☆-----☆

ہر علم کے بعض معین قواعد و اصول ہوتے ہیں۔ صرف و نحو' منطق' فلسفہ' فقہ' تفسیر' عقائد' طبیعیات' کیمیا' ریاضی' ادب غرض تمام علوم کے خاص اصول ہوتے ہیں۔ جن پر توجہ کے بعد ہی ان علوم سے گہری شناسائی اور ان میں مہارت حاصل کی جا سکتی ہے۔ بالفاظِ دیگر اصول کہا ہی اس جڑ' بنیاد یا Base کو جاتا ہے جس پر علوم و فنون اور عقائد و نظریات قائم ہوتے ہیں اور جن کو کسوٹی بنا کر ان

علوم کی چھان پھٹک کی جاتی ہے۔ لہٰذا سیرتِ ائمہؑ کی درست شناخت اور اس سے صحیح صحیح استفادہ کے لئے بھی کچھ اصول و قواعد کو جاننے و سمجھنے کی ضرورت ہے۔ خود یہ اصول و ضوابط بھی قول، فعل یا تقریر کی صورت میں ائمہؑ سے منسوب ہیں۔ ان اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر سیرتِ ائمہؑ کا مطالعہ کیا جائے تب ہی انسان کسی نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے اور یہ مطالعہ اس کے لئے بامقصد ہو سکتا ہے بصورتِ دیگر سیرتِ معصومینؑ کے مطالعہ کے نتیجے میں اس کے پاس معلومات کا ایک ذخیرہ جمع ہوتا رہے گا اور یہ معلومات اس کے سامنے سیرتِ ائمہؑ کی متضاد اور ایک دوسرے سے متصادم تصویریں پیش کریں گی، جن کا ہر امامؑ کی زندگی کا انفرادی طور پر جائزہ لینے سے مشاہدہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم ذیل میں نکات کی صورت میں چند اصول پیش کر رہے ہیں جنہیں پیشِ نظر رکھ کر سیرتِ ائمہؑ کا مفید، سود مند اور نتیجہ خیز مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱) سیرت کے لغوی و اصطلاحی معنی۔

(۲) سیرت شناسی کی ضرورت۔

(۳) سیرت شناسی کے اہداف۔

(۴) سیرت نگاری کے انواع و اقسام۔

(۵) ائمہؑ کی جدوجہد کے مشترکہ مرکزی نکات۔

(۶) سیرت شناسی میں حائل رکاوٹیں۔

☆ سیرت کے لغوی و اصطلاحی معنی

سیرت کا لفظ اسمِ مصدر ہے اور سار یسر سے مشتق ہے، یعنی سار یسر سے لیا

گیا ہے۔ مادہ سیرہ و یسر کے لئے لغت میں بہت سے مصادر نقل ہوئے ہیں۔ یہ حرکت، سیر، روش و رفتار، حالت اور ہیت کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔

قرآنِ کریم کی سورۂ مبارکہ یوسف آیت۱۰۹، سورہ قصص آیت۲۹، سورہ انعام آیت۶ اور ۱۱، سورہ نباء آیت۲، سورہ طہ آیت۲۱ اور سورہ یونس آیت ۲۲ میں یہ مادہ استعمال ہوا ہے۔

سیر بروزنِ فعلہ، خاص طریقۂ زندگی کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں سیرت پیغمبرؐ ائمہ اطہارؑ صلحاء و علماء، اہلِ مذہب اور نمایاں شخصیات کے طرز و روشِ زندگی کو کہتے ہیں۔

☆ سیرت شناسی کی ضرورت

انبیاءؑ و ائمہؑ کی سیرت سے شناسائی کی ضرورت مختلف وجوہ کی بنا پر محسوس کی جاتی ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ ائمہؑ کی سیرت اور زندگی ہمارے لئے محض ایک مثالی طرزِ حیات ہی نہیں بلکہ خدا کی طرف سے ایک حجتِ بالغہ ہے، جس سے بے خبری و گریز ضلالت و گمراہی کا موجب ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ان حضرات کو اپنی طولِ حیات میں ان تمام حالات کا سامنا رہا ہے جو ایک انسان کو پیش آسکتے ہیں۔ یعنی اگر ایک انسان کی پوری زندگی میں پیش آنے والے مسائل کی ایک فہرست مرتب کی جائے تو اس میں جو مسائل درج ہوں گے ان تمام سے ان ہستیوں کو سروکار رہا ہے۔ جنگ، صلح، امن، تجارت، لین دین، معاہدات، شخصی میل جول، اجتماعی روابط، اپنے ہم فکر

و ہم مذہب لوگوں کے درمیان زندگی بسر کرنا، غیر مذہب لوگوں کے درمیان زندگی گزارنا وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان تمام مسائل کا ہر امامؑ کو سامنا نہیں ہوا لیکن کیونکہ ہم تمام ائمہؑ کو نورِ واحد، سیرتِ واحد سمجھتے ہیں اس لئے ہم مجموعی طور پر تمام ائمہ کی سیرت سے استفادہ کرتے ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ کسی مسئلہ کے بارے میں ائمہؑ کی سیرت و روش کا ثبوت اور یقین حاصل ہو جانے کے بعد اس پر عمل ان کی تاسی و پیروی کہلاتا ہے۔ سیرتِ ائمہ کی معرفت دراصل ان کی تاسی کے سلسلے میں ایک قدم ہے جس کا ذکر آیات و روایات میں کبھی تمسک، کبھی حجت، کبھی اسوہ، کبھی اتباع اور کبھی پیروی کے الفاظ میں ہوا ہے۔

☆ سیرت شناسی کے اہداف

ہم یہاں سیرت شناسی کے بعض اہداف و مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے ان میں سے انسب و بہترین کی نشاندہی کریں گے۔

(۱) اجر و ثواب کا حصول

بہت سے مومنین کی نظر میں ائمہ معصومینؑ کی سیرت کو پڑھنے اور سننے کا مقصد محض اجر و ثوابِ آخرت ہے۔ بے شک سیرتِ ائمہؑ کا مطالعہ اور ان حضرات کی حیات کے متعلق گفتگو اجر و ثواب کا موجب ہے، لیکن اس بارے میں مندرجہ ذیل دو نکات قابلِ غور و توجہ ہیں۔

(۱) کیا ہر وہ چیز جو ائمہؑ کے حوالہ سے لکھی یا بولی جائے خواہ وہ غیر مستند اور من گھڑت ہو اس کا پڑھنا اور سننا اجر و ثوابِ آخرت کا موجب ہو سکتا ہے؟

(۲) خداوندِ عالم کی جانب سے اجر و ثواب کا باعث قرار دیئے گئے اعمال خود کوئی نہ کوئی فلسفہ بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً زکات و انفاق کو اجر و ثواب کا باعث بتایا گیا ہے تو اس کا فلسفہ بھی ظاہر و باہر ہے کہ اس کے ذریعہ فقراء و مساکین کی اعانت کی جاتی ہے اور معاشرہ سے طبقاتی تفاوت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ لہٰذا سیرتِ ائمہؑ کے مطالعہ اور گفتگو کے اجر و ثواب کا بھی کوئی فلسفہ ہے یا نہیں؟

(۲) ذخیرۂ معلومات جمع کرنا

سیرت تاریخ کا حصہ ہے، تاریخ علم ہے اور حصولِ علم بذاتِ خود مستحسن عمل ہے۔ دنیا کی ہر قوم اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقفیت چاہتی ہے، ان پر اظہارِ فخر کرتی ہے لہٰذا بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ہمیں بھی اپنے ائمہؑ کی سیرت سے آگاہ ہونا چاہئے۔ ایسی ذواتِ مقدسہ کے حالاتِ زندگی جاننے سے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر علم بذاتِ خود فضیلت رکھتا ہے، کیا ایک علم کو دوسرے پر فضیلت ہوتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس فضیلت کی کسوٹی کیا ہے؟ ظاہر ہے جو علم جس قدر مقدس اور بامقصد ہوگا اسی قدر اس کی فضیلت و اہمیت بھی زیادہ ہوگی۔ لہٰذا اگر علمِ سیرتِ انبیاء و ائمہؑ کسی خاص مقصد و ہدف کا حامل نہ ہو تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہو سکتی۔

(۳) مطالعۂ سیرت برائے پیروی

ایک بامعنی و باسعادت زندگی بسر کرنے کے واسطے انسان کے لئے صرف نظریہ و تھیوری ہی کافی نہیں بلکہ اسوۂ عمل اور نظریہ پر کاربند ہستیاں بھی ضروری

ہیں۔ تاریخِ انسانی میں بہت سے ایسے افراد گزرے ہیں جنہوں نے گرانقدر نظریات کا پرچار کیا لیکن ان نظریات کا کوئی عملی نمونہ پیش کرنے سے قاصر رہے حتیٰ خود اپنے پیش کردہ نظریات کے خلاف مصروفِ عمل رہے۔

ہمیں ایسے صاحبِ نظر حضرات کی ضرورت ہے جن کے نظریات حق و صداقت پر مبنی ہوں غلطی اور خطا سے پاک ہوں، نشیب و فراز اور سخت حالات میں بھی اپنے نظریات سے سرِمو منحرف نہ ہوئے ہوں اور ان پر پورا پورا عمل کرکے دکھایا ہو۔ انبیاء الٰہی اور ائمہ طاہرینؑ اس مقدس گروہ میں سرِفہرست ہیں، ان کے سرخیل ہیں۔ ان ہستیوں نے نشیب و فراز سے بھرپور اپنی حیاتِ طیبہ میں ایک لمحہ کے لئے بھی حق سے انحراف نہیں کیا بلکہ ان کے ذہن میں بھی کبھی یہ خیال نہ آیا۔ ہمارے اس دعویٰ پر ان کی پوری زندگی گواہ ہے۔ ہم ان کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ اس لئے کرتے ہیں، اس لئے ان کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تاکہ اپنی زندگی کو ان کے نقشِ قدم پر استوار کرسکیں، ان کی بتائی ہوئی راہ کی پیروی کرسکیں، ان کی طرق و روش کے مطابق اپنی زندگی کا دستورالعمل ترتیب دے سکیں۔

ان کی پیروی کے وجوب پر دلیل کے طور پر ہمارے پاس متعدد آیات و روایات موجود ہیں۔ مثلاً سورہ نساء کی آیت نمبر۴۵، حدیثِ ثقلین اور وہ تمام روایات جن میں اہلِ بیتِ رسولؐ کو صراطِ مستقیم، وجہ اللہ، سبیل اور میزانِ اعمال بتایا گیا ہے۔

☆ سیرت نگاری کی انواع واقسام

سیرت نگاری کی مختلف اقسام درجِ ذیل ہیں۔

(۱) سیرتِ نقلی

ائمہؑ کی سیرت کے حوالے سے جو کچھ کتبِ سیرو تاریخ میں ملتا ہے وہ ائمہؑ کی سیرتِ نقلی ہے۔ جیسے تاریخِ ولادت و شہادت، جنگی کارنامے، زوجات و کنیزوں کی تعداد، فرزندوں کی تعداد، جود و سخا کے مظاہر، معجزات و کرامات، ائمہؑ پر پڑنے والے مصائب و حوادث کا بیان وغیرہ۔ یہ در حقیقت سیرت شناسی کے سلسلہ میں موادِ اولیہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن ان میں بہت سی باتیں حقیقت پر مبنی ہیں اور بہت سی خلافِ حقیقت بھی پائی جاتی ہیں۔ جن میں بسا اوقات ائمہؑ کی تنقیص کا پہلو بھی نکلتا ہے اور ایسی ہی چیزیں ائمہؑ کی سیرت کو معمہ اور ان کی راہ و روش کو سمجھنا مشکل بنا دیتی ہیں۔ لہٰذا ائمہؑ کی سیرتِ نقلی کو چھان بین اور تحقیق کے بعد ہی معتبر مانا جا سکتا ہے۔

(۲) ائمہؑ کے فضائل و مناقب علم، عصمت اور اخلاق کا بیان

اہلِ بیتِ رسولؐ خاص کر ائمہ اثنا عشرؑ کے فضائل و مناقب ان کے منصبِ امامت کی اہلیت و صلاحیت کی دلیل ہیں ان مناقب کا بیان اور ان سے اہلِ بیتؑ کی حقانیت اور ان کے سزاوارِ منصبِ امامت و خلافت ہونے کا استدلال۔ اس طرح کی کتب ائمہؑ کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لئے تحریر کی جاتی ہیں لہٰذا ان کا مطالعہ ایسے لوگوں کے لئے سودمند ہوتا ہے جو ان پر ایمان نہیں رکھتے۔

(۳) عنصرِ غیبی کا بیان

یعنی ائمہؑ کی سیرت کے غیبی عنصر کا بیان اور یہ تاثر کہ ان بزرگواروں کے

اقدامات کسی خاص غیبی ہدایت کے تابع ہوتے تھے' یہ ذواتِ مقدسہ معصوم ہیں ان کی حرکات و سکنات کے بارے میں ہمیں کسی قسم کے سوال و جستجو کا حق نہیں۔ مثال کے طور پر امام علیؑ ۲۵ سال خاموش رہے' پھر سیاست مدار حضرات کے متنبہ کرنے کے باوجود معاویہ کے خلاف چار سال جنگ میں مصروف رہے' امام حسنؑ اور معاویہ کی صلح' امام حسینؑ کا یزید کے خلاف قیام۔ یہ سب کے سب غیبی اشاروں پر انجام دیئے گئے امور ہیں لہٰذا ان کی تفسیر و توجیہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ بلکہ ان کے بارے میں خاموش رہنا چاہئے۔

ہم اس حقیقت کے منکر نہیں کہ ائمہؑ کو غیبی تائید حاصل نہیں' وہ وحی سے متصل نہیں لیکن یہ تاثر قائم کرنا کہ کیونکہ ائمہؑ غیب سے مربوط ہیں اس لئے ان کی پیروی ہمارے لئے ممکن نہیں درست نہیں۔ اگر یہ تصور قبول کرلیا جائے تو پھر ائمہؑ ہمارے لئے نمونۂ عمل قرار نہیں پائیں گے اور یہ بات آیات و روایات سے خلاف ہے۔ بلکہ ائمہؑ نے جو کچھ انجام دیا وہ ہمارے لئے ہدایت اور قابلِ عمل ہے۔

(۴) سیرتِ تحلیلی

ائمۂ اطہارؑ ایک لحاظ سے عام انسانوں ہی کی مانند ہیں' وہ عام لوگوں ہی کے درمیان' انہیں کی مانند زندگی بسر کرتے ہیں' فلاسفۂ یونان یا راہبوں کی مانند معاشرہ سے کٹ کر غیر فطری انداز میں دنیا میں نہیں رہتے۔ اس بات کی جانب سورہ اسراء کی آیت ۱۱ اشارہ کرتی ہے۔

نیز خدا کی یہ منتخب ذوات معاشرہ کے عام لوگوں کے ساتھ' ان کی خوشی غمی'

دکھ و مصیبت میں برابر کی شریک ہوتی رہی ہیں جیسا کہ امیر المومنین کے خطبات اور مکتوبات سے بھی یہی مترشح ہے۔ (مکتوب نمبر ۴۵۔ خطبہ نمبر ۳، ۱۱۹، ۱۴۶)

لہٰذا ائمہؑ بھی عام انسانوں ہی کی مانند اس دنیا کے سرد و گرم سے دوچار ہوتے تھے، اسی دنیا کے فطری اسباب و علل سے کام لیتے تھے، موت و حیات کامیابی و ناکامی کا سامنا کرتے تھے۔ لیکن ان کی امتیازی خصوصیت خدا سے براہِ راست تعلق اور وحیٔ الٰہی سے فیضیاب ہونا ہے اور ائمہؑ ان دونوں پہلوؤں یعنی بشری اور آسمانی کی یکجائی کی وجہ سے ہمارے لئے اسوہ و نمونہ عمل قرار پاتے ہیں۔

اگر ائمہؑ محض وحی سے مربوط ہوتے اور ان کا وجود بشری پہلو لئے ہوئے نہ ہوتا تو وہ ہمارے لئے اسوۂ عمل نہیں بن سکتے تھے۔ جب کہ قرآن و سنت بارہا انہیں ہمارے لئے اسوۂ عمل قرار دیتے ہیں۔ اور اگر ائمہؑ صرف بشری پہلو کے حامل ہوتے اور وحی سے ان کا کوئی ارتباط نہ ہوتا تو وہ عام انسانوں پر کوئی فضیلت و فوقیت نہ رکھتے اور ہمارے لئے حجت اور اسوۂ عمل نہ ہوتے۔

ائمہ علیہم السلام کی شخصیت کے ان دونوں پہلوؤں کو تسلیم کرلینے کے بعد ان کے کسی اقدام کو سمجھنا ہمارے لئے مشکل نہ رہے گا اور ہم ان کے ہر عمل کا تجزیہ و تحلیل کرسکیں گے۔

لہٰذا کسی بھی امامؑ کے اقدام مثلاً حضرت علیؑ کی خاموشی، اس کے بعد آپؑ کی جنگیں، امام حسنؑ اور معاویہ کی صلح، امام حسینؑ کا جہاد، امام رضاؑ کا ولیعہدی قبول کرلینا الغرض پوری سیرتِ ائمہؑ کا عقلِ سلیم، قرآنِ کریم کے اصولوں اور مسلمہ سیرت و روشِ ائمہؑ کی روشنی میں جائزہ لینے کو سیرتِ تحلیلی کہا جاتا ہے۔

(۵) سیرتِ تجزئی

ہر امامؑ کی سیرت اور حالاتِ زندگی پر علیحدہ علیحدہ بحث و گفتگو کو سیرتِ "تجزئی" کہا جاتا ہے۔ سیرت کے بیان کی یہی روش فی زمانہ رائج ہے۔

کیونکہ اس طریقہ میں ہر معصومؑ کی سیرت کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا جاتا ہے اس لئے کسی ایک ہی مسئلہ پر ائمہؑ کے موقف میں پایا جانے والا فرق پڑھنے والے کو تردد کا شکار کردیتا ہے اور اگر اسے خود یہ مسئلہ درپیش ہو تو وہ اپنے لئے موقف کا تعین کرنے سے عاجز رہتا ہے۔

(٦) سیرتِ موضوعی

سیرت کے تجزیہ و تحلیل کے اس طریقہ میں کسی ایک خاص موضوع کو پیشِ نظر رکھ کر تمام ائمہؑ کی سیرت کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ یعنی مثال کے طور پر ائمہؑ کی سیاسی روش کو موضوع قرار دے کر تمام ائمہؑ کی حیات میں اس روش کا جائزہ لیتے ہیں اور ہر امامؑ نے اپنے زمانے میں حالات و شرائط کے پیشِ نظر جو روش اختیار کی اس سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اس طرح قاری اپنے فریضہ کے تعین کے لئے خود کو درپیش حالات کا ان حالات سے موازنہ کرتا ہے جو کسی امامؑ کو درپیش رہے ہوں اور اس طرح اس امامؑ کی راہ و روش کو اپنے لئے نمونہ عمل قرار دیتا ہے جسے ایسے ہی حالات درپیش رہے ہوں۔

سیرتِ ائمہؑ کا جائزہ لینے کا یہ طریقہ سب سے زیادہ معقول اور انتہائی مفید ہے، اس طرح انسان کے لئے اپنے مخصوص حالات میں سیرتِ ائمہؑ سے استفادہ بغیر کسی شک و تردد کے آسان ہو جاتا ہے۔

☆ ائمہؑ کی جدوجہد کے مشترکہ مرکزی نکات

کوئی عاقل و عالم اور عاملِ شریعت انسان زندگی کے نشیب و فراز میں اپنے بنیادی فریضہ کو ترک نہیں کرتا۔ عام حالات میں صالح لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ ہر نیک کام کو بجالائیں، لیکن جب حالات ناسازگار و ناموافق ہوں تو پھر ایسے لوگ اہم ترین چیزوں کی انجام دہی کی فکر کرتے ہیں۔ غیراساسی امور سے صرفِ نظر کرتے ہیں اور بنیادی فریضہ کی بجاآوری کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ عاقلوں کی سیرت ہے۔

ائمہ اطہار علیہم السلام دین کے مفسر، مروج اور محافظ ہیں۔ عام حالات میں دین کے اصول، فروع، محرمات، مستحبات، مکروہات الغرض تمام جزیات سمیت پورے دین کا نفاذ و رواج ائمہؑ کی خواہش اور ذمہ داری ہے۔ لیکن دورِ امامت کا آغاز ہوتے ہی ائمہؑ کو سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ سیاسی، اقتصادی اور سماجی میدانوں میں شدید بحرانوں سے گزرنا پڑا۔ ائمہؑ کو عملاً امت کی قیادت میسر نہ تھی۔ یہ حالات ائمہؑ کو پورے دین کی تبلیغ و نفاذ کی اجازت نہ دیتے تھے۔ ان ناسازگار حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہمیں دیکھنا ہے کہ ائمہؑ نے تحفظِ دین کی جدوجہد میں کن امور کو سرِفہرست رکھا اور ان پر اپنی بھرپور توجہات مرکوز رکھیں۔

حیاتِ ائمہؑ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی طول حیات میں اول سے آخر تک کچھ مسائل کو سرِفہرست رکھا اور انہیں دوسرے امور پر فوقیت دی جو یہ ہیں۔

(۱) حفظِ اصولِ عقائد

ائمہؑ نے اسلامی عقیدہ کے دفاع کو سرِفہرست رکھا، اس کو لاحق خطرات کے ہر موقع پر اس کا دفاع کیا۔ دوسرے مذاہب کے علماء سے اسلامی عقیدہ کے اثبات پر مناظرے کئے، مساجد اور بیت اللہ الحرام میں درس و تدریس کے سلسلے جاری کئے، اسلامی نظریات کے دفاع کے لئے ہشام بن حکم اور مومنِ طاق جیسے اصحاب کو تربیت دے کر مامور کیا۔

(۲) منصبِ امامت

حسبِ آیاتِ قرآن اور احادیثِ رسولؐ کے مطابق اہلِ بیتؑ ہی جانشینِ رسولؐ اور امت کی امامت کے حقدار ہیں۔ انتہائی ناسازگار حالات میں بھی ائمہؑ کبھی اپنے اس حق سے دستبردار نہ ہوئے، ہمیشہ اس کا ادعا کیا اور اپنے اس حق کے حصول پر مصر رہے۔ کبھی اپنے علاوہ کسی اور کو اس منصب کا سزاوار قرار نہ دیا اور ہمیشہ اس کی بازیابی کے لئے کوشاں رہے۔

(۳) اسلامی حکومت کی ضرورت

ائمہؑ نے پیغمبرِ اسلامؐ کی تاسیس کردہ حکومتِ اسلامی کے تحفظ و بقا کو مقدم رکھا۔ اگرچہ اس حکومت پر غاصب، نااہل، منحرف اور منافق افراد قابض رہے۔ ائمہ اطہارؑ نے اس منحرف اسلامی حکومت کی بقاء کو کفر و شرک کی حکومت پر ترجیح دی۔ اس سلسلے میں امیرالمومنین حضرت علیؑ کا خلفاء ثلاثہ کے ساتھ تعاون، آپؑ کے مخلص اصحابؓ کا ان حکومتوں کے عہدے قبول کرنا، امام

زین العابدینؑ کا روم کی فوج کے خلاف بنی امیہ کی فوج کے حق میں دعا کرنا اور حکومتِ روم سے ہشام ابن عبدالملک کو چیلنج درپیش ہونے کے موقع پر امام محمد باقرؑ کا اس کی رہنمائی کرنا جیسی مثالیں اس مدعا کی دلیل ہیں۔

(۴) وحدتِ امت

ائمہؑ امت کے اتحاد کو عزیز رکھتے ہوئے اپنے ماننے والوں کو عام مسلمانوں سے میل جول، قربت و ربط کے تعلق کی تاکید کرتے تھے تاکہ امتِ مسلمہ کی صفوں میں کسی قسم کا رخنہ نہ پڑے اور اس کا شیرازہ بکھرنے سے محفوظ رہے۔

تقیہ کے ابواب میں سے ایک بڑا باب تقیۂ مداراتی ہے۔ یعنی شیعہ اپنے تشخص کے ہمراہ امت کے اتحاد و اتفاق کی خاطر اہم کردار ادا کریں۔ اس سلسلہ میں ائمہؑ کی طرف سے وارد ایسی روایات ہمارے اس مدعا کی بہترین دلیل ہیں جن میں انہوں نے اپنے ماننے والوں کو عام مسلمانوں کے ساتھ نمازِ جماعت، نمازِ جمعہ اور نمازِ عیدین میں شرکت کی تاکید کی ہے۔

☆ سیرت شناسی میں حائل رکاوٹیں

ذیل کی گفتگو میں ہم بعض ایسے مفاہیم کا ذکر کریں گے جن کے بارے میں غلط تصور ائمہ معصومینؑ کی سیرت سمجھنے میں رکاوٹ ہے۔

(الف) ائمہؑ کی ولایتِ تکوینی کو ولایتِ تشریعی پر فوقیت دینا

مومنین کے لئے سیرتِ ائمہ معصومینؑ کو سمجھنے میں ایک بڑی رکاوٹ ان کا ائمہؑ کی ولایتِ تکوینی کو حد سے زیادہ اہمیت دینا اور ولایتِ تشریعی سے صرفِ نظر

کرنا ہے۔ یہ طرزِ فکر اس بات کی واضح علامت ہے کہ انہوں نے نہ ہی ائمہؑ کی ولایتِ تکوینی کی حدود و ابعاد کو سمجھا ہے اور نہ ہی ولایتِ تشریعی کی اہمیت ان پر واضح ہے۔

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ ولایتِ تکوینی ائمہؑ کی خلقت اور ان کی فضیلت کا مقصد نہیں۔ بلکہ ولایتِ تکوینی ائمہؑ کی ولایتِ تشریعی کے ثبوت کے لئے شاہد و گواہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن مومنین اور ائمہؑ کے عقیدت مندوں نے دلیل و گواہ کو تھام کر اور محض اسی کو اہمیت دے کر اصل مقصد و مدعا کو فراموش کردیا ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ولایتِ تکوینی کو بھی اس قدر لامحدود اور وسیع، غیر عقلی اور غیر شرعی باور کیا ہے جو صاحبانِ شعور اور مزاجِ شریعت سے آشنا لوگوں کے لئے ناقابلِ قبول ہے۔ اس طرزِ عمل نے بہت سے لوگوں کو ائمہؑ کی ولایت کے بارے میں شک و شبہ سے دوچار کردیا۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم عقل و شرع، آیات و روایت کی روشنی میں ولایتِ تکوینی کی حدود و ابعاد کو بھی سمجھیں اور اس کی غرض و غایت کو بھی جانیں۔ تاکہ جاہل و نادان، مفاد پرست دوست نما اہلِ غرض کو بھی حدود کا پابند کیا جائے اور منکرینِ ولایت کو بھی جن کا یہ انکار کم سمجھی اور لاعلمی کی وجہ سے ہو، یا کج فکری کا نتیجہ قائل کیا جاسکے۔ ذیل میں ہم ائمہ معصومینؑ کی ولایتِ تکوینی کی حدود و ابعاد کو واضح کریں گے۔

ولایتِ تکوینی کی حدود

ولایتِ تکوینی جس کو عام طور پر ائمہؑ کے معجزات و کرامات کہا جاتا ہے اس غیر معمولی فعل کو کہتے ہیں جو عام انسان انجام نہیں دے سکتا اور جسے ائمہؑ و اولیا

اذنِ خدا اور الٰہی تائید سے انجام دیتے ہیں۔ ایسا فعل تین عناصر سے مرکب ہے۔

(۱) فاعل۔ یعنی ولایتِ تکوینی کا حامل یا بالفاظ دیگر غیر معمولی عمل انجام دینے والا۔

(۲) فعل۔ یعنی غیر معمولی عمل۔ اس کے کئی مصادیق ہوسکتے ہیں مثلاً معجزہ' کرامت' سحر و جادو' پیش گوئی' ریاضت وغیرہ۔

(۳) مخاطب۔ یعنی جس شخص یا گروہ کے لئے یہ غیر معمولی اور خارق العادات فعل انجام دیا جائے یا جسے چیلنج دے کر یہ فعل انجام دیا جائے اور اسے ہم معجزہ کا مقصد بھی کہہ سکتے ہیں۔

خداوندِ عالم نے انبیاء و ائمہ اطہار علیہم السلام کو کائنات میں تصرف کی جو قدرت و قوت عطا فرمائی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے کائنات میں تصرف کا مظاہرہ کرسکیں۔ جہاں ان کی نبوت یا نمائندۂ الٰہی ہونے کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار کیا جائے' جہاں ان کی حقانیت کے بارے میں اعتراض ہو اور ان کی پہچان سے مقابل عاجز رہے وہاں اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو یہ ولایت دی ہے کہ معجزہ صادر کرکے اپنی حقانیت اور اپنے دعویٰ کی صداقت کا ثبوت فراہم کریں۔

پس معجزہ کا مقصد اپنے دعویٰ کی صداقت کا اظہار اور مخالفین کو قائل و قانع کرنا ہے۔

مذکورہ وضاحت کے بعد اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ آج کے دور میں ہمارے یہاں عام طور پر رونما ہونے والے معجزات کی کیا حقیقت ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا کہ معجزہ کے تین زاویئے ہیں۔ ان تینوں زاویوں کی روشنی میں ہم معجزات کی حقیقت کی وضاحت کی کوشش کریں گے۔

معجزہ ایک ایسا خارق عادت اور غیر معمولی فعل یا عمل ہوتا ہے جسے خداوندِ عالم کی منتخب ہستیاں انجام دیتی ہیں۔ یاد رہے کہ خارقِ عادت اور غیر معمولی عمل بہت سے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض عمل انبیاء و ائمہؑ کے علاوہ بعض دوسرے لوگ بھی انجام دے سکتے ہیں حتیٰ خدا کی نظر میں مغضوب و مردود لوگوں سے بھی شاید کوئی غیر معمولی عمل صادر ہو جائے۔ لہٰذا ہر خارق عادت اور غیر معمولی عمل کو معجزہ سمجھ کر اس کی قدر و قیمت اور احترام کا قائل نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ اس سلسلہ میں کوئی معیار یا کسوٹی ہونی چاہئے جس کے ذریعہ غیر انبیاء و ائمہؑ سے صادر ہونے والے خارق العادت امور اور انبیاء و ائمہؑ کے معجزات و کرامات میں فرق کیا جا سکے۔ علماء عقائد نے معجزات و کرامات اور سحر و نظر بندی کے درمیان فرق کرنے کے لئے درجِ ذیل معیار و کسوٹیاں فراہم کی ہیں۔

(۱) معجزہ حقیقت میں رونما ہوتا ہے ایسا نہیں ہوتا کہ بعض لوگ اسے دیکھیں اور بعض نہ دیکھ سکیں۔ حضرت موسیٰؑ کے عصا کے اژدہا بن جانے کو حضرت موسیٰؑ کے ساتھیوں نے بھی دیکھا اور فرعون اور اس کے ساحروں نے بھی۔ اس کے برعکس سحر یا جادو یا دوسرے خارقِ عادت امور میں چشم بندی، معاشرتی دباؤ یا دوسرے ذرائع استعمال ہوتے ہیں۔ اگر کوئی معجزہ رونما ہو تو اسے ہر ایک کو نظر آنا چاہئے جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے معاشرہ میں آج جن چیزوں کو معجزہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے وہ بہت سے لوگوں کو نظر نہیں آتیں اور اگر کوئی اس نظر

نہ آنے کا اظہار کرتا ہے یا اس سلسلہ میں تحقیق و جستجو کرتا ہے تو اس پر بدعقیدگی کا الزام لگادیا جاتا ہے۔

(۲) ساحر و جادوگر حضرات خارق عادت امر ظاہر کرتے وقت کسی کیمیکل، آلے یا مہارت سے مدد لیتے ہیں۔ جب کہ انبیاء و ائمہؑ اور اولیاء خدا سے صادر ہونے والے معجزات بغیر کسی ذریعہ اور سبب کے براہِ راست محض تائیدِ الٰہی سے صادر ہوتے ہیں۔

لہٰذا آج کل کے دور میں رونما ہونے والے معجزات جن میں معصومینؑ کا دخل نظر نہیں آتا ان میں تحقیق کی ضرورت ہے کہ کہیں لوگوں نے کسی کیمیکل، آلے یا مہارت سے مدد لے کر تو ظاہر نہیں کئے۔

(۳) جس معجزہ کا دعویٰ کریں بعینہ وہی معجزہ رونما ہونا چاہئے۔ مثلاً اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ کنویں کے پانی میں اضافہ کرے گا اور اس کنویں کا پانی خشک ہوجائے یا اس میں پہلے کی نسبت کمی واقع ہوجائے تو اسے معجزہ نہیں کہیں گے کیونکہ یہ دعویٰ کے برخلاف ظاہر ہوا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی یہ کہے کہ یہ حضرت عباسؑ کا علم ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے نزدیک بیماروں کو شفا ہوتی ہے، حاجت مندوں کی حاجتیں پوری ہوتی ہیں تو یہ اس علم کے حضرت عباس علمدار کا علم ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتی کیونکہ اس دعویٰ اور معجزہ میں کوئی مماثلت نہیں اس لئے کہ ممکن ہے خود حضرت عباسؑ کی ضریح پر کسی کی حاجت روا نہ ہو، کسی کو شفا نہ ملے اور ممکن ہے اپنے گھر ہی میں توجہ قلبی سے حضرت عباسؑ کے توسل سے کسی کو شفا مل جائے۔

(۴) جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ معجزہ کسی دعویٰ کے ثبوت کے لئے کیا

جاتا ہے۔ عام طور پر انبیاء و ائمہؑ اپنے نمائندۂ الٰہی ہونے کے دعویٰ کے ثبوت میں معجزہ پیش کرتے تھے لہٰذا دورِ حاضر میں رونما ہونے والا معجزہ بھی کسی دعویٰ کے ساتھ ہونا چاہئے اور اس وقت کیونکہ امامِ زمانہ حضرت حجۃ ابن الحسن المہدی ہیں اس لئے ایسا ہی معجزہ معقول محسوس ہوگا جو امام مہدیؑ کی امامت کو ثابت کرنے والا ہو، ان کی تقویت و تائید کا سبب ہو۔

(۵) معجزہ کیونکہ منکرین کو قائل کرنے کے لئے ہوتا ہے اس لئے ایسے ماحول میں ہونا چاہئے جو منکرین سے لبریز ہو۔ ہمارے یہاں معجزہ مومنین کے یہاں ہی رونما ہوتا ہے۔

ولایتِ تکوینی یا معجزہ کی غرض و غایت

انبیاء و ائمہؑ کیونکہ اپنے دعویٰ نبوت و امامت سے قبل معاشرہ میں عام فرد ہی کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے تھے اس لئے جب وہ اپنی نبوت یا امامت کا اعلان فرماتے اور خود کو خدا کا نمائندہ اور لوگوں کی جان و مال پر تصرف کا حقدار قرار دیتے تو لوگ ان سے دلیل و برہان طلب کرتے تھے۔ کیونکہ کوئی بھی دعویٰ بلا دلیل قبول نہیں کیا جا سکتا۔

لہٰذا جو لوگ ان ہستیوں سے عرصۂ دراز سے واقف ہوتے تھے، اس بات کے قائل ہوتے تھے کہ یہ صادق و امین ہیں، ان سے کبھی کوئی قبیح امر سرزد ہوتے نہیں دیکھا گیا تو ان کے لئے ان ہستیوں کا یہ سابقہ کردار ہی ان کے دعویٰ کی دلیل بن جاتا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس ہستی سے جھوٹے دعویٰ کی امید نہیں کی جا سکتی اس لئے وہ فوراً ان کا یہ دعویٰ قبول کر لیتے تھے۔

دوسرا گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو پہلے ہی سے کسی آسمانی دین پر ایمان رکھتے تھے اور اس دین کی کتب یا مقدس ہستیوں کے توسط سے جانتے تھے کہ آئندہ دور میں فلاں فلاں نشانیوں اور علامات کا حامل نبی ظاہر ہوگا وہ ان علامات و نشانیوں کو اس مدعیٔ رسالت و امامت میں پاکر اس کے دعویٰ کے قائل ہوجاتے تھے۔

تیسرا گروہ ایسے عامتہ الناس پر مشتمل ہوتا ہے جو نہ ہی کسی گزشتہ دین پر ایمان رکھتے ہیں جس کے مصادر کے ذریعہ وہ عصرِ حاضر کے امام یا نبی تک پہنچ سکیں۔ نہ ہی ان میں اتنی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ نبی یا امامؑ کے استدلال کے ذریعہ حجتِ خدا کو پہچانیں تو ان کے لئے ایسی محسوس دلیل لانی ہوتی ہے کہ ان کے پاس انکار کی گنجائش نہ رہے۔ اور ایسے ہی لوگوں کے لئے معجزہ کی صورت میں محسوس دلیل پیش کرنا ضروری ہے۔

لہٰذا اس خدا پر واجب ہے جس نے کسی ہستی کو بندگانِ خدا کے لئے حجت بنایا ہے کہ وہ اس کے لئے خود ہی دلیل بھی پیش کرے۔ اگر دلیل پیش نہ کی جائے تو بندگانِ خدا معذور قرار پائیں گے اور اگر بغیر کسی دلیل و برہان کے قبول کرنے کا پابند کیا جائے تو لوگ کسی اور دعویدار کے دعویٰ کو بھی قبول کرنے کے مجاز ہوں گے۔ لہٰذا بندگانِ خدا کو جھوٹے دعویداروں سے بچانے کے لئے خدا کے نمائندوں کے پاس کسی محسوس دلیل کا ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں خدا اپنے نمائندوں کو جس دلیل و برہان سے نوازتا ہے وہ ولایتِ تکوینی یا معجزہ کہلاتی ہے۔

یہیں سے یہ بات واضح ہوئی کہ معجزہ یا ولایتِ تکوینی خدا کی طرف سے انبیاء

و ائمہؑ کو عطا کی گئی وہ صلاحیت ہے جس کے ذریعہ وہ منکرین پر اپنا خدا کی طرف سے منسوب ہونا ثابت کرتے ہیں۔ اور معجزہ یا ولایتِ تکوینی انبیاء کا ہدف اور مقصد نہیں۔

کثیر آیات و روایات کی رو سے انبیاء و ائمہ علیہم السلام کا اصل ہدف اور مقصد انسانی معاشرہ پر الٰہی شریعت کا نفاذ و رواج اور ظالم اور مستبد حکمرانوں کے ظلم و ستم سے لوگوں کو نجات دلانا ہے۔

رسولِ مقبول حضرت محمد مصطفیٰؐ نے مسلسل ۲۳ سال مختلف مواقع پر امت کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ علیؑ اور ان کے معصوم فرزند میرے بعد تمہارے حاکم اور تم پر اولیٰ بالتصرف ہیں، ولایتِ تشریعی کے حامل ہیں، شریعت انہیں سے حاصل کرو، اپنے اختیارات انہی کے سپرد کرو نہ یہ کہ میں علیؑ اور ان کے فرزندوں کو تمہارے درمیان اس لئے چھوڑے جارہا ہوں کہ یہ زمین و آسمان، ستاروں و سیاروں کے نظام کو درہم برہم کریں، سنگریزوں کو سونے میں تبدیل کریں، دشمنانِ خدا کو مفلوج کریں۔

ولایتِ تکوینی کے حدود و ابعاد جاننے کے بعد واضح ہوگیا کہ ائمہؑ کے عقیدتمندوں کو معجزہ کی ضرورت نہیں کیونکہ ان پر ائمہؑ کی حقانیت ثابت ہے بلکہ ان کا فرض ائمہؑ کی ولایتِ تشریعی کے نفاذ کے لئے جدوجہد ہے جس کے لئے ائمہؑ نے مسلسل انتھک جدوجہد فرمائی۔

(ب) تقیہ و اسرار پوشی

ائمہ معصومینؑ کی جانب سے اپنے اصحاب کو تقیہ اور اسرار پوشی کی تاکید،

نیز ان کا خود اپنی اجتماعی اور سیاسی سرگرمیوں کو انتہائی رازداری سے انجام دینا بھی سیرتِ ائمہؑ کے خصوصاً سیاسی پہلو کو سمجھنے میں ایک رکاوٹ ہے۔

کیونکہ ائمہؑ اپنے دور کے حکمرانوں کی سخت بندشوں اور کڑی نگرانی کی وجہ سے اپنی سرگرمیوں کو انتہائی رازداری کے ساتھ انجام دیتے تھے اس لئے ان کی اجتماعی و سیاسی زندگی مکمل طور پر کھل کر ہمارے سامنے نہ آسکی، مبہم اور ایک معمہ کی صورت میں باقی ہے۔ ابہام کے اس پردے کو الٹنے کے لئے درجِ ذیل نکات سے آشنائی لازم ہے۔

☆ متعدد ناقابلِ انکار اور معتبر روایات سے ظاہر ہے کہ ائمہ معصومینؑ اپنے ماننے والوں کو شد و مد کے ساتھ تقیہ اور رازداری کی تاکید فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سیاسی زندگی مبہم اور پس پردہ رہی۔ اور ظاہر ہے کہ جب کوئی امر پس پردہ اور مبہم ہو تو اس کے انکار کا جواز قوی ہو جاتا ہے۔ لہٰذا عام طور پر لوگ ائمہؑ کی سیاسی زندگی ہی کے منکر ہو گئے اور انہیں ایک گوشہ نشین واعظ و عالم کی حیثیت سے پہچاننے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ تصور اس قدر عام ہو گیا کہ ائمہؑ کی سیاسی مسائل میں شرکت کا ذکر ان کی توہین سمجھا جانے لگا اور یوں ان کے سیاسی موقف اور اقدامات منصہ شہود پر نہ آسکے اور اسلامی سیاست کے گرانقدر اسباق اہلِ ایمان کی نظروں سے اوجھل رہے۔

☆ اگر تقیہ و اسرار پوشی کی تاکید و فضیلت پر مشتمل ائمہؑ کی روایات کو پیشِ نظر رکھا جائے تو ہر ذی شعور فرد کے ذہن میں یہ سوال جنم لیتا ہے کہ آخر ائمہؑ کو اسرار پوشی، رازداری اور تقیہ کی ضرورت کیا تھی؟ لیکن فوراً ہی یہ جواب ذہن میں آتا ہے کہ ضرور ائمہؑ حکومتِ وقت اور اس وقت کے لوگوں سے مختلف و

متضاد ایسی سرگرمیوں میں مصروف تھے جنہیں پوشیدہ رکھنے کی ضرورت تھی۔ تاکہ ان سرگرمیوں کا قبل از وقت افشا ہونا ائمہؑ اور ان کے مشن کے لئے ضرر رساں ثابت نہ ہو۔

☆ آج کے دور میں مختلف وجوہات و اسباب کی بناء پر عام لوگ اس انداز سے سوچنے لگے ہیں کہ "تقیہ" کا اصول ہی دراصل لغو اور من گڑھت ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اسلام میں تقیہ نام کا کوئی اصول ہے ہی نہیں۔ نہ ہی ائمہؑ نے اس اصول پر عمل کیا' نہ اسے پیشِ نظر رکھا۔ اور اگر بفرضِ محال یہ اصول ہے بھی تو انتہائی نادر موقعوں اور بہت کم عرصہ کے لئے اس پر عمل ہوا۔ خصوصاً دورِ حاضر میں تو یہ اصول بالکل ہی بے وقعت اور غیر عملی ہے۔

لہٰذا اگر تقیہ کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی جائے اور اس کی انواع و اقسام' اس کی ضرورت کے مواقع اور اس کی افادیت کو واضح کیا جائے تو سیرتِ ائمہؑ کے بہت سے اسرار و رموز بغیر کسی ابہام و اشتباہ کے ہمارے سامنے آسکتے ہیں۔ اور ائمہؑ کے بہت سے اقدامات کی حقیقت ہم پر عیاں ہو سکتی ہے۔

(ج) ہار جیت کا قانون

اس وسیع و عریض کائنات میں ہزارہا قوانین نافذ ہیں۔ ان قوانین میں خداوندِ عالم کی جانب سے نازل کردہ قوانین بھی ہیں' بندوں کے بنائے ہوئے قوانین بھی۔ سماجی قوانین بھی ہیں' علمی و سائنسی قوانین بھی۔

انسانوں نے جب ایک ساتھ مل کر اجتماعی حیات بسر کرنی شروع کی تو اس کے نتیجے میں ان کے مفادات متصادم ہوئے' ان کے درمیان تنازعات اور باہمی

چپقلشوں نے جنم لیا۔ ان تنازعات سے بچنے کے لئے قوانین و ضوابط کی ضرورت تھی۔ قوانین کے نفاذ کی بنا پر ہر انسان اپنی آزادی کے کچھ حصے سے دستبردار ہوا اور ایک مقید و محدود زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوا۔ لیکن جب کسی نے اپنی حدود و قیود سے تجاوز کیا' دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی تو اگر وہ طاقت و قدرت کا مالک تھا تو فتح یاب ہوا اور اگر کمزور تھا تو شکست و ناکامی کا منہ دیکھا۔ اس حقیقت پر تاریخِ بشریت کے صفحات روشن گواہ ہیں۔ ان جنگوں میں تمام فریق کبھی باطل ہوتے تھے' کبھی حق اور باطل آمنے سامنے ہوتے تھے۔

انبیاء و ائمہؑ حق کا نمایاں ترین مظہر تھے جن کی جنگیں اپنے اپنے زمانہ کے طاغوتوں کے خلاف ہوتی تھیں۔ انسانوں کی تحریر کی ہوئی تاریخوں کے علاوہ کتبِ آسمانی' قرآنِ کریم اور احادیث و روایاتِ معصومینؑ میں ان معرکوں کا ذکر ملتا ہے۔ یہاں ہم اس مسئلہ پر گفتگو کرنا نہیں چاہتے کہ کس جنگ میں کس کو فتح نصیب ہوئی اور کسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا' بلکہ اس بات کا جائزہ لینا مقصود ہے کہ وہ کیا چیز ہوتی ہے جو کسی کو فتح سے ہمکنار کرتی ہے' قہر و غلبہ عطا کرتی ہے اور کسی کو شکست و ناکامی سے دوچار کرتی ہے' خصوصاً انبیاء و ائمہؑ اور اولیاء خدا کی طاغوتوں اور ظالموں کے ساتھ جنگ میں کامیابی کے کیا عوامل تھے۔ اس بارے میں تین عوامل فرض کئے جاسکتے ہیں۔

(۱) عاملِ صدفہ یعنی اتفاق (۲) غیبی عامل (۳) طاقت و قدرت کا عامل۔

(۱) عاملِ صدفہ یا اتفاق

اس سے مراد یہ ہے کہ فتح و شکست کسی معین قانون کی پابند نہیں بلکہ اتفاقاً

فریقین میں سے کسی کو فتح ہو جاتی ہے اور کسی کو شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ صاحبانِ عقل و شعور اس فرضیہ کو یہ کہتے ہوئے رد کرتے ہیں کہ کائنات میں کوئی تبدیلی اور تغیر بغیر علت و سبب کے ظہور میں نہیں آتا۔ نیز تاریخ کا مطالعہ بھی اس فرضیہ کے لغو ہونے کو واضح کرتا ہے۔

(۲) غیبی عامل

فتح و شکست کا ایک اور عامل غیبی عامل ہے۔ یعنی غیر مرئی، ماوراء طبیعت اور اصطلاحاً غیبی امداد و اعانت کے نتیجہ میں کم قوت و قدرت رکھنے والے مومنین اور اہلِ حق کثیر کفار و منافقین پر غلبہ حاصل کریں۔ متعدد آیاتِ قرآنی مومنین کو حاصل اس مدد و اعانت کا ذکر کرتی ہیں۔ مثلاً سورہ آلِ عمران ۳ کی آیت ۱۴۹ تا ۱۵۴، سورہ انفال ۸۔ آیت ۹ تا ۱۴، سورہ توبہ ۹۔ آیت ۲۵ تا ۲۷، سورہ حج ۲۲۔ آیت ۱۵-۳۱ - ۳۸ - ۴۱ - ۶۰، سورہ مومن ۴۰۔ آیت - ۵۱ اور ۷۷، سورہ فصلت ۴۱۔ آیت ۳۰ - ۳۷، سورہ مجادلہ ۵۸۔ آیت ۵ - ۸ اور سورہ قلم ۶۸۔ آیت ۱۷- ۴۴ - ۵۰ وغیرہ۔

بعض ذہنوں میں پایا جانے والا یہ تصور درست نہیں کہ مومنین ہمیشہ غیبی مدد و اعانت کے بل بوتے پر فتحیاب ہوتے ہیں اور کیونکہ انہیں ہمیشہ تائیدِ الٰہی حاصل رہتی ہے اس لئے کامیابی انہی کا مقدر ہوتی ہے۔ اس بات کی حقیقت ہم تین نکات کے ذریعہ واضح کرتے ہیں۔

(۱) تاریخ کا مطالعہ اس تصور کو مسترد کرتا ہے۔ کیونکہ صفحاتِ تاریخ بکثرت ایسے معرکوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں انبیاء، اولیاء، اوصیاء، صلحا اور ائمہؑ کو

اپنے زمانے کے مشرکوں، کافروں اور طاغوتوں کے مقابل شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ مثلاً مشرکین کے دباؤ کی وجہ سے پیغمبرِ اسلامؐ مکہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے، جنگِ احد میں پیغمبرؐ کی موجودگی کے باوجود مسلمانوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ جنگِ صفین میں حضرت علیؑ کا لشکر شکست سے دوچار ہوا۔ امام حسینؑ میدانِ کربلا میں شہید ہوئے وغیرہ وغیرہ۔

(۲) اگر ایسا ہوتا تو پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ ہوتا اور کوئی غیر مسلم نظر نہ آتا۔ کیونکہ اہلِ اسلام کے غلبہ کی صورت میں کسی کو کفر اختیار کرنے کی مجال نہ ہوتی۔ لیکن اس طرح نظریہ جبر کو تقویت ملتی اور انسان سے عقیدہ و ایمان اختیار کرنے کے سلسلے میں آزادی سلب ہو جاتی۔ کیونکہ جس طرح کسی کو گناہ اور باطل کی پیروی پر مجبور کرنا درست نہیں اسی طرح کسی کو اطاعتِ الٰہی پر مجبور کرنا بھی مناسب نہیں۔

(۳) یہ فرضیہ خارجی حقیقت کے بھی خلاف نظر آتا ہے کیونکہ اس صورت میں تو پوری دنیا میں اسلام کا بول بالا ہونا چاہئے تھا اور کفر کو یکسر نابود ہو جانا چاہئے تھا کیونکہ کفر اور اسلام میں ہمیشہ معرکہ آرائی رہی ہے۔

(۳) طاقت و قدرت کا عامل

یہ عامل ایک مسلم قانون و اصول کی حیثیت سے ثابت ہے۔ اور جو بھی قوت و طاقت کا حامل ہو خواہ وہ حق کا نعرہ لے کر اٹھا ہو یا باطل کا پرچارک بن کے، فتح اسی کی ہوگی۔ اور جو قدرت و قوت سے محروم ہوگا اس کا مقدر شکست و ہزیمت ہوگی، خواہ وہ مخلص مومن ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ اس بات کی وضاحت

اپنی جگہ ضروری ہے کہ خود طاقت کے کتنے مصادیق ہیں اور فتح کے لئے ان میں سے کس قدر کی ضرورت ہے۔

عقلِ سلیم، آیاتِ قرآن اور روایاتِ معصومینؑ نیز جنگوں اور معرکوں کے تجزیہ و تحلیل سے یہ بات ثابت ہے کہ فتح و کامرانی کا ذریعہ طاقت وقدرت ہے، کامیابی طاقتوروں کے قدم چومتی ہے۔ سورہ آل عمران ۳۔ آیت ۱۳۹ میں ارشادِ قدرت ہے کہ فتح یا شکست ہمیشہ ایک ہی فریق کا مقدر نہیں ہوتی۔ نہ فتح ہمیشہ مومنین کے حصہ میں آتی ہے اور نہ کفار کے حصہ میں اور نہ شکست کا داغ ہمیشہ کفار کو سہنا پڑتا ہے نہ ہی مومنین کو۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ فتح و شکست کسی اصول کے تابع ہے اور یہ اصول طاقت و قدرت ہے۔ یعنی طاقت و قدرت کا پلہ جس فریق کا بھاری ہوگا فتح و نصرت اسی کے حصہ میں آئے گی۔ بنابرایں سورہ انفال ۸ ۔ آیت ۶۰ میں مسلمانوں کو اس قدر طاقت و قدرت جمع رکھنے کی تاکید کی گئی ہے کہ جس سے کفار و مشرکین ہراساں رہیں اور انہیں مسلمانوں کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے کی ہمت نہ ہو۔

(د) قوت وقدرت کا مفہوم

سیرتِ معصومینؑ کو سمجھنے میں ایک اور رکاوٹ قدرت و طاقت کے مفہوم سے نہ آشنائی ہے۔ یہ غلط فہمی ان آیاتِ قرآنی کے سرسری مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے جن میں خداوندِ عالم نے مسلمانوں کی قلیل تعداد کے کفار کی کثیر تعداد پر غالب آجانے کا ذکر کیا ہے یا جن میں راہِ خدا میں جہاد کرنے والوں کو اپنی مدد

نصرت کا وعدہ دیا ہے۔ یا وہ جن میں مومنین کو فتح و کامیابی کی نوید دی ہے' یا وہ جن میں ۲۰ مومنین کے ۲۰۰ کفار پر غالب آجانے کا ذکر کیا ہے۔(سورہ بقرہ ۲۔ آیت ۲۴۰' سورہ آلِ عمران ۳ کی آیت ۱۳ وغیرہ)

مذکورہ آیات کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ تصور ذہن میں آتا ہے کہ مادی طاقت و قدرت کوئی چیز ہی نہیں بلکہ صرف اور صرف قوتِ ایمانی ہی موثر ہے اور بس۔ یہ تصور قطعی طور پر بے بنیاد اور عقل و منطق کے برخلاف ہے۔ اگر محض قوتِ ایمانی ہی کا اعتراف کیا جائے اور باقی طاقتوں کو نظرانداز کردیا جائے تو پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا وجہ تھی کہ ائمہ مقہور و مظلوم رہے' اگر قوتِ ایمانی ہی واحد قوت ہے تو ائمہؑ نے کیوں اس قوت کے بل بوتے پر ظالموں پر غلبہ حاصل نہ کیا؟

اس تصور کو قبول کرکے کیا ائمہؑ پر یہ الزام نہیں لگایا جارہا کہ (نعوذ باللہ) ائمہؑ نے خود ظالمین و جابرین کو کھل کھیلنے کا موقع فراہم کیا اور ان کے خلاف اپنی اس قوت سے کام نہ لیا؟

جہاں یہ تصور عقل و منطق کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا وہیں روایاتِ ائمہؑ کے بھی یکسر خلاف ہے۔ یہ تصور ہر قسم کی قدرت و طاقت کے حصول کو غیر ضروری ظاہر کرتا ہے جب کہ خداوندِ عالم سورہ انفال ۸ کی آیت ۶۰ میں مومنین کو ہر قسم کی قوت و قدرت کے حصول کی ترغیب دیتا ہے۔

"اور تم سب ان کے مقابلے کے لئے امکانی قوت اور گھوڑوں کی صف بندی کا انتظام کرو جس سے اللہ کے دشمن' اپنے دشمن اور ان کے علاوہ جن کو تم نہیں جانتے ہو اللہ جانتا ہے سب کو خوفزدہ کرو۔"

اس تصور کے بارے میں غلط فہمی کی ایک اور وجہ قدرت و طاقت کے مصادیق سے ناآشنائی ہے۔ طاقت و قدرت کے بہت سے مصادیق ہیں۔ ان میں سے بعض مصادیق بہت ہی واضح و نمایاں ہیں جنہیں انسان درک کرتا ہے اور بعض ایسے مصادیق ہیں جو واضح و نمایاں نہیں لیکن بہت موثر کردار کے حامل ہیں۔ ہم یہاں طاقت و قدرت کے بعض مصادیق بیان کرتے ہیں۔

(۱) عددی قوت : یعنی مقابلے کے میدان میں ایسا گروہ طاقتور ہوتا ہے جس میں زیادہ افراد موجود ہوں۔ اگر یہ افراد کسی کم تعداد والے گروہ یا لشکر سے مقابلہ کریں تو ان کی فتح کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب امیرالمومنین حضرت علیؑ اور حضرت امام جعفر صادقؑ سے اپنے مخالفین کے خلاف اعلانِ جنگ نہ کرنے کی وجہ دریافت کی گئی تو انہوں نے انصار و اعوان کی کمی کو سبب قرار دیا۔

(۲) علم کی طاقت : طاقت و قدرت کا ایک اور مصداق علم ہے۔ وہ اقوام وہ گروہ جو میدانِ علم و دانش میں برتر ہوں، ان کی یہ برتری ایک طاقت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر علوم کو مادی اور معنوی شعبوں میں تقسیم کیا جائے تو ہمیں اس حقیقت کو بے جھجھک قبول کر لینا چاہئے کہ مغرب اس وقت مادی علوم کے معاملہ میں ہم سے آگے ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ معنوی علوم میں پیچھے اور معنویات سے تہی دست ہے۔

(۳) تنظیمی قدرت و قوت : تنظیمی قوت بھی طاقت و قدرت کے مصادیق میں سے ہے۔ اس کا مشاہدہ عصرِ حاضر میں بہت آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ ہم روزمرہ

دیکھتے ہیں کہ کسی ملک کے منظم جاسوسی ادارے انتہائی کم افرادی قوت کے ساتھ دوسرے ملک کو عدم استحکام سے دوچار کردیتے ہیں۔

(۴) تربیتی قوت و قدرت : تربیت یافتہ افراد و اقوام، غیر تربیت یافتہ افراد و اقوام پر باآسانی برتری حاصل کرلیتی ہیں۔ اس سے تربیت کی طاقت و قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ ہزاروں غیر تربیت یافتہ لوگ وہ کام انجام دینے سے قاصر رہتے ہیں جو چند تربیت یافتہ افراد سرانجام دیتے ہیں۔

(۵) مادی طاقت و قوت : ایک گروہ کا جدید اسلحہ کے ڈھیروں سے لیس ہونا، اقتصادی طور پر مالا مال ہونا، برسوں کی غذائی ضروریات کا موجود رکھنا، اس کے حوصلوں کو بلند رکھنے اور قوتِ ارادی میں اضافے کا موجب ہوتا ہے جب کہ اس کے برعکس صورتِ حال یعنی کم اور پرانے ہتھیار، اقتصادی بدحالی، چند دنوں کے لئے موجود غذائی ذخیرہ حوصلہ شکنی اور پست قوتِ ارادی کا موجب بن جاتا ہے جو میدانِ مبارزہ میں ناکامی و نامرادی میں موثر کردار رکھتا ہے۔

(۶) مکانی قدرت و طاقت : قدرت و طاقت کا ایک اور مصداق مکانی ہے۔ بلندی پر قائم اور مضبوط مورچے میں موجود گروہ اس گروہ سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے جس کے مورچے کمزور ہوں اور جو بلند مقام کی بجائے کسی نچلی سطح مثلاً میدان یا پہاڑ کی گھاٹی میں قائم ہوں۔

(۷) زمانی طاقت و قدرت : بعض اقوام کے لئے کوئی خاص موسم ناقابلِ برداشت ہوتا ہے جو ان کی تمام طاقتیں سلب کرلیتا ہے اور وہ کسی فعالیت کے قابل نہیں رہتے۔ ایسا موسم ان اقوام کی کمزوری اور ضعف کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کوئی دوسرا موسم ان کے لئے پُرنشاط ہوتا ہے، اس میں ان کی

توانائیاں عروج پر ہوتی ہیں اور وہ قوی و قدرت مند ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مسلح افواج کو ہر قسم کے موسم کا عادی بنایا جاتا ہے۔ لہٰذا موسم بھی قوت و طاقت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

(۸) غیبی طاقت و قدرت : خداوندِ عالم اپنی راہ میں جدوجہد کرنے والوں کی مدد و نصرت کرتا ہے اور غیب سے انہیں مدد فراہم کرتا ہے۔ جس کے مظاہر ہم تاریخِ اسلام کے متعدد معرکوں میں دیکھتے ہیں۔

(۹) مقصد کی طاقت : مقصد و ہدف بھی اقوام و افراد کو طاقت عطا کرتا ہے۔ مقصد جس قدر بلند، ارفع اور مقدس ہو گا اس کی حامل قوم و افراد اتنا ہی اس کے حصول کی خاطر جان توڑ جدوجہد کریں گے۔ ان کی نظر میں اس کے لئے ہزار جان فدا کرنا بھی معمولی بات ہو گی۔

اسی طرح ہدف کا حصول اگر یقینی ہو تب بھی انسان ولولہ کے ساتھ بھرپور جدوجہد کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مادی اہداف کے لئے سرگرم افراد جلد تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں، جان کی بازی لگانے سے گریزاں رہتے ہیں۔ لیکن راہِ خدا میں جہاد کرنے والوں کا مقصد و منشاء کیونکہ خوشنودیٔ رب ہوتا ہے اس لئے وہ ہر طرح کی قربانی کے لئے آمادہ رہتے ہیں۔

(۱۰) روشن مستقبل : دشمن کو زیر کرکے روشن مستقبل کے حصول کا یقین بھی لڑنے والوں کو قوت و طاقت عطا کرتا ہے۔ لہٰذا ظلم و ستم سے نجات اور بہتر مستقبل کے لئے لوگ ہمیشہ انتھک جدوجہد کرتے ہیں۔ جب کہ ایسا فریق جس کے لئے کامیابی اور ناکامی دونوں برابر ہوں یا کامیابی غیر یقینی ہو وہ دل سردی کے ساتھ جنگ میں حصہ لیتا ہے۔

(۱۱) جسمانی طاقت و قدرت : قوی اور صحت مند جسم بھی قوت و طاقت کے مصادیق میں سے ہے۔ اسی لئے قدیم زمانہ ہی سے افواج اور لشکروں میں جسمانی صحت و قوت کو بنیادی طور پر پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔

(۱۲) منطق و استدلال کی قوت : منطق و استدلال بھی طاقت و قدرت کے مصادیق میں شامل ہے۔ یہ طاقت اتنی موثر ہے کہ بڑے بڑے لشکروں کو ہلا ڈالتی ہے۔ قوموں کا اندازِ فکر اور سوچ کا دھارا بدل ڈالتی ہے، بغیر لشکر کشی کے سلطنتوں پر سلطنتیں فتح کرلیتی ہے۔ بڑے بڑے زور آوروں کے قدم لڑکھڑا دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ائمہ معصومینؑ نے کسی بھی موقع پر اس قوت کے استفادہ سے اجتناب نہیں کیا۔ انتہائی گرم میدانِ جنگ میں بھی لوگوں کے سامنے اپنے موقف کی حقانیت پر استدلال کیا ہے۔

ائمہ اطہارؑ کا اپنے دور کے حکمرانوں سے طرزِ عمل

تمام ائمہ معصومینؑ آیاتِ قرآنی، فرامین و ہدایاتِ رسولِ مقبولؐ اور ذاتی صلاحیت و اہلیت کی بنیاد پر اپنے اپنے دور میں خود کو امت کی زعامت و حکمرانی کے منصب کا حقدار سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس ان کے مخالفین طاقت و قدرت، دھوکہ و فریب کے زور پر اس منصب پر براجمان ہوئے۔

ائمہؑ نے ہمیشہ اور ہر دور میں اپنے حق کا اظہار کیا اور اس کے حصول کے لئے کوشاں رہے۔ کبھی کبھی تو نوبت جنگ و نبرد تک جا پہنچی۔ جیسا کہ جمل، صفین، نہروان، کربلا اور کبھی مخالفت و مخاصمت سرد جنگ کی صورت میں جاری

رہی۔

جیسا کہ بیان ہوا بعض ائمہؑ نے مسلح جنگ کی اور بعض کی مخاصمت سرد جنگ تک محدود رہی۔ اسی لئے ایسے لوگ جو تاریخ کا گہرا مطالعہ اور اس کا تجزیہ و تحلیل کرنے سے عاجز ہیں انہوں نے سمجھنا شروع کردیا کہ ائمہؑ کے مزاج میں اختلاف پایا جاتا تھا' یا امامؑ ایک خاص عرصہ بعد مایوسی و ناامیدی کا شکار ہوگئے اور سیاست اور امت کی قیادت کے منصب سے دستبردار ہوکر گوشہ نشینی اختیار کرگئے۔

لیکن اگر ہم اپنے حق کے حصول کے سلسلہ میں جنگ و جہاد کے لئے اقدام یا گریز سے متعلق ائمہؑ کے اقوال اور اعمال کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ آپ حضرات طاقت و قدرت کی موجودگی میں مسلحانہ جہاد کے قائل تھے اور اس کی غیر موجودگی میں مسلحانہ جنگ سے گریز کرتے ہوئے سیاسی اقدامات اور قدرت و قوت کے حصول میں مشغول رہے تھے۔

امیرالمومنین حضرت علیؑ نے اپنی ۲۵ سالہ خاموشی کی بنیادی وجہ اعوان و انصار کی کمیابی کو قرار دیا۔ یہ بات آپؑ کے معروف خطبہ شقشقیہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ امام حسنؑ بھی مخلص اصحاب کے فقدان کی وجہ سے صلح پر مجبور ہوئے۔ امام حسینؑ پر جب واضح ہوگیا کہ اہلِ کوفہ نے آپؑ کی بیعت توڑ ڈالی ہے اور آپؑ سے منحرف ہوگئے ہیں تو آپؑ نے جنگ سے اجتناب کی کوشش کی۔ امام زین العابدینؑ سے جب کسی نے جنگ و جہاد سے کنارہ کشی کی بابت دریافت کیا تو آپؑ نے آیتِ قرآن کے ذریعہ مجاہدینِ راہِ خدا کی خصوصیات بیان کیں اور ان خصوصیات کے حامل افراد کی غیر موجودگی کو اپنے قیام نہ کرنے کی وجہ

قرار دیا۔

لیکن جب ائمہؑ کو طاقت و قدرت میسر ہوئی تو کسی مصلحت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے مردانہ وار طاغوتیوں سے جہاد کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ خطبۂ شقشقیہ کے آخری فقرات اس پر گواہ ہیں اور حضرت علیؑ کی معاویہ اور قاسطین، مارقین، ناکثین سے جنگ بھی ہمارے موقف کی موید ہیں۔ اسی طرح جب امام حسنؑ کو ایک لشکر میسر ہوا تو آپؑ کوفہ سے معاویہ کے خلاف جنگ کو نکلے۔ جب امام حسینؑ سے دریافت کیا گیا کہ آپؑ کوفہ کیوں تشریف لے جا رہے ہیں تو آپؑ نے فرمایا کہ اہلِ کوفہ نے میرے ہمرکاب رہ کر جنگ و جہاد کی بیعت کی ہے، میرا ساتھ دینے کا عہد و پیمان کیا ہے۔ اہلِ کوفہ کے اس عہد و پیمان کا تذکرہ امام حسینؑ کے کئی خطبات میں ملتا ہے، امام زین العابدینؑ اور حضرت زینب کبریٰؑ کی جانب سے اہلِ کوفہ کو ان کی پیمان شکنی پر زجر و توبیخ ایسے پیمان کی موجودگی کی دلیل ہے۔

الغرض ائمۂ معصومینؑ کی سیرتِ سیاسی میں تضاد و اختلاف نظر آنے کی ایک بڑی وجہ طاقت و قدرت کے صحیح مفہوم اور جنگ و جہاد میں اس کے کردار سے ناآشنائی ہے۔

(۵) مسئلۂ امامت سے ناواقفیت

مسئلۂ امامت سے ناواقفیت سیرتِ ائمہؑ کو سمجھنے میں حائل رکاوٹوں میں سے ایک رکاوٹ ہے۔

مسئلۂ امامت کے سلسلہ کا پہلا قابلِ توضیح نکتہ امامؑ اور امامت کا مفہوم

ہے۔ جسے ہم مختصر الفاظ میں یہاں واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

امام اور امامت کا مفہوم

ہم میں سے اکثر لوگ "امامت" اور "امام" میں فرق نہیں کر پاتے۔ "امامت" امت کی قیادت و رہبری کے نظام کا نام ہے۔ جب کہ "امام" اس شخصیت کو کہتے ہیں جو اس نظام کے معین اصولوں پر پورا اترتی ہو۔

دنیا میں رائج ہر سیاسی نظام کسی نظریے اور آئیڈیالوجی پر استوار ہے۔ اسلام کے سیاسی نظام کا سرچشمہ قرآن و سنت ہے' انہی مصادر سے یہ نظام ماخوذ ہے' یہی اس کی تفصیلات بیان کرتے ہیں۔

حیاتِ حضرت محمدؐ میں اسلام کے سیاسی نظام کے اجراء و نفاذ کے ذمہ دار اور اس کے قائد خود پیغمبرِ اسلامؐ تھے۔ آنحضرتؐ نے اپنے بعد اس نظام کی قیادت کے لئے جو اسلوب و روش اپنائی اسے نظامِ امامت' یا نظامِ خلافت کے نام سے پکارا جاتا ہے اور اس قائد کو امام یا خلیفہ کہتے ہیں۔

عام طور پر شیعہ حضرات رسولِ مقبولؐ کے جانشین کے لئے امام کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور اہلِ سنت کے یہاں خلیفہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن دونوں فرقوں کے علماء و محققین نے اپنی تصانیف میں دونوں ہی ناموں کو استعمال کیا ہے اس طرح یہ نام مترادف کے طور پر مستعمل ہیں۔

حیاتِ پیغمبرؐ سے لے کر اب تک شیعہ اور سنی کے درمیان اسلامی نظام کے نفاذ و رواج اور اس کی ضرورت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ اس نظام سے روگردانی اور اسے ترک کردینا جاہلیت کے مترادف ہے۔

جیسا کہ قرآن کا فرمان ہے۔

"افحکم الجاهلیه یبغون و من احسن من الله حکما لقوم یوقنون"

"(اگر یہ خدا کے قانون سے منہ موڑتے ہیں) تو پھر کیا جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟"

(سورہ مائدہ۵- آیت۵۰)

کیونکہ ظاہر ہے کہ دنیا میں دو ہی نظام ممکن ہیں یا اسلام یا جاہلیت جو کفر کے سوا کچھ نہیں۔ لہٰذا اسلام کو ترک نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس کی اہمیت سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے۔ اس بات کا ائمۂ اطہارؑ نے اپنے دور میں لحاظ رکھا اور ان کے بعد علماء نے بھی اسے ملحوظ رکھا۔

دوسرا مسئلہ اس نظام کے حاکم و رہبر کا ہے۔ شیعہ نکتۂ نظر سے اس نظام کا قائد و رہبر معصوم ہونا چاہئے جو ہر زمانہ میں ایک ہی فرد ہوتا ہے۔ جہاں تک رہی بقیہ کارپردازانِ حکومت اور دوسرے عہدیداروں کی بات تو ان کے غیر معصوم ہونے میں شیعہ اور سنی مکاتبِ فکر میں کوئی اختلاف نہیں۔

معصوم کی غیر موجودگی یا اس کے معذور ہونے کی صورت میں قیادت کے لئے عادل شخص کا انتخاب کرنا چاہئے۔ اور اگر عادل میسر نہ ہو فاسق موجود ہو اور فاسق یا کافر قیادت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو تو ائمہ اور علماء نے فاسق حاکم کو برداشت کیا ہے۔ کافر حاکم جس کے نتیجے میں لازماً ایک کافر حکومت قائم ہوگی کو مسترد کیا ہے۔

دوسرے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ ائمہ معصومینؑ اور علماء تشیع نے غیر معصوم اور حتیٰ فاسق حکمرانوں کو تو برداشت کیا ہے لیکن کسی صورت غیر اسلامی نظام حکومت پر راضی نہیں ہوئے۔ کیونکہ قیادت کے نظام میں اصلاح کی گنجائش اسی صورت میں پائی جائے گی جب وہ نظام موجود ہو لیکن اگر نظام ہی ختم ہوجائے تو پھر کسی قسم کی اصلاح کی گنجائش بھی مفقود ہوجائے گی۔ لہٰذا ائمہؑ کے پیروکاروں کی بھی ہر دور میں یہ کوشش ہونی چاہئے کہ اول تو اسلامی نظام کے نفاذ کو ہر دوسرے نظام پر ترجیح دیں، دوسرے اس نظام کے قیام کے لئے اگر پہلے مرحلہ میں ناقص نظامِ امامت و قیادت کو بھی قبول کرنا پڑے تو اس سے دریغ نہ کریں، کیونکہ بہرحال اسی صورت میں کامل نظامِ امامت کا قیام مضمر ہے، بصورتِ دیگر اگر نظام ہی نہ ہوگا تو پھر اس میں اصلاح اور تکمیل کی بات ہی عبث قرار پائے گی۔

امامت کی اہمیت

مسئلہ امامت کے سلسلہ کی دوسری بات امامت کی اہمیت کو سمجھنا ہے جس کا ادراک دو زاویوں سے ممکن ہے۔ ان دو زاویوں پر توجہ کے ذریعہ امامت کی اہمیت اور امام کا مقام و مرتبہ واضح ہوسکتا ہے۔

(ا) واقعی اور خارجی زاویہ

پیغمبرِ اسلامؐ کی رحلت کے بعد امتِ مسلمہ کی پستی و اضمحلال اور اس کی صفوں میں رونما ہونے والے تمام اعتقادی، فقہی، سیاسی اور معاشرتی اختلافات کی جڑ اور سرچشمہ مسئلہ امامت و قیادتِ امت ہے۔ حد تو یہ ہے کہ تعدد مراجع

کی ایک وجہ بھی ملت کی قیادت و رہبری کی تمنا ہے۔

بنابرایں جس طرح قیادت و زعامتِ امت اختلاف و انتشار کی وجہ ہے اسی طرح اس منصب کے لئے تمام لوگوں کا کسی ایک ہستی پر متفق ہو جانا' قیادت کے لئے کسی معیار و کسوٹی کا پابند ہو جانا سببِ اتحاد و اتفاق ہے۔ گویا مسئلۂ امامت اتفاق کا بھی نکتۂ آغاز ہے اور انتشار و افتراق کا بھی سرچشمہ ہے۔

لہٰذا شریعت میں اس مسئلہ کی اہمیت کے برابر کسی اور مسئلہ کو اہمیت حاصل نہیں۔ بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہو گا کہ دین کی بقاء و استمرار اسی مسئلہ کے احسن طریقے سے حل ہونے سے وابستہ ہے۔ چنانچہ جنابِ فاطمۃ الزہراؑ' حضرت امام جعفر صادقؑ' حضرت موسیٰ کاظمؑ اور حضرت امام علی رضاؑ سے مروی روایات مذکورہ مدعا پر گواہ ہیں اور اس بات کی تاکید پر مشتمل ہیں کہ "مسئلۂ امامت کو نظرانداز کر کے اصلاحِ امت کی کوئی بھی کوشش کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی اور کسی بھی منزل تک پہنچ نہیں سکتی۔"

(۲) شرعی زاویۂ نگاہ

کیا مسئلۂ امامت سے صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے؟ کیا امامِ واقعی کو منصبِ زعامت سے جدا رکھ کر اسلامی قوانین کے اجراء کی ضمانت دی جا سکتی ہے' کیا اس کے بغیر انسانی سعادت و کمال کا حصول ممکن ہے' کیا تمام خامیوں اور خرابیوں کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے؟ کیا امام اقتدار سے جدا رہ کر مظلوموں کی دادرسی کو پہنچ سکتا ہے' کیا اس صورت میں اپنے اصحاب' جانثاروں اور معتقدین کو ظلم و ستم' قید و جبر سے نجات دلا سکتا ہے؟ کیا امامؑ کو محض قیادتِ امت کا اہل سمجھنا

کافی ہے اور ان کو قیادت کے منصب پر لانے کے لئے جدوجہد ہم پر فرض نہیں؟

جب تک امامِ واقعی کی امامت جامہء عمل نہ پہنے گی، امام اپنے منصب پر براجمان نہ ہو گا اس وقت تک شریعت ناقص رہے گی۔ اور اس دعوی کی تائید وہ روایات کرتی ہیں جن میں توحید، نماز، عدل و انصاف کا قیام امام ہی سے مربوط کیا گیا ہے۔

(و) ائمہؑ کے بشری پہلو کا انکار

سیرتِ ائمہؑ کو سمجھنے میں ایک اور رکاوٹ ائمہؑ کے بشری پہلو کا انکار ہے۔ یعنی یہ سمجھنا ہے کہ ائمہؑ بشر نہ تھے۔ جب کہ اگر ہم قرآنِ کریم کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کرام جب مبعوث ہوئے تو ان کے دور کے طاغوتوں نے ان کی تحریک کو یہ کہہ کر مسترد کیا کہ "تم تو ہم ہی جیسے بشر ہو، ہم کیونکر تمہیں الٰہی نمائندہ سمجھیں" لیکن قرآنِ کریم نے کسی ایک مقام پر بھی ان اعتراض کرنے والوں کو یہ جواب نہ دیا کہ "نہیں یہ بشر نہیں تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" اس کے برعکس جب انبیاء پر ساحر، دیوانے، مجنون یا ملک کی تہمت لگائی گئی تو قرآن نے فوراً ان لوگوں کے اس الزام کو مسترد کیا اور کہا کہ "اگر ہم فرشتے بھی تمہارے پاس بھیجتے تو وہ بشر ہی کی صورت میں آتے۔"

انبیاء الٰہی کو مسترد کرنے والوں کی دو منطقیں تھیں۔ ایک یہ کہ وہ ہم جیسے بشر ہیں اور دوسرے یہ کہ انہیں ہم پر کوئی (مادی) امتیاز حاصل نہیں۔ خداوندِ عالم اور خود انبیاء نے ان کی پہلی منطق کو مسترد نہیں کیا۔ بلکہ اس کی تصدیق کی اور کہا کہ ہاں یہ بشر ہیں۔ لیکن دوسری منطق کو یکسر مسترد کیا اور کہا کہ

یہ تم پر امتیاز رکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ یہ خدا سے متصل ہیں' ان کا خدا سے رابطہ ہے' ان کا امتیاز یہ ہے کہ یہ حاملِ وحی ہیں۔

اس طرح آیات کی رو سے انبیاء و ائمہؑ دونوں پہلوؤں سے ہمارے لئے نمونہ عمل' مقتداء و پیشوا ثابت ہوتے ہیں۔ بشری پہلو سے اس طرح کہ اگر وہ بشر نہ ہوتے بلکہ اس کی بجائے فرشتے یا جن یا کوئی اور مخلوق ہوتے تو ہمارے لئے کسی صورت نمونہ عمل قرار نہ پاسکتے تھے اور حاملِ وحی ہونے کے پہلو سے اس طرح کہ وہ وحیٔ الٰہی وصول کر کے ہماری رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے تھے اور یہی ان کا ہم سے امتیاز ہے کیونکہ عام انسانوں میں حصولِ وحی کی صفت و خصوصیت نہیں پائی جاتی بلکہ ائمہ و انبیاء ہی اس سے متصف ہوتے ہیں۔

کچھ اس کتاب کے بارے میں

متعدد آیات اور احادیثِ معصومینؑ کی رو سے انسانی حیات کے تمام انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں اور اس کی زندگی کے اقتصادی' سیاسی' اخلاقی' عقیدتی غرض تمام شعبوں کے لئے رہنما' معلم اور نمونہ عمل اہلِ بیتِ طاہرینؑ ہیں۔ خداوندِ عالم کی بارگاہ میں ارفع و اعلیٰ درجات پر فائز یہ ذواتِ مقدسہ کسی اور مذہب و ملت کو میسر نہیں۔ صرف شیعہ ہی نہیں بلکہ خوارج اور نواصب کو چھوڑ کر باقی تمام مسلمان اہلِ بیتِ رسولؐ کی عصمت و پاکیزگی اور اہلیت و شائستگی کے قائل اور ان پاکیزہ ہستیوں کے شیفتہ و شیدا ہیں-----

لیکن حالات کی ستم ظریفی کہ رسولِ مقبولؐ کی رحلت کے بعد اہلِ بیتؑ کو امت کی قیادت و زعامت کے منصب سے دور رکھا گیا۔ جس کی وجہ سے رفتہ

رفتہ ان کی تعلیمات بھی پسِ پردہ چلی گئیں۔ پھر ان اسباب کی بنا پر جن کا ہم نے گزشتہ صفحات میں اجمالی طور پر ذکر کیا ائمہؑ کی سیاسی و اجتماعی زندگی بھی نظروں سے اوجھل رہی، اس پر علماء و محققین نے بھی روشنی نہ ڈالی بلکہ ائمہ معصومینؑ کی اخلاقی خصوصیات اور ان کے فضائل و مناقب کے بیان تک اپنی کاوشیں محدود رکھیں۔

زیرِ نظر کتاب جس میں تمام ائمہؑ کی سیاسی زندگی کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ اپنی نوعیت کی اولین کاوش ہے۔ لہٰذا اس کتاب کے منصف گرامی قدر استاد عادل ادیب جو عراق کے انقلابی رہنما حضرت آیت اللہ شہید سید محمد باقر الصدر علیہ الرحمہ کے محضرِ درس کے خوشہ چینوں میں سے ہیں اور اس وقت تہران یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں، لائقِ تحسین ہیں کہ انہوں نے شہید سید محمد باقر الصدرؒ کے افکار سے استفادہ کرتے ہوئے ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیاسی، اجتماعی اور تحریکی زندگی کو ایک کتاب کی صورت میں پیش کرنے کا فخر حاصل کیا، خدا ان کی کاوشوں کو درجہ قبولیت عطا فرمائے۔

علی شرف الدین موسوی

۱۵ ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ

کراچی

تمہید

سیرتِ ائمہؑ کے مطالعہ کی روش

تاریخ دانوں نے ائمہ معصومینؑ کی سیرت کا دو زاویہ نگاہ سے جائزہ لیا ہے۔

پہلا زاویہ نگاہ

بعض مورخین نے ائمہ اہلِ بیتؑ کو ان پیشہ ور سیاست دانوں کی صف میں شامل کیا ہے جو سیاست کو اپنے ذاتی، خاندانی یا جماعتی مفادات کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس طرح یہ حضرات ائمہؑ اور ان کے مشن میں (جو ائمہؑ کی پوری حیات میں رچا بسا ہوتا ہے) دوئی پیدا کردیتے ہیں۔ اور اسی بناء پر اس قسم کے مورخین ائمہ معصومینؑ کی اجتماعی، سیاسی اور نظریاتی کارکردگی کا جائزہ ایسے سیاسی لیڈروں کی کارکردگی کے جائزہ کی طرح لیتے ہیں جو حالات کی نرمی و سختی اور اپنی پست اور بلند ہمتی کے لحاظ سے اپنے کردار کا تعین کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر ان کی نظر میں امام علیؑ اس سیاسی دور اندیشی، ہوشیاری اور پختگی سے محروم تھے جو سیاسی قیادت کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ان کے نزدیک معاویہ کافی سیاسی تدبر اور پختگی کا حامل تھا۔ اسی طرح ان

مورخین نے معاویہ کے ساتھ امام حسنؑ کی صلح اور سیاسی موقف کو امام حسنؑ کی ذاتی کمزوری اور بڑے بڑے مسائل میں آپؑ کی ناپختگی پر محمول کیا ہے۔ جب کہ امام حسینؑ ان مورخین کے نزدیک بلند ہمتی اور عزم و حوصلے کا مرقع ہیں۔★

خلاصہ یہ کہ ان تاریخ دانوں نے ائمہؑ کے اقدامات اور ان کی عملی زندگی کا قریب قریب اسی انداز سے جائزہ لیا ہے جیسے دوسری سیاسی شخصیات کی زندگیوں کا لیا جاتا ہے۔ گویا ائمہؑ کی عملی زندگی بھی ذاتی یا خارجی اسباب کے تحت رونما ہونے والی چند سیاسی کامیابیوں اور ناکامیوں سے عبارت ہے۔

دوسرا زاویہ نگاہ

بعض مورخین نے ہر امامؑ کی زندگی کا الگ الگ اور غیر مربوط مطالعہ کیا

★ احمد بن عباس صالح اپنی کتاب (الیمین والیسار) کے صفحہ ۱۴۲ پر لکھتا ہے کہ "اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ امام حسنؑ نے معاویہ کے خلاف وہ کردار ادا نہیں کیا جس کی ان سے توقع تھی۔ ان کی کمزوری اور معاویہ کے سامنے جھکنے کی جتنی بھی توجیہ کی جائے بہرحال آپؑ نے اپنے باپ کی روش کی مخالفت کی۔" امام حسینؑ کے بارے میں لکھتا ہے کہ "حسینؑ حسنؑ سے مختلف تھے۔ آپؑ میں اپنے باپ کی بہت سی خصوصیات موجود تھیں۔ حسینؑ اپنے بھائی کے اس عمل میں ان کے موافق نہ تھے انہوں نے اپنے بھائی سے اس مسئلہ پر اختلافِ رائے کیا۔

یہی مصنف اپنی ایک اور کتاب "الحرکات السریۃ فی الاسلام" کے صفحہ ۶۶ پر لکھتا ہے "علیؑ کی موت کے بعد شیعہ آپؑ کے بیٹے حسنؑ کے گرد جمع ہو گئے۔ لیکن انہوں نے آرام کی زندگی کو ترجیح دی اور اپنے حق سے باآسانی دستبردار ہو گئے تاکہ کوئی فتنہ بپا نہ ہو۔ حسنؑ کے بعد شیعہ حسینؑ کے گرد جمع ہو گئے جو خلافت کے طالب تھے اور بنی امیّہ کی موروثی سلطنت کے مخالف بھی۔

ڈاکٹر صبحی سالم نے بھی اپنی کتاب "النظم الاسلامیۃ نشاء تھا و تطورہا" کے صفحہ ۲۶۰ پر اسی قسم کی باتیں لکھی ہیں۔

ہے۔ یہ طریقہ اگرچہ ہر امامؑ کی زندگی کے جداگانہ مطالعہ کے لئے مفید ہے اور غالباً باعثِ اختصار بھی۔ لیکن اس مطالعہ سے یہ تاثر ملتا ہے کہ گویا ائمہؑ کی زندگیاں ایک دوسرے سے منسلک، ہم آہنگ اور مربوط نہ تھیں بلکہ متضاد اور غیر مربوط تھیں۔ بالفاظ دیگر ہر ایک کی اپنی اپنی ایک الگ دنیا تھی۔ گویا امام حسن "صلح پسند ہونے کی وجہ سے" معاویہ سے صلح کر لیتے ہیں لیکن حسینؑ "اپنی سخت طبیعت کی بناء پر" بنی امیہ کے ساتھ ٹکراؤ کی پالیسی پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ نیز گویا امام سجادؑ کا سروکار فقط دعاؤں سے ہے اور امام محمد باقرؑ کی زندگی صرف فقہ و حدیث سے مربوط ہے۔

مختصر یہ کہ پہلے زاویہ نگاہ نے ائمہؑ کو ان کے عظیم مشترکہ مشن سے جدا کیا اور دوسرے نقطہ نگاہ کی رو سے ائمہؑ کے درمیان کوئی ایسی قدرِ مشترک نظر نہیں آتی جو ان کی پالیسیوں اور اقدامات میں ہم آہنگی اور وحدت کو ظاہر کرے اور سارے ائمہؑ ایک زنجیر کی مختلف کڑیوں کی صورت میں نظر آئیں جن میں سے ہر ایک باہمی اتصال اور مقصد کی تکمیل کے واسطے ایک دوسرے کے لئے ضروری ہو۔

لہٰذا اسلام کے تحفظ و بقا کے لئے ائمہ معصومینؑ کے کردار اور ان کی سرگرمیوں کے درمیان ہم آہنگی اور نقطہ مشترک کو پہچاننے کے لئے ضروری ہے کہ ہم یہاں بعض ایسے امور کو واضح کریں جن کا راہِ اسلام میں ائمہؑ کی جدوجہد سے گہرا واسطہ ہے۔ اس سلسلہ میں ہم مندرجہ ذیل موضوعات پر بحث کریں گے۔

☆ تاریخِ اسلام میں ائمہؑ کا کردار۔

☆ معاشرتی و اجتماعی امور میں اسلام کی حکمتِ عملی۔

☆ مذکورہ حکمتِ عملی اور ائمہؑ کی اصلاحی جدوجہد میں ہم آہنگی و ارتباط۔

(۱)

تاریخِ اسلام میں ائمہؑ کا کردار

اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ پیغمبرِ اسلامؐ کی رحلت ان حالات میں ہوئی جب کہ ابھی اسلام کی تمام عملی و فکری تعلیمات مکمل طور پر سامنے نہیں آئی تھیں اور ابھی آپؐ کے مشن کے اہداف کو کاملاً عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکا تھا۔

فکری طور پر تو پیغمبرِ اسلامؐ کو بس اتنی فرصت ملی کہ آپؐ شریعتِ اسلامی کے موٹے موٹے اصولوں اور فقہ اسلامی کی کچھ بنیادی تفصیلات سے عام لوگوں کو روشناس کرا سکیں۔۲۔ رہا عملی نقطہ نظر سے تو معاشرے کے فکری و عملی انقلاب یعنی فکری، عملی اور نظریاتی انسانوں اور معاشرے کی تعمیر کے لئے پیغمبرِ اکرمؐ کی انقلابی دعوت چہ جائے کہ پوری مملکتِ اسلامی بلکہ خود اسلامی دارالحکومت مدینہ منورہ کی سطح پر بھی ابھی کمالِ مطلوب تک نہ پہنچی تھی۔ اس حقیقت کا اظہار عام مسلمانوں کے علاوہ بعض بڑے اصحاب کے اعمال سے بھی ہوتا ہے۔

ابھی رسولِ مقبولؐ کے انتقال کو پچیس سال بھی نہ گزرے تھے کہ خلافتِ راشدہ اور حکومتِ اسلامی جس کی قیادت مہاجرین و انصار کے ہاتھوں میں تھی،

اسلام کے قدیمی دشمنوں کے پے در پے اور شدید حملوں کی وجہ سے شکست و ریخت اور ناکامی کا شکار ہونے لگی۔ یہ حملے بیرونی نہ تھے بلکہ خود اندرونی ریشہ دوانیوں کی صورت میں تھے۔ یہ حملہ آور اسلامی سماج میں چھا گئے اور رفتہ رفتہ قیادت کے اندر گھس جانے اور غافل مرکزی قیادت کو چکمہ دینے میں کامیاب ہوگئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے انتہائی بے شرمی، ڈھٹائی اور دھونس و دھاندلی کے ساتھ مرکزی قیادت پر قبضہ کرلیا اور امتِ مسلمہ اور مسلمانوں کی ابتدائی کھیپ کو اقتدار سے دستبردار ہونے پر مجبور کردیا۔ نتیجہ کے طور پر اسلامی قیادت ایک ایسی موروثی حکومت میں بدل گئی جس کا کام دینی اقدار کا مذاق اڑانا اور احکام و حدودِ الٰہی کو پامال کرنا تھا۔ یوں خلافت بنی امیّہ کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ گئی۔ ۳

یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ کی مختصر زندگی اس دور میں اہلِ مدینہ کے درمیان معاشرتی انقلاب کے عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے کافی نہ تھی۔ بنا بر ایں ایک ایسے مثبت موقف کی ضرورت تھی جو اسلام کے تاریخی تکاملی سفر کو راہِ مستقیم پر جاری و ساری رکھ سکے، امتِ مسلمہ کی تعمیر و تربیت کر سکے اور دینِ خاتم المرسلینؐ کی تعلیمات سے امت کی فکر و نظر کو صحیح معنوں میں منور کرنے کی ضمانت دے سکے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ فکری و سیاسی قیادت ایسے (معصوم) افراد کے پاس ہو جو وہی کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں جو امینِ وحی رسولِ اکرمؐ نے ادا کیا۔ اور ان میں وہ استعداد موجود ہو جو پیغمبرِ اسلامؐ کی انسان ساز اصلاحی و انقلابی تحریک کو عملاً جاری و ساری رکھنے اور اسلام کی فکری اور دستوری تعلیمات کو تمام جزئیات

اور تفصیلات کے ساتھ وقت کے تقاضوں کے مطابق بیان کرنے کے لئے کافی ہو۔

یہیں سے نظریہ امامت کی کلی پھوٹتی ہے تاکہ ائمہؑ اپنے علم و معرفت کے ذریعے اسلام کے کارواں کو اپنی انقلابی اور معاشرہ ساز منزلِ مقصود کی طرف گامزن رکھیں۔ اس مقام پر اس بات کی طرف اشارہ مناسب ہے کہ سلسلۂ امامت راہِ رسالت کی بقاء اور اسلام و امتِ مسلمہ کی حفاظت کے لئے نہ صرف ایک تاریخی ضرورت ہے بلکہ بقاء شریعت کا راستہ بھی ہے جس کی وضاحت خود رسولِ خداؐ نے مندرجہ ذیل دو طریقوں سے فرمائی ہے۔

پہلا طریقہ

پہلا طریقہ عملی ہے اور وہ یوں کہ رسولِ خداؐ نے حضرت علیؑ کو بچپن سے ہی اپنے بچوں کی طرح پالا پوسا اور آپؑ کو فکری اور روحانی طور پر اس طرح تیار کیا کہ حضورؐ کی رحلت کے بعد آپؑ امت کی فکری و سیاسی قیادت سنبھال سکیں۔ جیساکہ سیرت کی کتابوں کا اس امر پر اتفاق ہے۔

چنانچہ رسولِ اکرمؐ حضرت علیؑ کو خصوصی طور پر اسلام کے حقائق سے روشناس فرماتے تھے اور جب بھی آپؑ خواہش کرتے، حضورؐ آپ کو فکری و عملی غذا فراہم کرتے۔ آپؐ انہیں رات دن گھنٹوں تنہائی میں بٹھا کر اس عظیم مشن کے حقائق، راستے کی مشکلات اور طریقِ کار سے آگاہ فرماتے۔ یہ سلسلہ حضورؐ کی زندگی کے آخری دن تک قائم رہا۔[۴]

حاکم نے مستدرک میں اپنی اسناد کے ساتھ ابواسحاق سے یوں روایت کی

ہے۔

”میں نے قثم بن عباس سے پوچھا۔ علی کس طرح پیغمبر کے وارث بنے؟

جواب دیا : وہ ہم سب سے پہلے پیغمبرؐ کے ساتھ ملحق ہوئے اور ہم سب سے زیادہ حضورؐ کے ہمراہ رہے۔“

نسائی نے خود امام علیؑ سے روایت کی ہے کہ آپؑ فرمایا کرتے تھے کہ۔

”جب بھی میں رسولِ خداؐ سے کوئی سوال کرتا تھا آپؐ جواب دیتے تھے اور اگر میں خاموش ہو جاتا تو آپؐ خود گفتگو شروع کرتے تھے۔“

حاکم نے بھی اس حدیث کو مستدرک میں نقل کیا ہے۔

امیرالمومنین نے نہج البلاغہ میں موجود معروف خطبہ ”قاصعہ“ میں رسولِ خداؐ کے ساتھ اپنے مخصوص ارتباط اور اپنی تربیت کے سلسلے میں حضورؐ کی خصوصی توجہ کے بارے میں یوں فرمایا ہے کہ۔

”تم جانتے ہی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے قریب کی عزیزداری اور مخصوص قدر و منزلت کی وجہ سے ان کے نزدیک میرا مقام کیا تھا کہ رسولؐ نے مجھے گود لے لیا تھا۔ اپنے سینے سے چمٹائے رکھتے تھے۔ بستر میں اپنے پہلو میں جگہ دیتے تھے۔ اپنے جسمِ مبارک کو مجھ سے مس کرتے تھے اور اپنی خوشبو مجھے سنگھاتے تھے۔ پہلے آپؐ کسی چیز کو چباتے اور پھر اس کے لقمے بنا کر میرے منہ میں دیتے تھے۔ انہوں نے نہ تو میری کسی بات میں جھوٹ کا شائبہ پایا نہ میرے کسی کام میں لغزش و کمزوری دیکھی۔ اللہ نے آپؐ کی دودھ بڑھائی کے وقت ہی

سے فرشتوں میں سے ایک عظیم المرتبت ملک (روح القدس) کو آپؐ کے ساتھ لگا دیا تھا۔ جو انہیں شب و روز بزرگ خصلتوں اور پاکیزہ سیرتوں کی راہ پر لے چلتا تھا اور میں ان کے پیچھے پیچھے یوں لگا رہتا تھے جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے۔ آپؐ ہر روز میرے لئے اخلاقِ حسنہ کو روشن فرماتے تھے اور مجھے ان کی پیروی کا حکم دیتے تھے اور ہر سال (کوہ) حرا میں کچھ عرصہ قیام فرماتے تھے اور وہاں میرے علاوہ کوئی انہیں نہیں دیکھتا تھا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور (ام المومنین) خدیجہؓ کے گھر کے علاوہ کسی گھر کی چار دیواری میں اسلام نہ تھا البتہ ان میں تیسرا میں تھا۔ میں وحی و رسالت کا نور دیکھتا تھا اور نبوت کی خوشبو سونگھتا تھا۔ ؎۵"

دوسرا طریقہ

دوسرا طریقہ فکری و نظری ہے۔ جس کا رسولِ خداؐ نے مختلف موقعوں پر اپنے باقاعدہ بیانات میں اظہار فرمایا۔ تاکہ اسلام کے منشورِ حیات میں نظریہ امامت کی اہمیت کو واضح فرما سکیں۔ بطورِ مثال حدیثِ منزلت میں فرمایا۔

"یا علیؑ کیا آپؑ نہیں چاہتے کہ آپؑ کی نسبت مجھ سے ویسی ہی ہو جس طرح ہارونؑ کی موسیٰؑ سے تھی۔ سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہو گا" ؎۶۔

نیز حدیثِ ثقلین میں فرمایا۔

"میں تم (امت) میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ خدا کی

کتاب اور میرے اہلِ بیتؑ۔ یہ دونوں ہرگز جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر میرے پاس حاضر نہ ہو جائیں۔" ★

اور حدیثِ غدیر میں اعلان فرمایا۔

"جس کا میں آقا و مولا ہوں علیؑ بھی اس کے آقا و مولا ہیں۔"

مذکورہ بالا معروضات کی روشنی میں امامت ایک تاریخی اور دینی ضرورت بن کر سامنے آتی ہے تاکہ راہِ رسالت کو فکری و عملی دونوں میدانوں میں تکمیل کی منزل تک پہنچائے۔ اس کے علاوہ آگے چل کر اسلامی تاریخ میں رونما ہونے والے حوادث نے بھی امامت کی اہمیت کو ثابت کر دیا۔ جنہیں ہم مندرجہ ذیل دو نکات کی صورت میں واضح کرتے ہیں۔

پہلا نکتہ ۔ قانون گزاری

اس کی تفصیل یہ ہے کہ وصالِ پیغمبرؐ کے بعد جدید حالات اور نت نئے تقاضے سامنے آئے۔ جن کا پیغمبرؐ کے دور میں سامنا نہ ہوا تھا۔ لہٰذا بعدِ وصالِ پیغمبرؐ حکمرانوں کے لئے ضروری ہوا کہ نئے پیدا شدہ مسائل کا حل تلاش کریں اور اپنی طرف سے قانون سازی کریں اور یہ کام انہوں نے کیا بھی، جو اکثر ان کی ذاتی رائے پر مبنی تھا۔ بنابراین جہاں جہاں نصِ شرعی اور حکمِ صریح نہ ملا وہاں

★ علامہ عبدالحسین شرف الدین کی کتاب المراجعات ۔ ص۴۹ پر اس حدیث کے بارے میں اہلِ سنت کی بکثرت اسناد کا ذکر ملتا ہے اور دار التقریب بین مذاہبِ اسلامیہ (مصر) نے بھی اس حدیث کے ماخذ کے بارے میں ایک جامع رسالہ طبع کیا ہے۔ یہی حدیث صحیح ترمذی ۔ ج۲ ۔ ص۳۰۸ اور اسد الغابہ ۔ ج۲ ۔ ص۱۲ پر نہایت معمولی اختلاف کے ساتھ موجود ہے۔

خلفاء نے قیاس و استحسان وغیرہ کی صورت میں ذاتی رائے کا سہارا لیا۔ جس کا نتیجہ اسلام کی حقیقی تعلیمات کے منافی احکام کی صورت میں ظاہر ہوا اور اس قسم کے امور بڑے بڑے نامور صحابہ کے ہاتھوں سرزد ہوئے۔ یہ سلسلہ جاری رہا جو شریعتِ اسلامی میں عظیم تحریفات پر منتج ہوا جیسا کہ اموی عہد میں اس کا صاف مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازایں اجتہاد کی یہ روش ایک معروف مکتبہ فکر میں بدل گئی جسے ''اجتہاد بالرائے'' کہتے ہیں۔ (اور اس کے ماننے والوں کو اصحاب الرائے) ★

بعد میں اس مکتبِ فکر (اجتہاد بالرائے) کو ایک زبردست ردِّ عمل کا سامنا ہوا جس کے نتیجے میں سرزمینِ حجاز میں ایک جدید مکتبِ فکر (اہلِ حدیث) وجود میں آیا، جو اولاً پیغمبرؐ سے منقول احادیث اور ثانیاً صحابہ و تابعین کے اجتہادات کے ساتھ تمسک کو ترجیح دیتا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ پیغمبرؐ کی رسالت کو اہلِ رائے کی پیدا کردہ آلائشوں سے محفوظ رکھنے کے لئے صرف حدیث کی طرف بازگشت ضروری اور کافی ہے۔

ہر کوئی ان حالات کی نزاکت کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے جب کہ شریعتِ اسلامیہ ان دو مکاتبِ فکر کی کشمکش سے روبرو تھی۔ جن میں سے ایک مکتبہ فکر کی بنیاد ''اجتہاد بالرائے'' پر تھی۔ ان کے نزدیک اجتہاد کے لئے شارع مقدس کی

★ شہرستانی اس بارے میں کہتا ہے کہ ہم قطعی طور پر جانتے ہیں کہ بے اندازہ حوادث و واقعات پیش آئے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر جگہ اور ہر موقع کے لئے نص موجود نہ تھیں۔ اور جانتے ہیں کہ محدود نصوص لامحدود مسائل کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ لہٰذا پس قیاس و اجتہاد واجب الاعتبار ہے تاکہ ہر مسئلہ کا حل نکالا جا سکے۔ (اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے ''علم الاصول''۔ از عبداللہ۔ ص ۲۹۵ کی جانب رجوع فرمائیں۔)

رہنمائیوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہ لوگ شریعت کے معاملے میں بہت بے پروا تھے اور شریعت کی جو تعلیمات انسانی فکر و رائے کی حدود سے باہر تھیں ان میں اپنی مرضی سے فیصلہ اور دست اندازی کرتے تھے۔٨ اور دوسرا مکتبِ فکر خشک اور بے لچک رویّے کا حامل تھا اس کے نزدیک انسان کے لئے رونما ہونے والے جدید حالات و مسائل کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ ان کو فقط (قرآن و حدیث کے) الفاظ سے سروکار تھا۔ وہ بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں کے باوجود اس سے آگے قدم بڑھانے کے لئے تیار نہ تھے۔ کتاب و حدیث کے الفاظ کے ظاہر کے علاوہ انہیں ہر چیز سے انکار تھا۔ جیسا کہ داؤد اور فرقہ ظاہریہ کے دیگر پیروؤں کا یہی نظریہ تھا۔٩

ان حقائق کی رو سے اسلامی نظامِ حیات میں امامت کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ تاکہ امامت شریعتِ مقدسہ کو ان دونوں مکاتبِ فکر کی لغزشوں سے محفوظ رکھے۔ یعنی ایک طرف شریعتِ مقدسہ کے منابع و ماخذ میں ذاتی رائے کو داخل کرکے اس کی عظمت، اصالت اور قوت کو کمزور کرنے والے "اصحاب رائے" اور دوسری طرف قرآن و حدیث کے ظاہری الفاظ سے چمٹ کر شریعت کو جمود و رکود کا شکار بنانے والے "اصحابِ حدیث" کی لغزشوں کے بُرے اثرات سے شریعتِ مقدسہ کو بچا سکے۔

دوسرا نکتہ۔ عملی طریقہ

دوسرا نکتہ جس سے امامت کا اثبات ہوتا ہے ایک عملی طریقہ ہے۔ وہ یوں کہ جب اسلامی حکومت امامت سے محروم ہوگئی اور شوریٰ کے نام سے ایک نئی چیز سامنے آئی تب ہی سے سیاسی، فکری اور اجتماعی رہنمائی کے مراکز میں

انحرافات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہاں تک کہ حقیقی اسلام کا تجربہ زندہ درگور ہوگیا اور سابقہ موروثی حکومت لوٹ آئی۔ جس نے احکامِ خدا کو پامال اور روحِ شریعت کی پاکیزگی کو آلودہ کردیا۔ اس کے اثرات اموی و عباسی حکومتوں، ان سے ملنے والی تباہیوں، مصیبتوں، بدبختیوں اور نئی نسل کی مکتبِ وحی سے دوری کی صورت میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

ان حقائق کے پیشِ نظر رسالت کی بقاء کے لئے امامت کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔ تاکہ نظریاتی اور عملی میدان میں امامت وہی کردار ادا کرے جو رسالت نے ادا کیا۔ یہیں سے اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ اسلام کی تاریخی روش میں امامت کو کس قدر بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

(۲)

معاشرتی و اجتماعی امور میں اسلام کی حکمتِ عملی

ہمارے خیال میں اپنی انقلابی دعوت کو انسانی زندگی میں عملاً مجسم دیکھنا اسلام کے نزدیک سب سے اہم بات رہی ہے اور انسانی اذہان اور ان کے افکار و نظریات اور جذبات و احساسات کو یکسر بدل دینا اسلامی دعوت کا مطلوب و مقصود رہا ہے۔ اسی بناء پر اسلام کی یہ پالیسی جو تمام فکری اور عملی میدانوں میں اجتماعی کار و کوشش کی متقاضی تھی کئی اصول و ضوابط کی صورت میں ظاہر ہوئی جو خود مستقل اہمیت کے حامل بن گئے۔ مثلاً اسلام کی تبلیغ اور امربالمعروف کا واجب ہونا نیز اسلامی سماج کی حفاظت اور اسلامی دعوت کی توسیع کے لئے جہاد کا وجوب وغیرہ۔

اگرچہ اجتماعی امور میں اسلام کی پالیسی تاریخ کے مختلف ادوار میں ظاہراً ثابت اور غیر متغیر رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود انسانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور مخصوص حالات و ماحول کے پیشِ نظر اس کے نفاذ کا طریقہ کار اپنے اندر تبدیلی کی لچک رکھتا ہے۔ علاوہ ازایں یہ نکتہ بھی یہاں بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی و معاشرتی روش میں یہ تنوع جو شریعتِ اسلامی نے دعوتِ اسلام سے لے کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور جہاد کے سلسلہ میں اپنایا کسی بھی مشن کے دائرہ میں وسعت اور پھیلاؤ کا لازمہ ہے۔

اسی لئے اسلامی معاشرہ کے حدود سے باہر اسلام کی تبلیغ و دعوت کا مسئلہ نہایت اہم ذمہ داری ہے۔ اسی کی بدولت اسلام کی دعوت ان لوگوں تک بھی پہنچ جاتی ہے جن تک ابھی یہ پیغام پہنچا ہی نہ ہو تاکہ انہیں دائرۂ اسلام میں داخل کیا جائے اور چشمۂ ایمان تک پہنچنے میں ان کی دستگیری کی جائے۔

نیز اسلام کی رو سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظریہ ایک ذمہ دار اور امینِ محافظ کی مانند ہے، جس کا کام اسلامی معاشرے میں انحرافات کی اصلاح، منکرات کا خاتمہ اور خوبیوں کی ترویج ہے۔[۱۰] رہا جہاد تو اسلامی معاشرہ کا مادّی دفاع اس کی ذمہ داری ہے اور اس کا فریضہ ہے کہ روئے زمین پر موجود کافر اور سرکش قوتوں سے مقابلہ کرے تاکہ اسلام کی دعوت کے لئے راہ ہموار کی جاسکے اور وہ انسانی معاشرہ کی حدود میں اپنے تاریخی فرائض سے عہدہ برآ ہو۔[۱۱]

پس معلوم ہوا کہ سماجی و معاشرتی کاموں سے متعلق فکری اور عملی اصول و قواعد کا مختلف ہونا فقط سلیقہ اور ذوق کا اختلاف نہیں بلکہ عملی پالیسیوں میں اختلاف سے بھی عبارت ہے جن میں سے ہر ایک مختلف حدود، احکام و وظائف

اور نتائج کا حامل ہے۔ رہا نفاذ کا طریقہ تو اس کا تعین مختلف معاشروں کے مخصوص حالات و مسائل، مختلف علمی و ثقافتی کیفیات نیز لوگوں کے ذہنی و نفسیاتی اختلاف کے پیشِ نظر مختلف طریقوں سے ہوتا ہے۔ بنابریں معاشرے میں تبدیلی کا عمل شروع کرنے سے پہلے داعی و مبلغ کے لئے ضروری ہے کہ اپنے معاشرے کے خارجی حقائق کا جائزہ لے اور وہاں موجود مخصوص عقلی، فکری اور نفسیاتی حالات کو مدِّنظر رکھے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہر جگہ اس کا طریقہء عمل یکسانیت کا شکار ہو جائے۔ بلکہ ضروری ہے کہ اس کا طریقہء کار حالات و حقائق میں پائے جانے والے فرق کی مناسبت سے مختلف و متنوع ہو۔ کیونکہ واضح ہے کہ اس صورت میں دعوت و تبلیغ کامیاب نہیں ہو سکتی اگر مبلغ یا داعی عالم و جاہل کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے اور دونوں کے لئے ایک ہی اسلوب اپنائے۔ کیونکہ ان دونوں کا طرزِ فکر و ادراک ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ؎۱۲

بنا برایں کہیں دعوت کی مصلحت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ شجاعانہ اور انقلابی روش اختیار کی جائے اور کہیں حسبِ حال نرم اور سنجیدہ پالیسی اپنائی جائے۔ نیز تبلیغی حکمتِ عملی کے تقاضوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے کبھی تو مخاطب کو کسی چیز کی تمام تفاصیل سے آگاہ کرنا چاہئے اور کبھی محض اس کا اجمال بیان کرنا ہی کافی ہوتا ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کوئی معاشرہ محض جزوی اصلاح کا طالب ہو اور کسی اور معاشرہ میں بنیادی انقلاب اور مکمل دگرگونی ضروری ہو۔ دعوت و تبلیغ کے موقع پر مختلف اسلوب و روش اختیار کرنے کے اصول کی بنیاد قرآنِ کریم کی یہ آیت فراہم کرتی ہے۔

"ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ

وجادلهم بالتی هی احسن"۔ ۱۳

"آپ ان کو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ دعوت دیں اور ان سے اس طریقے سے بحث کریں جو بہترین طریقہ ہے۔"

اس آیت میں مذکور لفظ حکمت کا مفہوم ہمارے مذکورہ مطلب کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یعنی انفرادی و اجتماعی حالات و مسائل کے اختلاف کے مطابق مختلف و متنوع طریقہ اور حکمتِ عملی اختیار کرنا۔

(۳)

مذکورہ حکمتِ عملی

اور ائمہؑ کی اصلاحی جدوجہد میں ہم آہنگی وارتباط

گزشتہ حقائق کی بنیاد پر ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ائمہ معصومینؑ کس حد تک مذکورہ بالا حکمتِ عملی پر عملدرآمد میں کامیاب ہوئے۔ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ائمہؑ ہمارے اذہان میں شریعتِ مقدسہ کے اصولوں اور تقاضوں کی تفصیلی، حقیقی اور زندہ تصویر پیش کرتے ہیں۔ شریعتِ اسلامی کے دائمی اصولوں اور ائمہ اہلِ بیتؑ کی عملی زندگی میں مطابقت کو قرآن و حدیث نے مختلف الفاظ میں ہمارے لئے بیان کیا ہے۔ کبھی تو ان کو "امان الامۃ" ★۔ کبھی "باب

★ حاکم نے مستدرک میں ابنِ عباس سے روایت کی ہے "اھل بیتی امان لامتی من الاختلاف فی الدین" (ص ۱۴۹۔ ج ۳) یعنی میرے اہلِ بیتؑ میری امت کے لئے دین میں اختلاف سے بچنے کی پناہ گاہ ہیں۔

حطة"★۔ نیز کبھی ہر پلیدی سے پاک و طاہر اور آیہ "انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس ------ ۱۴" کا مصداق قرار دیا ہے۔ کہیں ان کے بارے میں یوں اشارہ ہوا کہ "میرے اہلِ بیتؑ کی مثال کشتئ نوح کی سی ہے جو اس میں سوار ہوا نجات پا گیا ۱۵۔ اور جس نے اس کو چھوڑا غرق اور تباہ ہو گیا۔"

اس کے علاوہ ان معصومینؑ کے بارے میں بے شمار آیات و روایات موجود ہیں۔

اب جب یہ ثابت ہوا کہ ائمہ علیہم السلام اسلامی تعلیمات کی زندہ تصویر پیش کرتے ہیں تو یہ امر ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ معاشرتی زندگی میں انفرادی و اجتماعی حالات و کیفیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حکمتِ قرآنی کے عین مطابق ٹھوس اسلامی اصولوں کا عملی نمونہ پیش کریں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے ہی اس بات کی طرف اشارہ کیا۔ البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ ہم ائمہؑ کو عقیدہ و مسلک کے حوالے سے دیکھیں۔ رہا عملی اور تاریخی نقطہ نظر سے تو مسئلہ اور بھی واضح ہو جاتا ہے کیونکہ ائمہؑ کی عملی روش کے گہرے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی انقلاب آفرین اصلاحی جدوجہد دو اصولوں پر استوار تھی۔

پہلا اصول یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات و اصولوں کی ہو بہو پیروی کی جائے اور کسی مسئلے میں بھی افراط و تفریط نہ ہونے پائے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ امت کے درمیان موجود سیاسی، معاشرتی و فکری

★ طبرانی نے نقل کیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "بے شک (تمہارے درمیان) میرے اہلِ بیتؑ کی مثال بنی اسرائیل کے بابِ حطہ کی سی ہے۔ جو اس میں داخل ہوا بخشا گیا۔"

ماحول اور حالات کو مدِ نظر رکھ کر ایسا مثالی طریقہ کار اپنایا جائے جو اسلام اور امتِ مسلمہ دونوں کے مفادات کا ضامن ہو۔ اسلام کے اعلیٰ مصالح کے منافی نہ ہو اور حکومتِ وقت کی سیاست کے آگے سرِ تسلیم خم بھی نہ ہوں۔

مسلکِ امامت سے سرچشمہ لینے والے یہ دونوں اصول باہم دوش بدوش چلتے ہیں۔ بنا برایں مکتب سے مو بمو تمسک اس طرح ہو کہ اس کے ساتھ ساتھ مثبت عمل بھی انجام دیا جائے اور یہ مثبت عمل ان فکری، نفسیاتی اور سماجی مسائل کی شکل و حدود کو معین کرے جن کے ساتھ انسان زندگی بسر کر رہا ہے۔

یہاں ہم ائمہ طاہرینؑ کی پاکیزہ تاریخ و سیرت سے ایک نمونہ پیش کرتے ہیں۔

امتِ مسلمہ نے ایک طویل عرصہ انحرافات کے سائے تلے گزارا۔ اس دوران ایسے منحرف لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوئی جو امت کے انتظامی اور قانونی امور کو چلانے کے سلسلہ میں نااہل تھے۔ انہوں نے بیت المال کی تقسیم میں عدل و مساوات کی بجائے امتیازی سلوک کا راستہ اختیار کیا نیز اسلامی تقویٰ کی بجائے قومیت اور قبیلہ پرستی کو عزت و تکریم کا معیار بنایا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی نصوص اور قوانین سے کھیلنا ایک معمول بن گیا۔

خلاصہ یہ کہ انحرافات کا یہ دور گزرنے کے بعد امام علیؑ نے امت کے شدید اصرار اور دباؤ کی بناء پر متعدد مشکلات و مسائل اور پیچیدگیوں سے بھرپور اسلامی معاشرے کے سیاسی و اجتماعی امور کی باگ ڈور سنبھالی۔ آپؑ اس کام کی اہمیت اور حقیقت کو بخوبی جانتے تھے۔ اسی لئے آپ نے ان لوگوں سے (جو آپؑ پر حکومت قبول کرنے کے لئے زبردست دباؤ ڈال رہے تھے) خطاب کرتے ہوئے

فرمایا۔

"مجھے چھوڑ دو اور (اس خلافت کے لئے) میرے علاوہ کسی اور کو ڈھونڈ لو۔ ہمارے سامنے ایک ایسا معاملہ ہے جس کے کئی رنگ ہیں۔ جسے نہ دل برداشت کرسکتے ہیں اور نہ عقلیں اسے مان سکتی ہیں۔ (بتحقیق دیکھو! افقِ عالم پر گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں، راستہ پہچاننے میں نہیں آتا۔ ۱۶"

لیکن اس کے باوجود امت کا اصرار اور دباؤ بڑھتا چلا گیا کیونکہ ان کو مکتبِ اسلام کے منافی افکار و اعمال کے کنٹرول کرسکنے میں آپؑ کی صلاحیتوں کا اندازہ تھا۔ اور وہ جانتے تھے کہ آپؑ تمام امور کا احاطہ رکھتے ہیں اور مکتب سے متعلق تمام تناقض و تباین کو جانتے ہیں۔ بالآخر امامؑ کے پاس ان کا مطالبہ قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ البتہ آپؑ نے اپنی شرائط بھی پیش کردیں اور ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اگر میں تمہاری اس خواہش کو مان لوں، تو تمہیں اس راستے پر لے چلوں گا جو میرے علم میں ہے اور اس کے متعلق کسی کہنے والے کی بات اور کسی ملامت کرنے والے کی سرزنش پر کان نہ دھروں گا" ۱۷۔

اس کے بعد لوگوں نے دل و جان سے آپؑ کی بیعت کی اور آپؑ نے امت کی قیادت کی تاریخ ساز ذمہ داریاں سنبھال لیں اور اپنے مشن کی ذمہ داریوں کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ یعنی مکتبِ وحی کے تقاضوں کو اپنا اصلی مقصد قرار دے کر اپنے اصلاحی و انقلابی مشن کی تکمیل کے لئے جدوجہد شروع کردی۔ تاکہ لوگوں کی دنیا کو اس کے مطابق ڈھالیں اور امت کے مخصوص حالات و مسائل

کو مدِ نظر رکھ کر اپنی پالیسی پر عملدر آمد کریں۔

اسی بات کے پیشِ نظر امامؑ نے ٹھوس اقدامات کیے۔ اقتصادی میدان میں آپؑ نے بیت المال کی تقسیم میں مساوات کے اصول کو عملاً دوبارہ جاری کیا اور ان بے شمار اموال کی واپسی کا حکم صادر فرمایا جنہیں حضرت عثمان نے بغیر کسی جواز کے اپنے خواص میں تقسیم کیا تھا۔ سیاسی میدان میں آپؑ نے تمام ایسے والیوں اور اہلکاروں کو ہٹانے کا فیصلہ کیا جو تقویٰ اور عملی تجربہ و معلومات کے لحاظ سے حکومت چلانے کی اہلیت نہ رکھتے تھے۔ البتہ آپؑ کے اس عادلانہ اور اصلاحی عمل کا ان گروہوں کی جانب سے (جو بیت المال کی تقسیم میں امتیازی سلوک اور مراعات حاصل کرنے کے عادی ہو چکے تھے) شدید ردِّ عمل ہوا۔ کیونکہ انہوں نے اندازہ لگالیا کہ اسلام کی حقیقی سیاست کے نفاذ کی وجہ سے ان کے مفادات خطرے میں ہیں اور اس کی روک تھام کے لئے فوری اقدام کی ضرورت ہے۔ یوں طلحہ و زبیر نے بیعت توڑدی اور بصرہ کو اپنی باغیانہ سرگرمیوں کا مرکز بنالیا۔ ام المومنین عائشہ ان کی پشت پناہی اور قیادت کررہی تھیں۔ دوسری طرف معاویہ ابنِ ابو سفیان اموی (جو حضرت عمر کے زمانے سے شام کا حاکم چلا آرہا تھا) نے کسی بھی غیر متوقع حادثے کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنا لاؤ لشکر جمع کرر کھا تھا۔

ادھر اسلام کی حکیمانہ حکمتِ عملی پر عملدر آمد کے لئے امامؑ حالاتِ زمانہ اور اپنی حکومت کو درپیش مشکلات کا جائزہ لینے پر مجبور ہوئے۔ اور اس اٹل فیصلے پر پہنچے کہ پہلے مرحلے میں اندرونی شورش اور افتراق کا قلع قمع کیا جائے۔ (جس کی قیادت طلحہ و زبیر اور ام المومنین عائشہ کے ہاتھوں میں تھی) اور

دوسرے مرحلے میں شام کی انحرافی تحریک سے نمٹا جائے۔

یوں آپؑ نے پہلے اندرونی دشمنوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تاکہ اندرونی محاذ پر اتحاد برقرار ہو۔ نتیجہ آپؑ کے دلخواہ نکلا اور آپؑ کو شام کی منحرف اور گمراہ کن شورش کا مقابلہ کرنے کے لئے موقع نصیب ہوا۔ اگرچہ آپؑ کو اس فتنے کے دبانے میں اس طرح کامیابی حاصل نہیں ہوئی جس طرح داخلی فتنے کو دبانے میں حاصل ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود آپؑ نے اپنی حکمتِ عملی کے ذریعے اسلام کے پرچم تلے جینے والوں کے لئے خالص اور درخشاں مثالیں قائم کردیں۔ ان میں سب سے روشن مثال آپؑ کا زمانے کی غلط سیاست کے آگے پرچمِ اسلام کو خم نہ ہونے دینا، اپنی اسلامی حیثیت اور موقف پر سختی سے قائم رہ کر ہر قیمت پر اس کے منافی اغراض کے سامنے ڈٹے رہنا اور عملی سیاست میں اہم کو مہم پر ترجیح دینا (یعنی زیادہ اہمیت کے حامل امور کو نسبتاً کم اہمیت کے حامل امور پر ترجیح دینا) ہے۔

دوسری مثال امام جعفر صادقؑ کی اصلاحی جدوجہد اور تحریک ہے۔ آپؑ سے پہلے کے ائمہؑ کی نسبت آپؑ کے دور میں سیاسی حالات میں بنیادی تبدیلی آئی جس کی بدولت آپؑ کو ایک ایسی مخصوص پالیسی اپنانے کا موقع ملا جو گزشتہ اماموں کی روش سے مختلف تھی۔ کیونکہ آپؑ کے دور میں حکومت تبدیلی کے مراحل سے گزر رہی تھی اور بنی امیہ کے ہاتھوں سے نکل کر بنی عباس کے قبضے میں جارہی تھی۔

فکری نقطہ نظر سے بھی آپؑ کا عہد زندیقوں اور غالیوں کی کھلم کھلا نظریاتی سرگرمیوں کا دور تھا۔ نیز فقہی میدان میں بھی "اہلِ رائے" کا ظہور ہوا جس کی

وجہ سے شریعتِ مقدسہ کی بنیادی تعلیمات کو زک پہنچی۔ رہی امتِ مسلمہ تو اس زمانے میں مسلمانوں کا ضمیر جمود و غفلت کی بلندیوں کو چھونے لگا تھا۔

مذکورہ اور ان کے علاوہ بعض دیگر امور امام جعفر صادقؑ کے دور کے خاص حالات تھے۔ ان حالات میں اصلاحی عمل اور ان وسائل کی ماہیت واضح ہو جاتی ہے جن کو (مذکورہ حالات میں) امام صادقؑ کو ایک ایسے طریقے سے بروئے کار لانا تھا کہ مکتبِ رسولؐ ہر قسم کی سودا بازی اور افراط و تفریط سے محفوظ رہے۔ یوں امام صادقؑ نے درجِ ذیل متوازن اور مناسب طریقہء کار اپنایا۔

- پوری امت کی بیداری کے لئے، ایسی جدوجہد تاکہ منظم اور دائمی طور پر امت اور آگاہی میں چولی دامن کا ساتھ رہے۔
- ایک ایسے مدرسے کا قیام جو حقیقی اسلامی افکار کو پوری امت تک پہنچا سکے اور اس میں امت کی فکری قیادت کے لئے فقہاء، راویوں اور محدثین کی تربیت کی جائے۔
- ان باطل اور الحادی نظریات کا مقابلہ کرنا جو زندیقوں، جعلی حدیث گھڑنے والوں اور اسی قسم کے دیگر عوامل کے ذریعے پھیل رہے تھے۔

۱۸۔

امامؑ کو ان مقاصد میں زبردست کامیابیاں حاصل ہوئیں جن کی زندہ مثال اولاً وہ بے شمار علماء ہیں جو آپؑ کے مدرسے میں تربیت پا کر نکلے۔ ثانیاً وہ فکری جنگ ہے جو آپؑ نے زندیقوں اور اہل الرائے کے ساتھ لڑی۔ نیز وہ علمی مباحثے ہیں جو ان کے اور آپؑ کے درمیان پیش آئے۔

اس کے بعد جب حکومت کی تبدیلی کا عمل مکمل ہو گیا اور عباسیوں کی

حکومت کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں۔ بنی عباس نے مشاہدہ کرلیا کہ امام صادقؑ اور آپؑ کی وسیع سرگرمیاں ان کے پورے وجود کے لئے عظیم خطرہ ہیں تو خلفاء بنی عباس نے اپنی پوری توجہ آپؑ کی طرف مبذول کردی۔ اور امام صادقؑ اور آپؑ کے پیروکاروں کو قسم قسم کی مصیبتوں اور تکالیف سے دوچار ہونا پڑا۔ نتیجہ کے طور پر امامؑ کو ان جدید حالات کی روشنی میں مزید نرم پالیسی اختیار کرنی پڑی تاکہ حکومتِ وقت کے ساتھ کسی بڑے ٹکراؤ سے (جو اسلام اور امتِ مسلمہ کے مفاد میں نہ ہو) بچا جاسکے۔ نیز یہ بات بھی آپؑ کے پیشِ نظر تھی کہ جس نظریاتی تحریک کا بیڑا آپؑ نے اٹھا رکھا تھا ابھی وہ اس مطلوبہ مرحلے تک نہیں پہنچی تھی جو حکومتِ وقت کے ساتھ کھلی جنگ لڑنے کے لئے کافی ہو۔ یوں آپؑ نے ایک جدید عملی روش اپنائی جس کا خلاصہ دو باتوں سے عبارت ہے۔

اولاً۔ خفیہ سرگرمیوں کا طریقہ اختیار کرنا (جسے اسلامی اصطلاح میں تقیہ کہتے ہیں) تاکہ امامؑ کی قیادت میں چلنے والی اسلامی تحریک کے لئے ایک منظم ہراول دستے کی تشکیل عمل میں آئے۔۱۹

ثانیاً۔ ان انقلابی تحریکوں کی حمایت کرنا جن کی قیادت آلِ علیؑ کررہے تھے۔ تاکہ لوگوں میں اسلامی روح اور انحرافات کا مقابلہ کرنے کے جذبے کو بیدار رکھا جائے۔ جس کی مثال حجاز و بصرہ میں محمد نفسِ ذکیہ اور ان کے بھائی کی تحریک ہے۔

امام صادقؑ کے اس اسلوب کو بے مثال کامیابی حاصل ہوئی۔ کیونکہ یہاں سے امتِ مسلمہ کے درمیان عملاً ایک مثالی اسلامی تحریک کی داغ بیل پڑی جس کی زندہ مثال وہ فقہاء، راویانِ حدیث اور شخصیات ہیں جن کو شریعتِ محمدیؐ اور

اسلام کے جاودانہ اصولوں کی حمایت کا شرف حاصل ہوا۔

ان نکات کی روشنی میں اجتماعی امور کے حوالے سے ائمہ معصومینؑ کی حکیمانہ حکمتِ عملی واضح ہوتی ہے۔ اگرچہ ہم نے فقط مذکورہ دو مثالوں پر اکتفا کیا ہے کیونکہ سماجی و اجتماعی امور میں طریقہ کار کے تنوع کے حوالے سے باقی ائمہؑ کی تبلیغی حکمتِ عملی اور انسانی زندگی میں پیش آنے والی تبدیلیوں کے عین مطابق کارکردگی کی کافی مثالیں کتاب ہذا میں بیان کی گئی ہیں۔

ائمہؑ کی عملی سیرت سے ہمیں جو سبق ملتا ہے وہ مندرجہ ذیل نکات میں پوشیدہ ہے۔

- رسول اللہؐ کا مشن اپنے گوناگوں فکری و عملی اصولوں کے ساتھ ساتھ ایک ٹھوس اور مستقل تہذیبی شناخت بھی رکھتا ہے جو لوگوں کی دنیوی سودے بازیوں اور تبدیلیوں سے متاثر نہیں ہوتا۔
- ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم اسلام کے عملی افکار اور پیغمبرؐ اور ائمہؑ کے اختیار کردہ طریقہ کار کے درمیان فرق کو سمجھیں۔ کیونکہ یہ تفریق بعض ایسے امور میں ہمارے لئے فکری اور عملی جمود کا شکار ہونے سے بچنے میں مددگار ہوگی جو ایک خاص وقت اور مخصوص حالات و کیفیات کے تحت بہترین طریقہ عمل رہ چکے ہوں۔ (کیونکہ ممکن ہے کہ بعد کے بدلے ہوئے حالات میں ان طریقوں پر عمل خلافِ مصلحت اور نامعقول ہو تاکہ روشِ کار میں تنوع کو اسلام کی بنیادی تعلیمات میں تبدیلی اور اختلاف پر محمول نہ کیا جائے۔ مترجم)
- عملی روش (جس کا اختیار کرنا ضروری ہے) فکری اور نفسیاتی

حالات کے پیشِ نظر۔ نیز امت کی اسلام سے وابستگی میں کمی یا زیادتی یا امت کی حکومتِ وقت سے دوری و نزدیکی کی مناسبت سے تغیر و تبدل کی طالب ہے۔

- ☆ لوگوں کی اجتماعی زندگی میں پیش آنے والے تحولات اور ان کو درپیش احتیاجات سے آگاہی کی ضرورت اور ایسے طریقہ کار کو اپنانا جو ان کے قلوب و اذہان کے حوالے سے زیادہ موثر ہو۔

کیونکہ عین ممکن ہے کہ ایک خاص معاشرے میں وعظ و ارشاد مفید و مناسب ہو۔ لیکن دوسرے معاشرے میں اسلامی تعلیمات کے مطابق سیاسی عمل مفید ہو۔ اسی طرح کسی جگہ دینی مدارس ثمر بخش ہوں لیکن دوسری جگہ یہی کام غیر مفید ہو۔

- ☆ ائمہ ؑ کی اصلاحی تحریک کے مختلف عملی مراحل سے رہنمائی حاصل کرنا اور اس سلسلے میں زمانے کی مشکلات اور وقت کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھنا۔
- ☆ اجتماعی کاموں میں اپنے تجربات کو کامل بنانے کے لئے دوسروں کے تجربات سے استفادہ کرنا خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔

ائمہ ؑ کی عملی روش کی وضاحت

اور اس پر بحث کے سلسلہ میں ہمارا طریقہ کار

ہم نے اس سے قبل عرض کیا کہ ائمہ ؑ کی زندگی مکتبِ رسالت کے استمرار کی ایک صورت تھی تاکہ تعمیرِ امت کے لئے قیادت کا سلسلہ جاری رہے۔ اس

حقیقت کی رو سے ان کا عمل پیغمبرؐ کے بعد اسلام کی حفاظت و حمایت کے کام کو عملی جامہ پہنانے کا ذریعہ ہے۔ رسولِ اکرمؐ نے ایک مختصر مدت میں اپنی انقلابی اور اصلاحی کارروائی کے ذریعے حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیئے۔ اس کارروائی کا طویل سلسلہ آپؐ کی وفات کے بعد بھی جاری رکھنے کی ضرورت تھی۔ کیونکہ ایک ہمہ گیر تبدیلی اور انقلاب کبھی بھی اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے رونما نہیں ہو سکتا تھا۔ بلکہ تبدیلی کے عمل کا سلسلہ اسلام و جاہلیت کے درمیانی فاصلے کے تناسب سے وسیع بھی تھا اور طویل بھی۔ اسی لئے ائمہؑ کی جدوجہد اس سلسلے کی تکمیل اور پیغمبرِ خداؐ کے اہداف (جن کے لئے آپؐ نے بنفسِ نفیس جدوجہد کی تاکہ جاہلیت کے آثار مٹ جائیں) کے حصول اور آپؐ کے مشن اور دعوت کے تقاضوں کے مطابق جدید امت کی تعمیر کے لئے تھی۔

عنقریب ہم ان گوناگوں عملی اسالیب اور طریقوں پر بحث کریں گے جن کو ائمہؑ نے اپنایا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہر امامؑ کی زندگی اور تاریخ کے مربوط مطالعے کی ضرورت ہے۔ غیر مربوط اور (ہر امامؑ کے) الگ الگ مطالعے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ یعنی سارے ائمہؑ کا ان کے باہمی ارتباط کو مدِ نظر رکھ کر مطالعہ کرنا ہوگا۔ تاکہ ہم ان کی زندگی کے مجموعی مطالعے سے مشترکہ مزاج، مشترکہ اہداف اور ہم آہنگی کو دریافت کریں۔

خلاصہ یہ کہ ائمہؑ نے مجموعی طور پر جو کردار ادا کیا اس سے اس طرح آگاہ ہونا ہوگا کہ سارے ائمہؑ ایک ہی سلسلے کی کڑیاں نظر آئیں۔ جن میں سے ہر کڑی دوسری کڑی کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہو۔ نہ یہ کہ ہر امامؑ کا جزئی اور غیر مربوط مطالعہ کیا جائے کہ نتیجہ کے طور پر ان کی روش میں تضاد نظر آئے اور

ان کے افعال میں تناقض۔

جب ہم ائمہؑ کی مشترکہ خصوصیات، ذمہ داریوں اور کردار پر نظر ڈالتے ہیں تو ہر قسم کے تضادات اور تناقضات ختم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس زاویے سے دیکھیں تو سب کے سب ایک ہی حقیقت کی مختلف صورتیں دکھائی دیں گے۔ اور ان کے درمیان سلیقہ کا اختلاف ہر امامؑ کے زمانے کے مخصوص اور مختلف حالات اور تقاضوں کا لازمہ قرار پائے گا۔

ہمارے عقیدے کی رو سے تمام ائمہؑ کے درمیان ایک مشترکہ، مربوط اور ہم آہنگ کردار کا وجود فقط ایک مفروضہ نہیں جسے ہم تاریخ سے ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہوں بلکہ یہ امامت کے نظریے اور اس پر عقیدے کا لازمہ ہے۔ کیونکہ سارے ائمہؑ کی امامت ذمہ داریوں اور شرائط کے لحاظ سے مساوی ہے۔ بنا برایں سب کا ہدف اور کردار بھی یکساں ہونا چاہئے۔ اگرچہ ماحول اور حالات کے اختلاف کی بناء پر ظاہری صورتوں اور طریقوں میں اختلاف ہی کیوں نہ ہو۔٢٠

بنا برایں اگر ائمہؑ کے درمیان کہیں طریقہ کار میں اختلاف نظر آتا ہے تو یہ ان کے مزاجوں یا اہداف میں اختلاف کی وجہ سے نہیں اور نہ ہی ذاتی مفادات اور ہوا و ہوس کی بناء پر ہے بلکہ یہ تو زمان و مکان اور حالات کی مناسبت سے حکیمانہ، ممکنہ، معقول اور ثمر بخش طرزِ عمل اختیار کرنے کا لازمہ ہے۔ مثلاً اگر ہم ائمہؑ کی تبلیغ و دعوت کی روش کا مطالعہ کریں (جو انہوں نے کسی دور میں اختیار کی ہو) تو معلوم ہو گا کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں اور حالات کے مطابق ثمر بخش اور مفید تھی۔ لیکن عین ممکن ہے کہ وہی عمل کسی اور ماحول میں بے فائدہ

اور غیر معقول ہو کیونکہ وہاں کے حالات و شرائط کسی اور طریقۂ عمل اور حکمتِ عملی کے متقاضی ہوں۔

ان حقائق کے پیشِ نظر اسلامی نظامِ زندگی میں سارے ائمہؑ کے کردار کے جامع اور مربوط مطالعے کی ضرورت واضح ہوتی ہے۔ جس سے اسلامی نظامِ حیات میں ان کی حقیقی اور عظیم حیثیت و کردار کا پتہ چلے نیز مختلف اماموں کے عمل کے مختلف طریقوں (جو کہ زمان و مکان کے اختلاف کی مناسبت سے مختلف ہوتے ہیں) کے درمیان ہم آہنگی اور ارتباط کا علم ہو۔

تاریخِ ائمہؑ کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ فقط ان تاریخی نصوص اور حوالوں سے استفادہ کریں جو مستند اور صحیح ہوں تاکہ ان کے ذریعے ائمہؑ کے افعال اور ان تاریخی مراحل سے آگاہ ہو سکیں جن سے وہ گزرے۔ اور ایسا نہ ہو کہ ہم تاریخ کو عقیدے کے تابع بنائیں اور مذہبی عقیدے کی عینک لگا کر تاریخِ ائمہؑ کی تاویل کریں یا جوشِ عقیدہ میں ان کے اس مخصوص طریقۂ کار کو جس پر انہوں نے عمل کیا ہر قسم کے زمان و مکان میں دعوت و تبلیغ کے لئے بلا تفریق معقول روش قرار دیں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ ان کی تاریخ سے استفادہ کی بجائے ضرر کا سبب ہو گا۔

بنا برایں ہم ائمۂ معصومین علیہم السلام کی جدوجہد کی تاریخ کو سمجھنے کے لئے مستند اور صحیح تاریخ کو دلیل بنائیں گے اور اسی سے استفادہ و استدلال کریں گے۔

مصادر و ماخذ

۱۔ ماخوذ از التاریخ العربی صفحہ ۶۳-۶۹
۲۔ الامامہ فی التشریع الاسلامی محمد مہدی الاصفی۔ ص ۳۳
(اردو ترجمہ "فلسفۂ امامت" کے نام سے دستیاب ہے۔)
۳۔ بحث حول الولایہ از محمد باقر الصدر (اردو ترجمہ "شیعیت کا آغاز کب اور کیسے" کے نام سے دستیاب ہے۔)
۴۔ بحث حول الولایہ از محمد باقر الصدر
۵۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ نمبر ۱۹۰
۶۔ المراجعات از عبدالحسین شرف الدین۔ ص ۱۵۱ (اردو ترجمہ "مذہبِ اہلِ بیتؑ" کے نام سے دستیاب ہے۔)
۷۔ محمد مہدی آصفی۔ مقدمہ کتاب الاجتہاد والتقلید از تالیف میرزا غلام رضا۔ ص ۸
۸۔ سابقہ کتاب۔ صفحہ ۱۹
۹۔ سابقہ کتاب۔ صفحہ ۱۹
۱۰۔ اسلوب الدعوۃ فی القرآن از محمد حسین فضل اللہ۔ طبع دوم۔ ص ۱۱۸
۱۱۔ اسلوب الدعوۃ فی القرآن از محمد حسین فضل اللہ۔ طبع دوم۔ ص ۱۷
۱۲۔ اسلوب الدعوۃ فی القرآن
۱۳۔ سورہ نحل ۱۶۔ آیہ نمبر ۱۲۵
۱۴۔ سورہ احزاب ۳۳۔ آیت ۳۳
۱۵۔ مستدرکِ حاکم۔ ج ۳۔ ص ۱۵۱
۱۶۔ شرح نہج البلاغہ از محمد عبدہ۔ طبع دارِ اندلس ۱۹۶۳ء۔ خطبہ نمبر ۹۰
۱۷۔ شرح نہج البلاغہ از محمد عبدہ۔ طبع دار اندلس ۱۹۶۳ء۔ ص ۱۶۹۔ خطبہ نمبر ۹۰
۱۸۔ کتاب ہمارا پیام میں سے مقالہ "ہمارا پیام اور عہدِ امام جعفر صادقؑ"
۱۹۔ بحث حول الولایہ از محمد باقر الصدر الشہید۔ ص ۴۵
۲۰۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ الشیعہ از الامین۔ ج ۲۔ ص ۹۴

پہلا حصہ

حیاتِ پیغمبرؐ میں

دعوتِ اسلامی کے مراحل

حیاتِ پیغمبرؐ میں

دعوتِ اسلامی کے مراحل

پیغمبرِ اسلامؐ کی بعثت سے لے کر آپؐ کی وصال تک کے عرصہ میں دعوتِ اسلامی کا کام تین مراحل سے گزرا۔

پہلا مرحلہ

اس مرحلے میں آپؐ کی دعوت خفیہ تھی۔ اور فقط اسی شخص کو دعوت سے آگاہ کرتے تھے جس کے بارے میں آپؐ کو اطمینان ہوتا تھا کہ وہ آپؐ کی بات قبول کرلے گا، یا ایمان لے آئے گا۔

اس مرحلے کا آغاز غارِ "حرا" میں آپؐ پر پہلی وحی کے نزول کے ساتھ ہوا۔ ابنِ ہشام کہتا ہے۔

"آپؐ لوگوں کو خفیہ طریقے سے اسلام کی دعوت دیتے تھے تاکہ کہیں قریش (جو شرک و بت پرستی میں متعصب تھے) کو اچانک دھچکا نہ لگے۔ اسی لئے آپؐ عمومی محافل میں قریش کے سامنے دعوت کا اظہار نہ کرتے تھے۔ اور آپؐ صرف ایسے افراد کو دعوت دیتے تھے جن کے

اِنسانِ کامِل

اُستاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

دوسرا مرحلہ

اس مرحلے میں نبی اکرمؐ نے فرمانِ الٰہی "فاصدع بما تومروا عرض عن المشرکین--" پر لبیک کہا اور اس حکم پر عمل در آمد کیا۔ پہلے آپؐ نے اپنے اعزاء و اقارب اور اہلِ خاندان کو بلایا۔ ان کو دعوتِ اسلام دی اور خدا کا پیغام سناتے ہوئے فرمایا۔ اے بنی کعب بن لوی! اپنی جانوں کو عذابِ جہنم سے بچاؤ۔ اے بنی مرہ بن کعب! اپنی جانوں کو عذابِ جہنم سے بچاؤ' اے عبدِ شمس کی اولاد! اپنی جانوں کو عذابِ الٰہی سے بچاؤ۔ اے عبدِ مناف کی اولاد! عذابِ جہنم سے بچو' اے عبدالمطلب کی اولاد اپنی جانوں کو آگ سے بچاؤ۔ اے فاطمہ! اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ۔ کیونکہ میں اس سلسلہ میں بارگاہِ خدا میں تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔ میں فقط اس صلہ رحمی کو جو ہمارے تمہارے درمیان ہے نبھا سکتا ہوں اور بس ؂۴۔

پھر آپؐ کوہِ صفا پر چڑھے اور یوں پکارا اے بنی فہر' اے بنی عدی------ یہاں تک کہ لوگ جمع ہوئے اور جو نہ آسکے انہوں نے صورتِ حال کی خبر لانے کے لئے کسی دوسرے کو بھیجا۔ اس کے بعد رسولِ خداؐ نے فرمایا۔

"اے لوگو! اگر میں تمہیں خبر دوں کہ اس وادی میں ایک لشکر ہے۔ جو تمہارے اوپر حملہ آور ہونا چاہتا ہے تو کیا تم میری بات کی تصدیق کروگے۔

حاضرین نے جواب دیا "ہم نے آپؐ سے آج تک کوئی جھوٹ نہیں سنا۔"

آپؐ نے فرمایا : تو پھر میں تمہیں عذابِ شدید سے ڈراتا ہوں۔

اس وقت ابولہب نے کہا "تبا لک سائر الیوم الھذا جمعتنا" "وائے ہو تم پر کیا فقط اتنی سی بات کے لئے ہمیں جمع کیا تھا؟"

اور اسی کے جواب میں آیت "تبت یدا ابی لھب و تب" (ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ ہلاک ہو جائے۔" سورہ لہب ۱۱۱۔ آیت ۱) نازل ہوئی"۔۵۔

قریش کی طرف سے آپؐ کی اس اعلانیہ دعوت کا ردِّ عمل یہ ہوا کہ انہوں نے آپؐ سے منہ موڑ لیا اور آپؐ کی دعوت کے مخالف ہو گئے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کو اسی بناء پر قسم قسم کی سختیاں، مظالم اور اذیتیں برداشت کرنا پڑیں اور مسلسل مظالم سہتے رہے---------آخر کار نصرتِ الٰہی کی راہیں کھل گئیں تاکہ رضائے الٰہی حاصل کر سکیں۔ اور عقیدۂ توحید کی خون سے آبیاری کر سکیں۔

رسولِ اکرمؐ کو اس قدر آزار پہنچائے گئے کہ آپؐ نے فرمایا۔ "ما اوذی نبی مثل ما اوذیت" "یعنی کسی نبی کو اتنا نہیں ستایا گیا جتنا مجھے۔"

نیز اسی سلسلے میں عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ جب نبی کریمؐ کعبہ میں مشغولِ نماز تھے تو عقبہ بن ابی محیط آیا اور اس نے اپنا کپڑا آپؐ کی گردنِ مبارک میں ڈال دیا اور سختی سے آپؐ کا گلا گھونٹنا شروع کیا۔ اتنے میں حضرت ابوبکر نے آکر اس شخص کو کاندھوں سے پکڑ کر دور ہٹایا۔ اور کہا کہ کیا تم ایک شخص کو فقط اس جرم میں قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب خدا ہے۔۶۔

طبری اور ابنِ اسحاق نے نقل کیا ہے کہ ایک کافر نے ہاتھ میں مٹی اٹھا کر آپؐ کے اوپر اس وقت پھینکی جب آپؐ مکہ کی ایک گلی سے گزر رہے تھے۔ آپ

اس حالت میں گھر لوٹ آئے کہ آپؐ کا سرِ اقدس خاک آلود تھا۔ اس وقت آپ کی ایک بیٹی آپؐ کا سر دھوتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی اور آپؐ فرما رہے تھے

"اے بیٹی مت رو کیونکہ تیرے باپ کا محافظ خدا ہے۔۷"

رہے آپؐ کے اصحاب تو ان میں سے بھی ہر ایک نے قسم قسم کے مصائب کا گھونٹ پیا۔ خباب بن ارت سے روایت ہے کہ میں اس حالت میں نبیؐ کی خدمت میں پہنچا کہ آپؐ کو مشرکین سے کوئی تکلیف پہنچی تھی۔ میں نے عرض کیا اے رسول اللہؐ کیا ہمارے حق میں خدا سے دعائیں فرمائیں گے؟ یہ سن کر آپؐ بیٹھ گئے جب کہ آپؐ کا چہرہ سرخ تھا۔ فرمایا

"تم سے پہلے والوں کو لوہے کی کنگھیوں سے اتنا چھیلتے تھے کہ ان کی فقط ہڈیاں رہ جاتی تھیں۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے دین سے دستبردار نہیں ہوتے تھے۔ اور خدا اس سلسلہ کو اس وقت تک جاری رکھے گا جب تک کہ اس قدر امن اور عدالت قائم ہو کہ اگر کوئی شخص "صنعا" سے "حضر موت" تک کا سفر کرے تو اسے سوائے خوفِ خدا کے کوئی خوف نہ ہو"۸۔

طائف کا سفر

جب رسول اللہؐ نے یہ محسوس کیا کہ اب مکہ میں آپؐ کی دعوت جمود کا شکار ہو رہی ہے اور دہشت گردی و ایذا رسانی کے عروج کی وجہ سے لوگوں کا جوق در جوق دائرۂ اسلام میں داخل ہونا رک گیا ہے اور مسلسل دعوت کا سلسلہ اب تقریباً متوقف ہو چکا ہے۔ نیز یہ جمود دعوت و تبلیغ کے لئے براہِ راست خطرہ ہے

لہٰذا ان وجوہات کی بناء پر آپؐ نے ارادہ فرمایا کہ تبلیغ و دعوت کے لئے طائف جائیں گے اور اس سلسلے میں بنی ثقیف سے مدد طلب کریں گے۔

رسولِ مقبولؐ کو یہ امید تھی کہ طائف کے لوگ آپؐ کے آسمانی پیغام کو قبول کریں گے اور آپؐ کے مشن کی تکمیل میں آپؐ کے نئے مددگار اور ساتھی ثابت ہوں گے۔ اور ان کی مدد سے آپؐ طائف کو تبلیغِ اسلام کا نیا مرکز اور ہیڈ کوارٹر بنائیں گے۔ کیونکہ آپؐ نے دیکھ لیا تھا کہ مکہ اب تبلیغِ رسالت کے لئے مناسب نہیں رہا۔ خاص کر خوف و دہشت اور ایذا رسانی کی وجہ سے تحریک کی رفتار ست پڑ جانے کے بعد۔

جب رسول اللہؐ طائف پہنچے تو آپؐ نے وہاں کے بااثر روساء کو ان کی اہمیت اور ان کے حامیوں کی کثرت کے پیشِ نظر اپنی طرف مائل کرنے کا ارادہ فرمایا۔ آپؐ ثقیف کے بعض روساء کے پاس تشریف لے گئے۔ ان کے ساتھ گفتگو فرمائی اور ان کو راہِ خدا کی طرف دعوت دی۔ لیکن ان لوگوں نے آپؐ کی دعوت بڑی سختی سے ٹھکرا دی اور آپؐ کے ساتھ خلافِ توقع سخت اور بُرا سلوک کیا۔ آپؐ کو بُرا بھلا کہا۔ لہٰذا آپؐ وہاں سے واپس چلے آئے اور طائف والوں سے درخواست کی کہ آپؐ کی وہاں آمد کی خبر قریش کو نہ دیں۔ لیکن انہوں نے آپؐ کی خواہش کا بھی احترام نہ کیا۔ اس پر طرّہ یہ کہ طائف کے چھوکروں، اوباشوں اور غلاموں کو اکسایا تاکہ وہ آپؐ کو بُرا بھلا کہیں اور آپؐ پر آوازیں کسیں۔ انہوں نے آپؐ کو پتھر مارے یہاں تک کہ آپؐ کے دونوں پاؤں لہولہان ہوگئے اور آپؐ کا سرِ مبارک کئی جگہوں سے پھٹ گیا۔۹۔ پس آپؐ نے اپنی شکایت اپنے رب کے سامنے پیش کی اور آسمان کی طرف سر اٹھا کر یہ دعا کی۔

"خداوندا میں تجھ سے اپنی کمزوری' بے چارگی اور بے بضاعتی کی شکایت کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو مظلوموں اور کمزوروں کا رب ہے اور میرا بھی۔ پروردگارا! مجھے کس کے رحم و کرم پر چھوڑے گا؟ کیا ایسے شخص کے رحم و کرم پر جس نے مجھ سے دشمنی کی اور مجھ پر حملہ کیا؟ اگر تو مجھ سے راضی ہو تو مجھے کسی دوسرے کی پروا نہیں کیونکہ تیرے کرم کا دروازہ نہایت وسیع ہے۔ میں اپنے اوپر تیرے عذاب اور غضب کے نزول سے پناہ مانگتا ہوں۔ خدایا! تیرے اس نور کے صدقے (جس سے تاریکیوں کو روشنی ملی اور جس سے دنیا و آخرت کا نظام سنور گیا) تیری بارگاہ سے پناہ مانگتا ہوں تیری رضا کے حصول تک۔" "ولا حول ولا قوۃ الا بک"[۱۰]

اس کے بعد رسول اکرمؐ زید بن حارثہ کے ساتھ مکہ کی طرف تشریف لائے۔ زید نے عرض کیا۔ اے خدا کے رسولؐ کیسے مکہ والوں کے پاس جائیں گے جب کہ انہوں نے آپؐ کو نکال دیا ہے؟ فرمایا اے زید خدا اس امر میں ہمیں کشائش عطا فرمائے گا۔ بے شک خدا اپنے دین کا حامی اور اپنے نبی کو دشمن کے اوپر غلبہ عطا کرنے والا ہے۔ پھر آپؐ نے بنی خزاعہ کے ایک شخص کو مطعم بن عدی کے پاس اس فرمائش کے ساتھ بھیجا کہ آپؐ اس کی امان میں مکہ میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ مطعم نے قبول کیا اور آپؐ مکہ لوٹ آئے[۱۱]۔

مکہ واپسی کے بعد آنحضرتؐ نے سفرِ طائف کے تلخ تجربے' اہلِ طائف کے بُرے سلوک اور مکہ کی بجائے طائف کو مرکز بنانے میں ناکامی اور اس کے اسباب کا جائزہ لیا اور درجِ ذیل عملی نتائج حاصل کیے۔

☆ آپؐ کو معلوم ہوا کہ طائف آپؐ کی سرگرمیوں کا مرکز بننے کے قابل نہیں۔ کیونکہ ایک تو طائف والوں اور مکہ والوں میں گہرے تعلقات ہیں اور دوسرے یہ کہ جغرافیائی طور پر نزدیک بھی ہیں اور دونوں کے درمیان چالیس میل سے زیادہ فاصلہ نہیں۔ جس کی بناء پر طائف قریش کے اچانک حملوں کی زد میں ہے۔

☆ آپؐ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ بنفسِ نفیس اعداء کے نرغے میں رہ کر امرِ تبلیغ کی انجام دہی میں مصلحت نہیں۔ کیونکہ ان لوگوں نے اسی بناء پر آپؐ کا محاصرہ کیا۔ اسلام کی دعوت کو دشمنوں کی فتنہ گری سے نقصان پہنچا اور آپؐ کو اُن پر اثر انداز ہونے کے لئے بات کرنے کی بھی آزادی نہ ملی۔[۱۲]

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ رسولِ اکرمؐ حج کے موقع پر مختلف قافلوں کے درمیان اپنی جدوجہد دوبارہ شروع کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپؐ نے یثرب (مدینہ) کے چھ افراد سے ملاقات کی اور انہیں اپنی دعوت پیش کی اور وہ ایمان لے آئے اور اس بات کی قسم کھائی کہ مدینہ واپس جاکر اسلام کی راہ میں جدوجہد کریں گے۔

آپؐ کے ہاتھوں ان چھ افراد کا مسلمان ہونا تاریخِ اسلام میں اہم ترین تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ صرف ان چھ افراد سے آپؐ کا ملنا ایک اتفاقی بات نہ تھی بلکہ سوچی سمجھی اسکیم تھی۔ کیونکہ یہ ملاقات گویا ایک خفیہ میٹنگ تھی جس کے شرکاء کی تعداد عمداً کم رکھی گئی تھی۔ برخلاف دوسرے وفود کے جن کو آپؐ اعلانیہ دعوتِ اسلام دیتے تھے۔ اس ملاقات کے خفیہ رکھنے اور ملاقات

کے لئے ایامِ حج کے انتخاب کی اہم وجوہات تھیں جن سے چشم پوشی ممکن نہ تھی۔ ساتھ ساتھ طائف کے سفر کا دردناک اور سبق آموز تجربہ بھی پیشِ نظر تھا۔ چنانچہ آپؐ نے مرکزِ تبلیغ کے بارے میں نیا فیصلہ کیا اور یثرب (مدینہ) کا انتخاب کیا۔ کیونکہ مدینہ مکہ سے دو سو پچاس میل سے بھی زیادہ دور ہونے کی وجہ سے قریش کے اچانک اور پے درپے حملوں کی زد سے باہر تھا۔ ان دنوں یثرب (مدینہ) مجموعی طور پر آپؐ کی دعوت کا مرکز بننے کے لئے مناسب اور آمادہ تھا۔ کیونکہ وہاں کے لوگوں (اوس، خزرج اور یہودیوں) کے طولانی اور سابقہ جھگڑوں کی وجہ سے پورا علاقہ بٹ چکا تھا۔ اس بناء پر ایک تو وہ اسلامی لہر کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتے تھے اور دوسرے وہ ایک ایسی قیادت یا شخصیت کے متلاشی تھے جو ان کو آپس کے تعصبات اور دشمنیوں سے ہمیشہ کے لئے نجات دے۔ نیز مدینہ میں بنی نجار کے کچھ لوگ رشتے میں آپؐ کے ماموں لگتے تھے۔ اہلِ مدینہ بھی اس سے باخبر تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ آپؐ کے والدین کی قبریں بھی وہیں ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ مدینہ مادّی وسائل سے بھی مالا مال تھا اور مکہ و شام کے تجارتی راستے پر بھی اہلِ مدینہ کا تسلط تھا۔

سفرِ طائف کے برعکس اس مرتبہ رسول اللہؐ بذاتِ خود یثرب (مدینہ) تشریف نہیں لے گئے بلکہ تبلیغ و تعلیمِ اسلام کا کام خود اہلِ یثرب کے ذریعے لینے لگے اور یہ طریقہ حصولِ نتائج کے لحاظ سے زیادہ مناسب اور سریع ثابت ہوا۔ کیونکہ اہلِ مدینہ اپنے علاقے اور وہاں کے لوگوں کے حالات سے بہتر واقف تھے اور ان کا اثر بھی خود ان کے اعزاء و احباب پر نسبتاً زیادہ تھا اور ان پر کسی کو شک بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

رسولِ اکرمؐ ان چھ افراد اور ان کے ذریعے حاصل ہونے والے مددگاروں کے ذریعے سے ایک ایسی سازگار اور مناسب فضا قائم کرنا چاہتے تھے جو امرِ تبلیغ اور ابتدائی کاموں کے لئے مناسب ہو۔ جب دوسرے سال حج کا وقت آیا تو آپؐ نے مدینہ کے بارہ افراد سے ایک تنگ وادی (عقبہ) میں خفیہ ملاقات کی۔ جو عقبۂ اولیٰ کے نام سے مشہور ہوئی۔ ۱۳۔

اس ملاقات میں ان لوگوں نے اپنے ایمان اور تبلیغِ اسلام کے لئے اپنی آمادگی کا اعلان کیا اور جب وہ جانے لگے تو آپؐ نے ان کے ساتھ مصعب ابنِ عمیر (جو آپؐ کے لائق ترین اصحاب میں سے تھے) کو بھیجا تاکہ وہ مدینہ والوں کو اسلام اور احکامِ دین کی تعلیم دیں اور اہلِ مدینہ کے درمیان اس نئے دین کی ترویج کے لئے زیادہ فعال، منظّم اور سنجیدہ گروہ کی تشکیل عمل میں آئے۔ مصعب بن عمیر (جیساکہ معروف ہے) مکہ کے اوّلین مسلمانوں میں سے ہیں۔ دین شناسی اور مکہ میں قریش کی طرف سے ڈھائے جانے والے مصائب اور مظالم کو جھیلنے کے لحاظ سے ممتاز اور مشہور ہیں۔ خلاصہ یہ کہ آپؐ تنظیمی امور اور فعالیت کے مختلف گُر بخوبی جانتے تھے۔ ۱۴۔

اس گروہ کے ساتھ مصعب بن عمیر کا بحیثیت رہنما جانا اس بات کی ضمانت تھا کہ وہ منظّم رہیں گے اور یہ نئے مسلمان اپنے ایمان اور ترویجِ اسلام کے وعدے سے پھر نہ جائیں گے۔ خاص کر اس صورت میں جب کہ دو حجوں کے درمیان ایک پورے سال کا وقفہ ان کے عزم و ارادے کو کمزور کرنے کے لئے کافی تھا۔ کیونکہ ابھی ان کو کافی حد تک اسلامی تعلیم و تربیت حاصل نہیں ہوئی تھی اور انہوں نے اس نئے دین کا اس حد تک گہرا اور کامل مطالعہ نہیں کیا تھا

کہ وہ اونچے فہم و فراست کے ساتھ دوسروں کو قائل کرسکیں۔ اور واضح ہے کہ اگر منظّم ارتباط نہ رہے تو آخرکار کسی تنظیم کے لئے اس کا لازمی نتیجہ افتراق، پراگندگی، شکست اور خاتمے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

ہجرت یا نئے مرکز کی طرف منتقلی

مصعب ابنِ عمیر دوسرے حج کے موقع پر جب مکہ تشریف لائے تو آپؐ کے ساتھ مدینہ کے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد تھی۔ یہ لوگ اپنی قوم کے مشرک حاجیوں کے ساتھ اپنی حقیقت ظاہر کئے بغیر آئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصعب نے مکہ پہنچنے سے پہلے ہی رسولِ خداؐ اور مدینہ کے مسلمانوں کے درمیان ایامِ حج کے خاتمے پر ایک نشست کا پروگرام بنالیا تھا۔ جس سے پہلے مصعب نے آنحضرتؐ کو اپنی فعالیت، تبلیغ و دعوت کی کامیابی، مسلمانوں کی تعداد میں اضافے اور آپؐ کی تشریف آوری کے لئے مدینہ کے سازگار حالات کی اطلاع کردی تھی۔

محمد ابنِ اسحاق نے کعب ابنِ مالک سے روایت کی ہے کہ رسول اللہؐ نے ایامِ تشریق کے دوران عقبہ کے مقام پر ہمارے ساتھ ملاقات کا پروگرام رکھا۔ جب ہم حج سے فارغ ہوئے اور ملاقات کی رات آئی تو اپنے قافلے کے ساتھ اپنے ٹھکانے میں سوئے۔ جب رات کا ایک تہائی حصّہ گزر گیا تو ہم اپنے ٹھکانے سے نکل کر ملاقات کے مقام کی جانب چلے اور بھٹ تیتر کی طرح احتیاط سے پھونک پھونک کر اور چھپ چھپ کر روانہ ہوئے۔ یہاں تک کہ عقبہ کے پاس جمع ہوئے۔ وہاں ہم تہتّر مرد تھے اور دو عورتیں۔

پس ہم گھاٹی میں رسولؐ کا انتظار کرنے لگے یہاں تک کہ آپؐ اپنے چچا عباس ابنِ عبدالمطلب کے ساتھ تشریف لائے۔ اس وقت وہاں موجود افراد نے عرض کیا آپؐ ہم سے جو کچھ چاہتے ہیں منوالیں۔ پس آپؐ نے گفتگو شروع کرتے ہوئے قرآن کی تلاوت کی' خدا سے دعا کی اور اسلام کی ترغیب دلائی پھر فرمایا تم وعدہ کرو کہ جن چیزوں کے شر سے اپنی عورتوں اور بچوں کا دفاع کرتے ہو اسی طرح ان چیزوں سے میرا بھی دفاع کروگے۔۱۵۔ پھر ان سے پوچھا کہ کیا وہ راہِ خدا میں آپؐ کی حمایت اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ ہیں؟

ابنِ ہشام کہتا ہے کہ رسول اللہؐ نے آخری بیعتِ عقبہ میں ان لوگوں سے سرخ اور سیاہ جنگ پر بیعت لی (یعنی جیسے بھی حالات ہوں وہ آنحضرتؐ کا ساتھ دیں گے) خود بھی عہد کیا اور حاضرین سے بھی عہد لیا اور اس عہد کو پورا کرنے والوں کے لئے جنت کا وعدہ کیا۔ مجمع نے بھی موافقت کی اور فتح یا موت تک آپؐ کی حمایت کی قسم کھائی۔

عبادہ بن صامت کا کہنا ہے کہ ہم نے دل و جان سے رسولؐ کے ساتھ بیعت کی اور کہا کہ خواہ تنگی کا زمانہ ہو یا فراخی کا' خوشی کا یا غمی کا آپؐ کے حکم پر جنگ کریں گے اور آپؐ کو اپنی جانوں پر ترجیح دیں گے اور آپؐ کے اہلِ بیتؑ سے کسی موضوع پر نزاع نہ کریں گے۔ اور ہر موقع پر حق کی بات کریں گے اور راہِ خدا میں کسی ملامت کی پروا نہ کریں گے۔ پہلی آیت جو اذنِ جہاد کے بارے میں نازل ہوئی یہ تھی۔

"اذن للذین یقاتلون بانہم ظلموا و ان اللہ علی

نصرھم لقدیر ○ الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللّٰہ"۔۱۶۰

"جن لوگوں سے مسلسل جنگ کی جا رہی ہے انہیں ان کی مظلومیت کی بنا پر جہاد کی اجازت دے دی گئی ہے اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قدرت رکھنے والا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے بلا کسی حق کے نکال دیئے گئے ہیں علاوہ اس کے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔" (سورہ حج ۲۲۔ آیت ۳۹۔۴۰)

تیسرا مرحلہ

ان مشکلات کے بعد خدا نے اپنے رسولؐ کے لئے یہ توفیق عطا فرمائی کہ آپؐ یثرب (مدینہ) کے حاجیوں کی صورت میں اپنا گوہرِ گم گشتہ پالیں۔ مسلمانوں پر مصائب و مشکلات کی انتہا ہونے کے بعد آپؐ نے مدینہ کی جانب ہجرت فرمائی اور وہاں ساکن ہونے کے بعد روئے زمین پر اس دور کے اوّلین اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھی۔ یہ گویا بانیٔ اسلام کے ہاتھوں حکومتِ اسلامی کے ظہور کا اعلان تھا۔

ابنِ سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ جب وہ ستّر افراد آپؐ کے ہاں سے رخصت ہوئے تو آپؐ کو اطمینانِ قلبی حاصل ہوا۔ کیونکہ خداوندِ عالم نے آپؐ کو ان کی صورت میں حفاظت کا سامان فراہم کر دیا تھا اور ایک ایسی قوم عطا کی تھی جو مردِ میدان، تعداد میں زیادہ اور نڈر و بے باک تھی۔ جب مشرکین کو پتہ چلا کہ مسلمان ہجرت کرنے والے ہیں تو انہوں نے مسلمانوں پر سختیوں میں اضافہ

کردیا۔ اور مسلمانوں نے ان سے اس قدر جسمانی اور زبانی تکالیف دیکھیں جن کا کوئی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اصحابِ رسولؐ نے آپؐ سے اس امر کی شکایت کی اور ہجرت کی اجازت طلب کی۔ آپؐ نے فرمایا مجھے خبر دی گئی ہے کہ تم نے کہاں ہجرت کرنی ہے اور وہ مقام یثرت (مدینہ) ہے۔ پس جو کوئی ہجرت کرنا چاہے تو یثرب چلا جائے۔ مسلمانوں نے خفیہ طور پر یثرب کی جانب سفر کی تیاری کے لئے آپس میں تبادلہ خیال اور ایک دوسرے کی مدد شروع کردی ۔۱۷۔

رسول اللہؐ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے پاس تشریف لے گئے اور آپؑ کو حکم دیا کہ آپؐ کی ہجرت کے بعد اس وقت تک مکہ میں رہیں جب تک لوگوں کی امانتوں کو جو آپؐ کے پاس تھیں واپس نہ کردیں ۔۱۸۔

ہجرت کی رات کا ایک پہر گزر گیا تو مشرکینِ مکہ حضورؐ کے دروازے پر جمع ہوگئے اور قتل کے ارادے سے آپؐ کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن خدا نے ان پر نیند طاری کردی اور رسولِ خداؐ حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر سوتا چھوڑ کر ان کے درمیان سے نکل گئے۔ آپؐ نے حضرت علیؑ کو اطمینان دلایا کہ آپ کو کوئی گزند نہ پہنچے گی ۔۱۹۔

مدینہ پہنچنے اور وہاں ساکن ہونے کے بعد آنحضرتؐ نے ایک مضبوط اسلامی معاشرے کی تشکیل کی طرف توجہ مبذول کی اور اس جدید معاشرے کے پہلے رہبر کی حیثیت سے سیاسی، اقتصادی، انتظامی اور عدالتی اختیارات کے بشمول پوری حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔

مدینہ میں اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالنے کے بعد آپؐ جنگ و جہاد کے مرحلے میں داخل ہوئے تاکہ جاہلیت کی قوت (جو قریش کی شکل میں مجسم تھی) پر

حملہ آور ہوں اور ان کے شر سے تبلیغ و دعوت کو درپیش خطرے کا ازالہ کریں۔ اس مرحلے میں آپ مشرکین اور یہود کے ساتھ مقابلہ کے لئے ایک عزمِ راسخ کے ساتھ اٹھے۔ کیونکہ اب اسلام اور جاہلیت کی حکومت کا مسئلہ جنگ اور کشا کش کا موضوع تھا اور جہاں حالات کا تقاضا ہو طاقت اور قوتِ بازو کا سہارا لینے کی ضرورت تھی۔

دعوت کا مستقبل اور رسولؐ کا موقف

گزشتہ گفتگو میں مراحلِ تبلیغ کی بات ہو چکی۔ اس باب میں ہم ایک نہایت اہم مسئلے کا تجزیہ کریں گے جسے سمجھنے میں ہمیشہ مسلمانوں میں اختلاف رہا ہے۔ یعنی خلافتِ رسول اور حضورؐ کے بعد اسلامی دعوت کے مستقبل اور قیادت کا مسئلہ۔

اس سلسلہ میں آنحضرتؐ کا موقف جاننے کے لئے ہم پیغمبرِ اسلامؐ کی زیرِ قیادت دعوت کے مزاج، آپؐ کے مشن کے ارتقائی مراحل اور اس دور کے حالات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے جائزہ لیں گے۔[۲۰]

رسولِ اکرمؐ قبل از وقت اس بات سے آگاہ تھے کہ آپؐ کی اجل نزدیک ہے۔ اس بات کا آپؐ نے حجۃ الوداع میں واضح اعلان فرمایا اور آپؐ کی وفات اچانک نہیں ہوئی۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ اپنے بعد اسلام کے مستقبل کے بارے میں غور کرنے کے لئے آپؐ کو کافی فرصت حاصل رہی۔ گرچہ اس مسئلے میں ہم وحی اور آسمانی ہدایت کے تقاضوں سے قطع نظر ہی کیوں نہ کرلیں تب بھی اس بات کی روشنی میں ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ پیغمبرؐ کے سامنے اسلام کے مستقبل کے

بارے میں مندرجہ ذیل تین ممکنہ راستے تھے۔

پہلا راستہ

یہ کہ آپؐ اسلام کے مستقبل کے بارے میں منفی موقف اختیار کرتے ہوئے اسے حالات و اتفاقات کے حوالے کردیتے اور اپنی تبلیغی و شرعی ذمہ داریوں کو فقط اپنی زندگی تک محدود سمجھتے۔ لیکن واضح ہے کہ یہ منفی موقف نبی کریمؐ کی شان کے منافی ہے کیونکہ اس ممکنہ روش کی دو ہی ممکنہ وجوہات ہوسکتی ہیں۔ اور وہ دونوں آپؐ کے شایانِ شان نہیں۔

پہلی وجہ

یہ کہ آپؐ کا عقیدہ یہ ہو کہ اس منفی روش اور بے پروائی سے اسلام کے مستقبل پر کوئی اثر نہ پڑے گا اور امت خود اس مسئلے کو اس طرح سے حل کرنے پر قادر ہے جو تبلیغ و دعوت کے لئے مفید ہو اور انحراف سے بچنے کی ضمانت بھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس نظریے پر کوئی دلیل نہیں اور حقائق اس کے برخلاف دلالت کرتی ہیں کیونکہ دعوت کا عمل ایک انقلابی اور اصلاحی عمل ہونے کے ناطے (جو اس بات کا مقتضی ہے کہ ایک ایسی امت وجود میں آئے جس میں جاہلیت کے آثار مکمل طور پر مفقود ہوں) قیادت سے محرومی یا اس کے خطوط واضح نہ ہونے کی صورت میں عظیم ترین خطرات سے دوچار ہوگا۔ مثال کے طور پر۔

☆ قیادت کے خلا سے پیدا ہونے والے خطرات ظاہر ہوں گے۔ کیونکہ اس خلا کی بنا پر امت نبیؐ کی وفات کے عظیم صدمے کے دوران ایسا اہم

فیصلہ کرے گی جس کا اس سے قبل واسطہ ہی نہ پڑا ہو اور ان کے اذہان اس بارے میں خالی ہوں۔

☆ ایسے خطرات جو اسلامی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے مطلوبہ پختگی (جو رسولِ کریمؐ کو بعد میں واقع ہونے والے فیصلوں کی صحت، ان کی اپنی دعوت کے ساتھ مطابقت، مسلمانوں کے درمیان موجود اختلافات مثلاً مہاجر و انصار، قریش و غیر قریش اور مکی و مدنی کے درمیانی اختلافات پر غالب آنے کی ضمانت دیں۔) کے فقدان کی وجہ سے پیدا ہوں۔

☆ مسلمانوں کے روپ میں چھپے ہوئے دشمنوں کا خطرہ جو خود رسولؐ کی زندگی میں اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ اگر ان میں ہم ان بے شمار لوگوں کا اضافہ بھی کرلیں جو فتح مکہ کے بعد اسلامی حکومت کے خوف سے مسلمان ہوئے (نہ کہ اسلام کی حقیقت کو پہچان کر) تو ہم اس عظیم خطرے کا احساس کرسکتے ہیں جو یہ لوگ پیدا کرسکتے تھے۔ جب کہ ان کو قیادت کے خلا کی وجہ سے زبردست سرگرمیوں کا موقع بھی مل جائے اور ان کو کوئی روکنے والا بھی نہ ہو۔

یہ خطرات ان خطروں کے علاوہ ہیں جو دور یا نزدیک کی بیرونی طاقتوں اور حکومتوں کی طرف سے لاحق تھے۔ لہٰذا ان حقائق کے پیشِ نظر جانشینی کی اہمیت سے رسول اللہؐ تو درکنار کوئی عام نظریاتی قائد بھی چشم پوشی نہیں کرسکتا۔

جب حضرت ابوبکر اپنی جانشینی کے مسئلے سے لاتعلق نہیں رہے۔ نیز جب حضرت عمر پر ضربت لگی اور لوگوں نے ان کے بعد قیادت کا خلا پیدا ہونے کے خوف سے ان کے گرد جمع ہو کر کہا کہ اے امیرالمومنین ہمارے لئے کوئی وصیت

کریں۔۲۱۔ (حالانکہ امت پیغمبرؐ کے بعد کی دہائی میں سیاسی اور اجتماعی طور پر مرکزیت پیدا کرچکی تھی)' تو حضرت عمر نے لوگوں کے احساسِ خطر کے پیشِ نظر چھ افراد کی کمیٹی تشکیل دی۔

نیز جب خود حضرت ابوبکر نے جلد بازی میں خلافت قبول کرنے پر بذاتِ خود عذر خواہی کی جیسا کہ حضرت عمر نے بھی حضرت ابوبکر کی بیعت کے بارے میں کہا تھا کہ "جلد بازی میں بغیر سوچے سمجھے سرزد ہوئی تھی لیکن خدا نے ہی اس کے شر سے بچایا"۔۲۲۔

ان حقائق کے پیشِ نظر بدیہی بات ہے کہ بانیٔ اسلام اور نبیٔ مرسل کو جانشینی کے مسئلے میں درپیش خطرات' اپنے موقف اور اپنے انقلابی و اصلاحی دین کے تقاضوں کا احساس دوسروں سے زیادہ ہونا چاہئے۔ جب کہ بقول حضرت ابوبکر امت اپنے اسلام میں کچی تھی' اور حال ہی میں جاہلیت سے نکل کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئی تھی (یعنی مجموعی طور پر ان کا اسلام ابھی پکا نہیں ہوا تھا)۔

دوسری وجہ

جسے ہم (نعوذ باللہ) اسلام کے مستقبل سے رسولؐ کی لاتعلقی اور منفی کردار سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ یعنی آپؐ نے ان خطرات کے احساس کے باوجود اسلام کو بچانے کی کوئی کوشش نہ کی اور نعوذ باللہ آپؐ کی دعوت ذاتی مفادات اور مصلحتوں کے لئے تھی اور آپؐ فقط اپنی زندگی کے دوران اس کی حفاظت چاہتے تھے تاکہ آپؐ کے مفادات حاصل ہوں۔ رہا دعوت کا مستقبل تو آپؐ کو اس کی پرواہ ہی نہ تھی۔

لیکن یہ مفروضہ نبی کریمؐ کے بارے میں سراسر بہتان اور غلط ہے۔ یہاں تک کہ اگر ہم آپؐ کو خدا کا نبی ہونے کے ناطے سے نہ بھی دیکھیں اور دیگر نظریاتی و دینی قائدین کی مانند قرار دیں تب بھی یہ مفروضہ باطل ہے۔ کیونکہ تاریخ میں آپؐ کی مانند کوئی بھی ایسا نظریاتی قائد نہیں ملتا جو آپؐ کی طرح اپنے نظریے کے ساتھ مخلص و وفادار اور جان کی بازی لگانے والا ہو۔ جسے بسترِ مرگ پر بھی اس جنگ کی فکر ہو جس کا اس نے پروگرام بنایا تھا اور جس کے لئے اسامہ کا لشکر تیار رکیا تھا۔ ۲۳۔ پس جب زندگی کے آخری لمحوں میں ایک جنگی مہم کے بارے میں آپؐ کی دلچسپی اور توجہ اس حد تک تھی تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اس نبیؐ کو اپنے دین کے مستقبل کی کوئی فکر نہ ہو اور اپنے بعد اس کی بقاء و حفاظت کے لئے کوئی اقدام نہ کرے اور نہ ہی کچھ سوچے۔

بنابرایں اسلام کے مستقبل کے بارے میں اس منفی مفروضے سے آپؐ کی ذات سب سے زیادہ منزہ اور دور ہے۔ آپؐ تو وہ ہستی ہیں کہ جب آپؐ کی وفات قریب ہوئی (اور آپؐ کے گھر میں عمر بن خطاب کے بشمول کئی دیگر افراد موجود تھے) تو آپؐ نے فرمایا۔

"ائتونی بالکتف والدواۃ اکتب لکم کتاباً لن تضلوا بعدہ ابداً"۔ ۲۴

"میرے لئے قلم اور شانے کی ہڈی حاضر کرو تاکہ ایک ایسی وصیت لکھوں جس کی بدولت کبھی بھی گمراہ نہ ہو۔"

آپؐ کی یہ کوشش (جس کو تمام مذاہبِ اسلامی نے نقل کیا ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے) اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپؐ کو مستقبل کے خطرات کی

فکر تھی اور اسلام و امت کو انحراف و بربادی سے بچانے کے لئے ایک لائحہ عمل دینے کی اہمیت کا گہرا احساس تھا۔

دوسرا راستہ

دوسرا راستہ یہ ہے کہ حضورؐ اپنے بعد کے لئے ایک لائحہ عمل دیتے۔ ایک مثبت طریقہ عمل اختیار کرتے ہوئے اپنے دین کی سرپرستی اور قیادت کا اختیار شورائی نظام کے تحت امت کے اوّلین اور نظریاتی ہراول دستے کے حوالے کرتے جو مستقبل میں حکومت اور قیادت کی ترقی کے لئے مرکزی حیثیت کا حامل ہوتا۔

لیکن یہ مفروضہ بھی مندرجہ ذیل اسباب کی رو سے نامناسب ہے۔

پہلا سبب

اگر نبیؐ اپنے بعد شورائی نظام کو معین فرماتے اور اسے ہی اسلامی قیادت کا منبع قرار دیتے تو پھر انتہائی بدیہی بات ہے کہ اس موقف کی رو سے رسولِ اکرمؐ کو پہلے شورائی نظام کے خدوخال اور حدود و تفاصیل سے امت کو آگاہ کرنا اور اسے ایک مقدس دینی حیثیت عطا کرنا چاہئے تھی۔ اور ضروری تھا کہ آپؐ اس نظام کی قبولیت کے لئے اسلامی معاشرے کی فکری اور روحانی طور پر تربیت کرتے۔ خاص کر ان حالات میں جب کہ اس دور کا معاشرہ قبائلی اور نسلی قیادتوں کا عادی تھا اور بڑی حد تک دولت ' طاقت اور وراثت کے بل پر حکومت چلتی تھی۔

ادھر انتہائی واضح امر ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے شورائی نظام کا تعارف اور اس کی تفصیلات کو بیان نہیں فرمایا۔ اور بفرضِ محال اگر آپؐ نے بیان کیا ہوتا تو ظاہر

ہے کہ آپؐ کی احادیث میں کہیں نہ کہیں اس کا تذکرہ ملتا۔ یا امت کے ذہنوں میں ہی اس کا کوئی عکس نظر آتا۔ کم از کم ابتدائی دور کے ممتاز مسلمانوں میں ہی اس بات کا احساس نظر آتا کہ وہ شرعی طور پر شورائی نظام سے مربوط ہیں۔

ہماری بات کی تائید حضرت ابوبکر کے اقدام سے ہوتی ہے۔ جب حضرت ابوبکر کی بیماری میں شدّت آئی تو حضرت عمر بن خطاب کو وصیت کی اور حضرت عثمان کو لکھنے کا حکم دیا۔ حضرت عثمان نے یوں لکھا :

"اما بعد تحقیق۔ میں عمر بن خطاب کو تمہارا حاکم بناتا ہوں۔ پس سنو اور اطاعت کرو۔"

عبدالرحمان بن عوف نے آکر پوچھا اے خلیفۂ رسول آپ نے کس حالت میں صبح کی؟ جواب ملا اس حالت میں کہ میں نے جانشین چن لیا ہے۔ تم لوگوں نے تو میری تکلیف میں اضافہ کردیا ہے۔ جب تم نے یہ دیکھا کہ میں نے تمہارے ہی ایک شخص کو حاکم بنایا ہے۔ تم سب اس سے ناراض ہو۔ اور ہر کوئی اس کا طلب گار ہے۔۲۵

خلیفہ کی طرف سے یوں جانشین معین کرنے اور مخالفین کی مخالفت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ کے نزدیک شورائی نظام معقول نہ تھا۔ اور وہ جانشین مقرر کرنے کے بعد اسے مسلمانوں پر مسلط کرنے کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ اسی طرح حضرت عمر نے بھی جانشین کے تعین کو اپنا حق سمجھا اور باقی مسلمانوں کے لئے خلیفہ کے انتخاب میں کوئی اختیار باقی نہ رکھا۔

پس خلیفہ کے انتخاب کے سلسلہ میں خلیفۂ اول اور خلیفۂ ثانی کا طریقۂ انتخاب، مسلمانوں کا اس معاملے میں سوال نہ کرنا، سقیفہ کے دن خلافت پر

جھگڑنے والوں کے درمیان موجود عمومی فضا اور اس دن خلیفہ بننے کے بعد حضرت ابوبکر کا رسول اللہؐ سے مسئلۂ خلافت کے بارے میں سوال نہ کرنے پر اظہارِ افسوس وغیرہ------کے مطالعے سے اس بات میں شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ مسلمانوں کے جس اوّلین طبقے نے نبی کریمؐ کے بعد خلافت سنبھالی ان کے ذہن میں شوریٰ نام کی کوئی چیز نہ تھی' ان کی سوچ ہی شورائی نہ تھی یا شورائی نظام کا کوئی نقشہ ان کے علم میں نہ تھا۔

دوسرا سبب

اگر نبی کریمؐ کا ارادہ یہ ہوتا کہ مہاجرین و انصار پر مشتمل چیدہ چیدہ اصحاب کو اپنے بعد اسلام اور تبلیغِ دعوت کے کام کی سرپرستی عطا کرتے تو پھر لازم تھا کہ آپؐ اس نسل کی اس نہج پر گہری فکری و نظریاتی تربیت فرماتے جس کے باعث وہ اسلامی نظریے سے مکمل طور پر وابستہ رہ سکتی اور اس کی روشنی میں عملی نفاذ کا کام کرتے اور دعوتِ اسلامی کی راہ میں وقتاً فوقتاً آنے والی مشکلات کو ان تعلیمات کے مطابق حل کرتے۔ خاص کر اس بات کے پیشِ نظر کہ نبی کریمؐ نے قیصر و کسریٰ کے زوال کی پیش گوئی کی تھی اور آپؐ جانتے تھے کہ عظیم فتوحات مسلمانوں کی منتظر ہیں اور امتِ مسلمہ کو جلد ہی ان اقوام و قبائل کو اسلام کے مطابق تربیت دینے کی ذمہ داری سنبھالنی ہے۔ اور امت کو فتوحات سے پیدا ہونے والے خطرات سے بچانا بھی ہے اور مفتوحہ علاقوں میں احکامِ شریعت کو نافذ بھی کرنا ہے۔ نیز باوجود اس کے کہ تبلیغِ دین کی ذمہ داریاں سنبھالنے والے صدرِ اوّل کے ممتاز مسلمانوں کا طبقہ تمام دیگر ادوار کے مسلمانوں سے بہتر اور

قربانی کے جذبے میں دوسروں سے آگے تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود ان میں وہ خاص آمادگی اور تیاری نظر نہیں آتی جو دینِ اسلام کی سرپرستی اور تعلیماتِ اسلامی کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مطلوب تھی۔

اگر ہم غور کریں تو احکامِ شریعت کے بارے میں اصحاب سے مروی احادیثِ نبویؐ کی تعداد سینکڑوں سے زیادہ نہیں۔ حالانکہ تاریخی اسناد کی رو سے خود اصحاب کی تعداد بارہ ہزار کے قریب تھی۔ نیز ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنی طرف سے پیغمبرؐ کی خدمت میں سوال کرنے میں پہل نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہ اس بات کے منتظر رہتے تھے کہ باہر سے کوئی اعرابی آئے اور سوال کرے تاکہ ساتھ ہی وہ بھی جواب سن سکیں۔ ان کے نزدیک ایسی چیزوں کے بارے میں سوال کرنا جو ابھی واقع نہ ہوئی ہوں مناسب بات نہ تھی اور اس سے احتراز ضروری تھا۔

حضرت عمر بن خطاب کا کہنا ہے۔

"کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں کہ ان امور کے بارے میں سوال کرے جو ابھی واقع نہیں ہوئے۔ بتحقیق خدا نے واقع شدہ امور کے بارے میں بتا دیا ہے۔"

ابنِ عمر سے جب کوئی سوال کیا جاتا تو جواب میں کہتے۔

"جو چیز ہوئی نہیں اس کے بارے میں سوال نہ کرو۔"

کیونکہ میں نے عمر بن خطاب کو اس شخص پر لعن کرتے ہوئے سنا ہے جو ابھی واقع نہ ہونے والی چیزوں کے بارے میں سوال کرتا ہے۔۲۶

پس گویا صحابہ کی روش یہ تھی کہ واقع ہو چکنے والے خاص مسائل و

مشکلات کے علاوہ کسی چیز کے بارے میں سوال نہ کیا جائے۔

یہ نظریہ اس خاص نظریاتی تربیت کے پروگرام سے کوسوں دور ہے جس کے لئے مستقبل میں قیادت کو درپیش مشکلات کے علاج کے بارے میں وسیع تعلیم و تربیت اور وسعتِ فکری پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد رونما ہونے والے حادثات نے ثابت کردیا کہ مہاجرین و انصار کی جماعت کے پاس بہت سارے بنیادی مسائل کا کوئی ٹھوس جواب نہ تھا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہونے والی وسیع و عریض سرزمینوں اور علاقوں سے متعلق شرعی احکام کے بارے میں نہ خلیفہ کے پاس ٹھوس اور تفصیلی علم تھا نہ خلیفہ کے معاونوں کے پاس۔ مثلاً یہ کہ یہ زمینیں کیا مجاہدین کا حق ہیں یا تمام مسلمانوں کا (جیسا کہ عراق کی فتح کے موقع پر یہ مسئلہ پیش آیا)۔

بلکہ ہم یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ خود رسولؐ کے ہم عصر مسلمان بھی دینی مسائل کے بارے میں واضح تصورات سے عاری تھے۔ مثلاً نمازِ جنازہ ہی کو لے لیں جو ایک عبادت ہے اور رسولؐ نے صدہا بار نمازیوں اور جنازے میں شامل ہونے والوں کے مجمعِ عام میں اُس عبادت کو عملی طور پر انجام دے کر دکھایا تھا۔ اس کے باوجود ہم ملاحظہ کرتے ہیں کہ صحابہ کو اس عبادت کی ہیئت کذائی کو نوٹ کرنے اور یاد رکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اسی لئے بعد میں اس نماز کی ادائیگی کے طریقوں میں اختلاف واقع ہوا۔ ۲۷

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ رسولؐ کی زندگی میں اصحاب فقط آپؐ کی ذات پر بھروسہ کرتے تھے۔ اور آپؐ کے ہوتے ہوئے اسلامی تعلیمات و احکام سے مکمل آگاہی کو اپنے لئے ضروری خیال نہیں کرتے تھے۔ یہ ساری باتیں اس امر کی

دلیل ہیں کہ آپؐ نے عام مسلمانوں کے درمیان جو فکری بیداری پیدا کی وہ اس حد تک نہ تھی جو ایک آگاہ اور بیدار سیاسی و فکری قیادت کے لئے کافی ہو۔ بلکہ مذکورہ بیداری فقط عوامی سطح تک تھی اور اس حد تک کہ جس کے ذریعے عام مسلمان حال یا مستقبل میں قیادت کے ساتھ چلنے کے قابل ہوں۔

تیسرا سبب

دعوت و تبلیغ تبدیلی کا عمل ہے اور نئی زندگی کی راہ ہے۔ بالفاظ دیگر دعوت کا مقصد ایک نئی امت کی تشکیل اور جاہلیت کے تمام آثار کی بیخ کنی تھا۔ لیکن امتِ مسلمہ نے مجموعی طور پر فقط ایک عشرے تک اس تبدیلی کے عمل سے استفادہ کیا تھا۔ اور یہ مدت نظریاتی اذہان اور انقلابی مکاتبِ فکر کے لئے اس لحاظ سے ناکافی ہے کہ اس عرصے میں ملت بیداری، استقلال، رسومِ کہن سے آزادی اور جدید نظام کی تعلیمات سے مکمل آراستہ ہونے کے لحاظ سے اس درجہ کو پہنچ جائے کہ وہ دین کی سرپرستی اور دعوت و اصلاح کی ذمہ داریاں بغیر کسی رہبر کے نبھا سکے۔

بلکہ کسی بھی نظریاتی مکتب یا مشن کا فطری تقاضا یہ ہے کہ امت کو نظریات و عقیدے کی زیادہ مدّت تک رہنمائی ملتی رہے تاکہ وہ اس مکتبِ فکر کی سرپرستی کے قابل ہو جائے۔ اسی لئے عملی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ مہاجرین و انصار کے ہاتھوں امت کی قیادت کو آئے ہوئے پچیس سال بھی نہ گزرے تھے کہ اسلام کے پرانے دشمنوں کے پے در پے حملوں کے باعث خلافتِ راشدہ اور اسلامی تجربے کی جدید عمارت نے منہدم ہونا شروع کر دیا۔ یہ دشمن چپکے سے حساس

مراکز میں گھسنے اور بے شعور قیادت کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہوگئے۔ تب انہوں نے نہایت دیدہ دلیری اور منہ زوری کے ساتھ قیادت پر قبضہ کرلیا اور امت کو اپنے آگے جھکنے پر مجبور کردیا۔ یوں اسلامی قیادت ایک موروثی حکومت بن گئی جس کا کام اچھے اقدار کی بے توقیری' نیک لوگوں کو قتل کرنا' احکامِ خدا کو پامال کرنا تھا۔ نتیجے کے طور پر مالِ غنیمت' خزانہ اور مفتوحہ زمینیں قریش کے لئے تر نوالہ ثابت ہوئیں اور خلافت بنی امیہ کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ گئی۔

تیسرا راستہ

یعنی وہ واحد راستہ جو فطری تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ نیز ابتدائے اسلام کے حالات اور نبی کریمؐ کے اقدامات کی روشنی میں معقول روش بھی۔ وہ راستہ عبارت ہے اس بات سے کہ رسول اللہؐ اسلام کے مستقبل کے بارے میں مثبت طریقہ عمل اختیار کرتے ہوئے حکمِ خدا کے تحت ایک ایسے شخص کا انتخاب کرتے جو دعوت و تبلیغ کے لئے اپنے پورے وجود کو وقف کرنے کی وجہ سے اس منصب کا اہل ہوچکا ہو۔ اسے اپنی جانشینی کی ایسی خصوصی تربیت دیتے کہ وہ فکری و سیاسی قیادت کا اہل بن جاتا۔ یوں وہ شخص آنحضرتؐ کے بعد ایک بیدار عوامی قوت کے سہارے امت کی رہبری اور تعمیر کا سلسلہ جاری رکھتا۔

معلوم ہوا کہ یہ وہ واحد ممکنہ راستہ ہے جو امتِ مسلمہ اور اسلام کے تابناک مستقبل کی ضمانت دے سکتا ہے اور اسے انحراف سے بچا کر کمال کی منزل تک پہنچا سکتا ہے اور حقیقت بھی یہی تھی۔ اسی لئے آنحضرتؐ سے منقول احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آپؐ ایک فرد کو خصوصی طور پر تبلیغ و

قیادت کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لئے فکری اور عملی تربیت دے رہے تھے۔ تاکہ وہ آپؐ کے بعد امت کی فکری و سیاسی قیادت بطریقِ احسن انجام دے سکے۔

یہ احادیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہیں کہ آنحضرتؐ نے اس شخص کو اپنے بعد امت کی فکری و سیاسی قیادت کی وصیت کی ہے' اور یہ ساری باتیں اس بات سے عبارت ہیں کہ قائدِ اکبر رسولِ اکرمؐ نے اس تیسرے راستے کو اختیار کیا تھا جو فطرت کا تقاضا بھی ہے۔ اور یہ شخص جسے مستقبل میں اسلام کی سیاسی' نظریاتی اور عملی قیادت و زعامت کے لئے تیار کیا جا رہا تھا سوائے علی ابنِ ابی طالبؑ کے کوئی نہ تھا۔ اور علیؑ اپنے پورے وجود کو اسلام میں فنا کرنے کی وجہ سے اس منصب کے اہل ہوئے تھے۔ آپؑ ہی دشمنوں کے ساتھ ہونے والی سخت ترین جنگوں میں مجاہدِ اول تھے' جو رسولؐ کی گود میں پلے تھے' جنہوں نے رسولؐ کی ہی گود میں آنکھیں کھولی تھیں' جنہیں آپؐ کے ساتھ میل ملاپ اور گھل مل کر کام کرنے اور آپؐ کی روش اپنانے کا اتنا موقع ملا تھا جتنا کسی اور کو نصیب نہ ہوا تھا۔

پیغمبرِ اسلامؐ اور امام علیؑ کی زندگی کے واقعات شاہد ہیں کہ آنحضرتؐ نے امام علیؑ کو خصوصی تربیت دی تھی اور آپؑ کو اسلام کے اسرار و حقائق سے آگاہ فرمایا تھا۔ جب امامؑ سوال کرتے تو حضورؐ آپؑ کو فکری و علمی خزانوں سے نوازتے اور گھنٹوں آپؑ کے ساتھ تنہائی میں راز و نیاز کرتے۔ آپؑ کو اسلام کے حقائق' راستے کی مشکلات اور طریقہ ہائے عمل سے آگاہ کرتے اور یہ سلسلہ آپ کی زندگی کے آخری دن تک جاری رہا۔

حاکم نے مستدرک میں ابو اسحاق سے نقل کیا ہے کہ اس نے قثم بن عباس سے پوچھا کہ علیؑ کیسے رسول کے وارث بنے؟

وہ بولے : "اس لئے کہ علیؑ ہم سب سے پہلے رسول اللہؐ سے جا ملے اور ہم سب سے زیادہ آپؐ کے ساتھ وابستہ رہے۔"

نسائی نے امام علیؑ سے روایت کی ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے۔

"جب میں رسول اللہؐ سے کوئی سوال کرتا تو آپؐ جواب سے نوازتے اور اگر میں خاموش رہتا تو آپؐ خود گفتگو کی ابتداء کرتے۔"

یہ روایت حاکم نے مستدرک میں بھی نقل کی ہے------

امیرالمومنینؑ اپنے ایک خطبہ میں رسول اللہؐ کے ساتھ اپنے خصوصی ارتباط اور آنحضرتؐ کی آپؑ پر خصوصی توجہ اور حضورؐ کی طرف سے آپؑ کی خصوصی تربیت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"تم جانتے ہو کہ رسول اللہؐ سے قریب کی عزیزداری اور مخصوص قدر و منزلت کی وجہ سے میرا مقام ان کے نزدیک کیا تھا---- میں ان کے پیچھے پیچھے ایسے لگا رہتا تھا جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے ہوتا ہے۔ آپؐ ہر روز میرے لئے اخلاقِ حسنہ واضح فرماتے تھے اور مجھے ان کی پیروی کا حکم دیتے تھے اور ہر سال (کوہ) حرا میں کچھ عرصہ قیام فرماتے تھے اور وہاں میرے علاوہ کوئی انہیں نہیں دیکھتا تھا۔ اس وقت رسول اللہؐ اور (امّ المومنین) حضرت خدیجہؓ کے گھر کے علاوہ کسی گھر میں اسلام نہ تھا البتہ ان میں تیسرا میں تھا۔ میں وحی و رسالت کا نور دیکھتا تھا اور نبوت کی خوشبو سونگھتا تھا"۔۲۸۔

ان باتوں کے علاوہ نبیؐ کی وفات کے بعد بھی امام علیؑ کی زندگی بہت سے ایسے واقعات سے پُر ہے جن سے اس خصوصی نظریاتی تربیت کا پتہ چلتا ہے جو رسولِ اکرمؐ نے آپؑ کو دی تھی۔ اور اس تربیت کے نتائج آپؑ کی زندگی میں جابجا نمایاں تھے۔ حکامِ وقت کو جب بھی کوئی مشکل اور لاینحل مسئلہ پیش آتا تو وہ آپؑ ہی کی طرف رجوع کرتے۔

ہمیں خلفاء اربعہ کے پورے دور میں ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی کہ علیؑ نے احکامِ دینی اور مسائل کے حل کی راہوں کے بارے میں کسی دوسرے سے رجوع کیا ہو۔ جبکہ ہم تاریخ میں درجنوں ایسی مثالیں پاتے ہیں جہاں حکامِ وقت کو مجبوراً امامؑ کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ حالانکہ وہ آپؑ کی طرف رجوع کرنے سے کتراتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ ہم نے متعدد شواہد کی روشنی میں دیکھ لیا کہ رسولؐ نے علیؑ کو اپنی جانشینی کے لئے خصوصی طور پر تربیت دی تھی۔ رہی اس تربیت اور اپنے بعد علیؑ کی قیادت کے باقاعدہ اعلان کی بات اور اس کے شواہد و دلائل تو وہ گزشتہ بات کے شواہد و دلائل سے کچھ کم نہیں۔ اور ہم حدیثِ دار، حدیثِ ثقلین، حدیثِ منزلت، حدیثِ غدیر اور درجنوں دیگر احادیث میں اس حقیقت کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔-۲۹

❑❋❑

مصادر و ماخذ

۱۔ سیرۃ ابنِ ہشام - ج ۱ - ص ۲۴۰

۲۔ سیرۃ ابنِ ہشام۔ ج۱۔ ص۲۴۹-۲۶۱
۳۔ سیرۃ ابنِ ہشام۔ ج۱۔ ص۲۸۳
۴۔ الفقہ السیاسی فی الاسلام از محمد جعفر ظالمی۔ ص۸۴
۵۔ فقہ السیرہ از ڈاکٹر محمد سعید رمضان بوطی۔ ص۹۹
۶۔ فقہ السیاسی فی الاسلام از محمد جعفر ظالمی
۷۔ بخاری از فقہ السیرہ ص۱۰۵
۸۔ تاریخِ طبری۔ ج۲۔ ص۲۴۴ اور سیرۃ ابنِ ہشام ج۱۔ ص۱۸۵
۹۔ سیرۃ ابنِ ہشام اور تہذیب السیرہ
۱۰۔ طبقاتِ ابنِ سعد۔ ج۱۔ ص۱۹۶
۱۱۔ سیرۃ ابنِ ہشام۔ ج۱۔ ص۴۲۰
۱۲۔ طبقات ابنِ سعد۔ ج۱۔ ص۱۹۶
۱۳۔ محمد نظرۃ عصریہ۔ ص۱۷۱
۱۴۔ سیرۃ ابنِ ہشام۔ ج۱۔ ص۴۲۸
۱۵۔ مصعب بن عمیر کے حالات کے لئے رجوع کیجئے ڈاکٹر بوطی کی کتاب فقہ السیرہ کے صفحہ ۱۶۶ کی طرف۔
۱۶۔ سیرۃ ابنِ ہشام
۱۷۔ مصدرِ سابق
۱۸۔ طبقاتِ ابنِ سعد۔ ج۱۔ ص۲۱۰ اور طبری۔ ج۱۔ ص۳۶۷
۱۹۔ فقہ السیرہ' البوطی۔ ص۱۸۵
۲۰۔ تفصیلات کے لئے سید محمد باقر الصدر کی کتاب بحث فی حول الولایہ کی طرف رجوع کیجئے۔
۲۱۔ تاریخِ طبری۔ ج۵۔ ص۳۴
۲۲۔ تاریخِ طبری۔ ج۳۔ ص۳۰۰۔ شرح نہج البلاغہ ابنِ ابی الحدید۔ ج۶۔ ص۴۲
۲۳۔ تاریخِ کامل ابنِ اثیر
۲۴۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے رجوع کیجئے مسندِ امام حنبل۔ ج۱۔ ص۳۵۵ اور صحیح مسلم

-ج۲- صحیح بخاری-ج۱

۲۵۔ تاریخِ یعقوبی- ج۲- ص۱۲۶-۱۲۷

۲۶۔ سنن داری- ج۱- ص۵۶

۲۷۔ تفصیل کے لئے عمدۃ القاری- ج۴- ص۱۲۹سے رجوع کیجئے۔

۲۸۔ نہج البلاغہ - خطبہ نمبر۱۹۰

۲۹۔ تفصیلات کے لئے رجوع ہو المراجعات سید عبد الحسین شرف الدین۔

دوسرا حصہ

ائمہؑ اور عمل کے مراحل

پہلا مرحلہ

یہ وہ مرحلہ ہے جس میں رسولؐ کے حقیقی جانشینوں کو اس انحراف کا سامنا کرنا پڑا جو رسولؐ کی وفات کے بعد (قیادت کے مسئلے میں) واقع ہوا۔ اس مرحلے میں اماموں کو بنیادی طور پر اس انحراف کی وجہ سے پہنچنے والے نقصانات سے روبرو ہونا پڑا۔ اور امتِ مسلمہ کو اس انحراف کے شر سے بچانے اور اسلام کو ایک ابدی نظام کے طور پر تحریفات سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے طور پر جدوجہد کرنی پڑی۔ اگرچہ ائمہؑ کو حکومت کی سطح پر یا وسیع اجتماعی پیمانے پر ایسا کرنے کا موقع نہیں ملا۔

حفاظتِ دین کا یہ کام حضرت علیؑ اور آپؑ کے فرزندان امام حسنؑ و حسینؑ اور آخر میں امام سجادؑ کو انجام دینا پڑا۔ ان ائمہؑ کی سرگرمیوں کا محور منصوبہ بندی اور ہر ممکنہ احتیاطی تدابیر کے ساتھ مذکورہ انحراف کا مقابلہ اور اسلام کو اس انحراف کے نتائج سے بچانا تھا۔

امام علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام

مقدمہ

حالات و حوادثِ زمانہ اور ان کے حل کے لئے امام علیؑ کے موقف پر بحث کرنے سے پہلے ان سماجی اور سیاسی حالات و کیفیات پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے جو آپؑ کو اپنی حکومت سے پہلے پیش آئے۔ اور جن کے دوران اسلامی تعلیمات و عقائد کے لحاظ سے امتِ مسلمہ واضح اور آشکارا انحراف کا شکار ہوئی۔ اس انحراف اور تبدیلی کا بہتر مشاہدہ حضرت عثمان بن عفان کی حکومت کے دوسرے نصف حصے میں ہوتا ہے۔ اس دور کا یہ انحراف بذاتِ خود ان سیاسی واقعات و حادثات کا پیش خیمہ ثابت ہوا جن سے حضرت علیؑ کو دوچار ہونا پڑا اور آپؑ امت کو اس انحراف کے عواقب سے بچانے اور دوبارہ حقیقی اسلامی نظامِ حیات کی طرف لوٹانے کے لئے خلافت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی مصروفِ عمل ہو گئے۔ یہاں ہم ان حالات و واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو عہدِ عثمانی میں رونما ہونے والے عظیم تغیرات و حادثات اور حضرت علیؑ کو پیش آنے والی مشکلات کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔[1]

(۱) سقیفہ کی سوچ

سقیفہ کی سوچ سے ہماری مراد قبیلہ پرستی کی وہ سوچ ہے جو سقیفہ کے دن خلافت پر جھگڑنے والوں میں موجزن تھی۔ اور وہ رجحان ہے جو فردی اور بلا شرکتِ غیرے استبدادی حکومت قائم کرنے کے لئے ذہنوں میں موجود تھا۔ وہ اصرار جو لوگ موروثی حکومت کے جواز کو ثابت کرنے کے لئے کر رہے تھے۔ اور وہ آمادگی جو بہت سے انصاریوں میں اس بات پر پائی جاتی تھی کہ امت کے دو امیر ہوں۔ ایک مہاجرین سے 'ایک انصار سے۔ حد تو یہ ہے کہ ہر گروہ دوسرے کی بہ نسبت خود کو امرِ خلافت کا زیادہ حقدار سمجھتا تھا۔ ۲

ادہر علی ابنِ ابی طالبؑ اس کارروائی سے دور رسول اللہؐ کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے۔ ۳۔ خلافت کا فیصلہ چکانے کے لئے حضرت عمر حضرت ابوبکر کے ہمراہ تیزی سے سقیفہ پہنچے۔

جب حضرت علیؑ کو اس بات کی خبر ملی تو آپؑ نے بیعت سے انکار کیا۔ ۴۔ اور آپؑ کے ساتھ آپؑ کے حامیوں نے بھی بیعت سے انکار کیا اور چھ ماہ تک مسلسل انکار کرتے رہے۔ بلکہ حضرت علیؑ نے اپنی غیر موجودگی میں سقیفہ کے اجتماع کو سازش قرار دیا۔

سقیفہ میں موجزن قبائلی طرزِ فکر ہی تھا جس نے مسلمانوں کے لئے فتنہ و فساد کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کھول دیا جس کی تصریح حضرت عمر کے اس قول سے ہوتی ہے کہ۔

"ابوبکر کی بیعت اچانک اور بے سوچے سمجھے واقع ہوئی تھی۔ لیکن خدا

نے اس کے بُرے انجام سے بچایا۔ آئندہ جو کوئی اس قسم کے عمل کو دُہرائے اس کو قتل کردو۔ جو بھی شخص مسلمانوں سے مشورہ کئے بغیر کسی دوسرے شخص کی بیعت کرے تو یہ اس کی گمراہی کا باعث ہے۔ بنا برایں دونوں کا قتل واجب ہے" ۵؎۔

(۲) تقسیم اموال میں حضرت عمر کی روش

پیغمبرؐ کے زمانے میں بیت المال سے مسلمانوں کے وظائف کی تقسیم مساویانہ ہوتی تھی۔ اسی طرح حضرت ابوبکر کے دور میں بھی یہی سلسلہ جاری رہا لیکن حضرت عمر نے اپنے دور میں امتیازی سلوک کی ابتداء کی۔ اور وہ اس طرح کہ پہلے مسلمان ہونے والوں کو بعد میں اسلام لانے والوں پر اور قریشی مہاجرین کو غیر قریشی مہاجرین پر اور تمام مہاجرین کو انصار پر اور عرب کو عجم پر اور آزاد کو غلام پر ترجیح دی ۶؎۔

یوں حضرت عمر نے اسلامی معاشرے میں طبقاتی تعصب کا بیج بویا جو بعد میں ربیعہ و مضر اور اوس و خزرج کے درمیان قبائلی جنگوں ۷؎ نیز عرب و عجم اور بندہ و آقا کے درمیان طبقاتی جھڑپ کا باعث بنا ۸؎۔ یہاں تک کہ انہیں اپنے آخری لمحات میں اپنے غلط اصول کے بُرے نتائج کا احساس ہوا لہٰذا دوبارہ مساوات کے اسلامی اصول کی طرف لوٹنے کے عزم کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اگر میں اس سال زندہ رہا تو لوگوں میں مساوات برقرار کروں گا۔ سرخ کو سیاہ پر اور عربی کو عجمی پر ترجیح نہ دوں گا اور وہی کروں گا جو رسول اللہؐ اور ابوبکر نے کیا تھا" ۹؎۔

(۳) شوریٰ

اس سے مراد حضرت عمر کا وہ طریقۂ کار ہے جس کے تحت انہوں نے قریش کے چھ افراد کو منتخب کیا اور ان کو امت کے سامنے خلیفہ کا انتخاب کرنے والی کمیٹی کی صورت میں پیش کیا۔۱۰۔

حضرت عمر کی اس نئی ایجاد نے قریش کے چیدہ چیدہ افراد' ان کے قبائل اور حامیوں کے دلوں میں سیاسی اغراض کا ایسا بیج بویا جس کا انہوں نے خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ حضرت عمر نے جن لوگوں کو منتخب کیا ہے ان میں بعض کو ان کے نزدیک کوئی فضیلت حاصل نہ تھی۔ بلکہ گاہے وہ خود بہت سے امور میں ان سے افضل تھے۔ ان اغراض کو تقویت اس وقت ملی جب حضرت علیؑ (جن کو مسلمانوں کی اکثریت قبول کرتی تھی) کو خلافت سے محروم کیا گیا اور اسے حضرت عثمان کے حوالے کیا گیا۔ جنہیں اشرافِ قریش کی حمایت حاصل تھی۔

اس سے پہلے عبدالرحمان بن عوف خلافت سے دستبردار ہوئے تاکہ اس طرح خلافت عثمان اور علیؑ کے درمیان منحصر ہو۔ اور ان میں سے کسی ایک کو منتخب کیا جائے۔ لہٰذا انہوں نے علیؑ سے درخواست کی کہ آپؑ کتابِ خدا' سنتِ رسولؐ اور سیرتِ شیخین پر چلنے کا عہد کریں (تو خلافت آپؑ کے سپرد کردی جائے گی) لیکن حضرت علیؑ نے فرمایا کہ ہرگز نہیں' ہاں میں اپنی دانست کے مطابق جدوجہد کروں گا۔ اس انکار کے بعد عبدالرحمان بن عوف نے حضرت عثمان سے بالکل وہی مطالبہ کیا جو علی علیہ السلام سے کیا تھا۔ مطالبہ سنتے ہی حضرت عثمان

نے ہاں کر دی۔ پس ان کی بیعت ہو گئی۔ یوں خلافت حضرت عثمان کے حصہ میں آئی۔ ۱۱

حضرت علیؑ نے اس نتیجے سے اپنی ناخوشی کو ان الفاظ میں بیان فرمایا۔

"اگر مسئلہ فقط میرے اوپر ہونے والے ستم کا ہو لیکن مسلمانوں کے امور سلامت رہیں تو میں خاموش اور راضی برضا رہوں گا"۔ ۱۲

شوریٰ کا نتیجہ یہ نکلا کہ امت کے اندر ذاتی تعلقات کی بنیادوں پر مفاد پرستوں کی جانب سے مختلف احزاب اور پارٹیاں وجود میں آگئیں، تاکہ اقتدار تک رسائی ہو۔ اس سلسلے میں انہوں نے حضرت عثمان اور ان کے والیوں اور مشیروں کے خلاف شکایات اور نفرت انگیزی سے بھی استفادہ کیا۔ ساتھ ساتھ دوسرے عوامل (مثلاً حضرت عثمان کی انتظامی، سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی پالیسیوں) نے بھی اپنا اثر دکھایا۔ ان تمام اسباب کا نتیجہ عوامی شورش اور حضرت عثمان کے قتل کی صورت میں منظرِ عام پر آیا۔

حضرت عثمان کے خلاف بغاوت اور حضرت علیؑ کا موقف

قتلِ عثمان تک کے حالات و حوادث اور ان کے تاریخی تسلسل کا گہرا مطالعہ کرنے والا شخص اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ان کے خلاف یہ شورش اور عوامی غیظ و غضب احمقانہ اور غیرمدبرانہ عمل نہ تھا۔ بلکہ انقلابیوں نے اپنے نمائندوں کے ذریعے بارہا کوشش کی تھی کہ حکومت اور صاحبانِ اقتدار تک رسائی ہو اور خلیفہ کو حکومت کی غلطیوں اور ان کی اصلاح کی ضرورت کے بارے میں خبردار کریں۔ مدینہ میں خلیفہ کے پاس مختلف علاقوں سے وفود اپنے مطالبات لے کر بار

بار آتے رہے لیکن یہ وفود ہر بار ناکام لوٹتے اور ان کے ساتھ سختی اور بے توجہی برتی جاتی۔

ادہر امام علیؑ انقلابیوں اور خلیفہ کے درمیان ثالثی فرماتے رہے۔ خلیفہ نے ان سے وعدے بھی کئے ـــــ لیکن آخر کار مصری وفد کے ساتھ ایک ناخوشگوار واقعہ رونما ہوا۔ ہوا یوں کہ مصر سے مطالبات لے کر آنے والا وفد واپس جانے کے لئے مدینہ سے نکلا ہی تھا کہ مرکزی حکومت نے حاکمِ مصر کو خط لکھا کہ وہ ارکانِ وفد کو گرفتار کرلے۔ وفد کے ارکان کو اس بات کا علم ہوگیا اور وہ غیظ و غضب کی حالت میں مدینہ واپس آگئے اور شدومد سے اپنے مطالبات دہرانے لگے۔ وہ اپنے برافروختہ جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکے اور حکومت کے اس احمقانہ سلوک پر مشتعل ہوکر سراپا احتجاج بن گئے۔ اور حکومت کے مظالم کی روک تھام کا مطالبہ کرنے لگے۔ ان کے مطالبات مندرجہ ذیل تھے۔

- ☆ بیت المال اور وظائف کی تقسیم مساوات اور برابری کی بنیاد پر کی جائے۔ جس طرح رسول اللہؐ کے عہد میں تھا۔ اور تقسیم کے اس امتیازی طریقہ کو ختم کیا جائے جس کی بنیاد حضرت عمر نے رکھی تھی۔
- ☆ حکمران طبقے کی تطہیر اور چھانٹی کی جائے خصوصاً مروان بن حکم اور اس کے چیلوں کو ہٹایا جائے جو حکومت کو اپنی مرضی سے چلا رہے تھے۔
- ☆ قریش کی ناجائز خواہشات کا سختی سے مقابلہ کیا جائے (جن کو دولت اور عہدوں کے لحاظ سے ناجائز امتیازات حاصل تھے) اور ان کو ایک حد کے اندر رکھا جائے۔
- ☆ والیوں کے ہاتھوں عوام کی تذلیل اور ہتکِ حرمت کی روک تھام کی

جائے۔ جس طرح حضرت ابوذرؓ کے ساتھ ذلت آمیز سلوک روا رکھا گیا تھا جب کہ آپؓ نے حکومت کی انحرافی روش پر تنقید کی تھی۔

☆ والیوں اور حاکموں کے اختیارات کو محدود کیا جائے تاکہ وہ خراج اور عام لوگوں کی دولت پر دست درازی نہ کر سکیں۔

یہ مطالبے خلیفہ تک پہنچائے گئے لیکن انہوں نے کچھ بھی نہ کیا اور ان سے مکمل چشم پوشی کر کے حالات کو مزید بگڑنے اور جنگل کی آگ کی طرح شعلہ ور ہونے دیا۔

امام علیؑ کو حالات کے نتائج سے خطرہ محسوس ہوا لہٰذا آپؑ نے فوراً خلیفہ سے ملاقات کی اور فرمایا۔

"لوگ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور تمہاری شکایت کرتے ہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سے کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔ کیونکہ کوئی بات ایسی نہیں جو تم سے پوشیدہ ہو اور ہم اسے جانتے ہوں۔ کوئی امر ایسا نہیں جس میں تمہیں میری رہنمائی کی ضرورت ہو، تمہیں ہر اس چیز کی اطلاع ہے جو ہمیں معلوم ہے۔ جہاں ہماری پہنچ ہے وہاں تمہاری ہم سے پہلے پہنچ ہے۔

ان لوگوں نے ہمارے ساتھ کوئی خفیہ بات نہیں کی جسے ہم تم تک پہنچائیں۔ کوئی بات ایسی نہیں جو ہم سے مخصوص ہو اور تمہیں اس کا علم نہ ہو۔ پس اپنے بارے میں خدا سے ڈرو۔ کیونکہ بتحقیق تم پہلے ہی سب کچھ جانتے ہو اور اب کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ بے شک راستہ واضح اور صاف ہے۔"

آپؑ نے حضرت عثمان سے یہ بھی فرمایا۔

"تحقیق معاویہ تم سے پوچھے بغیر جو چاہے کرتا ہے۔ اور تمہیں ان سب کا علم بھی ہے۔ طرّہ یہ کہ معاویہ کہتا ہے کہ میں جو کرتا ہوں عثمان کے حکم سے کرتا ہوں لیکن تم معاویہ کی گوشمالی نہیں کرتے۔"

حضرت عثمان بھی کبھی کبھی امامؑ کی نصیحتوں کو مان لیتے تھے اور اصلاح کا عزم بھی کرلیتے تھے لیکن جلد ہی مختلف بہانہ تراشیاں شروع کردیتے اور کسی وعدے پر قائم نہ رہتے۔ حضرت عثمان کے تردد کے بارے میں حضرت علیؑ نے فرمایا کہ۔

"عثمان یہ چاہتا ہے کہ کوئی اس کو نصیحت نہ کرے۔ اس نے دھوکہ بازوں کو اپنے گرد جمع کررکھا ہے۔ جن میں سے ہر ایک نے مخصوص زمینوں پر قبضہ جمایا ہوا ہے جن کا خراج وہ کھا جاتے ہیں اور وہاں کے عوام کو ذلیل وخوار بنائے رکھتے ہیں"۔ ۱۳۱

عمرو بن عاص کھلے عام عثمانی سیاست کے خلاف لوگوں کو اکساتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے بارے میں کہا۔ میرا نام ابو عبداللہ ہے اگر مجھے موقع ملے تو میں اس کے خلاف اقدام کروں گا اور اگر میری ملاقات کسی چرواہے سے بھی ہوجائے تو اسے بھی عثمان کے خلاف اکساؤں گا۔

ادھر حضرت عائشہ نے بھی اپنے خطبوں میں خلیفہ کو بُرا بھلا کہا۔ وہ لوگوں کو نبی کریمؐ کی قمیض دکھاتیں اور کہتی تھیں کہ "یہ نبیؐ کی قمیض ہے جس کے بوسیدہ ہونے سے پہلے آپؐ کی سنت متروک اور پرانی ہوگئی۔"

ادھر طلحہ و زبیر عثمان کا محاصرہ کرنے کے لئے شورشیوں کی مالی مدد کررہے

تھے۔

ہر طرف سے آنے والے شورشی ہنگامہ بپا کرتے تھے۔ اور غیظ و غضب کے ساتھ اشتعال کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ان انقلابیوں اور شورشیوں کے مقابلے میں حضرت علیؑ کا موقف آگ بجھانے والوں کی طرح تھا۔ آپؑ کی پوری کوشش تھی کہ ان کا جوش و خروش کم ہو اور شورش کی آگ بجھ جائے۔ لیکن ادھر حضرت عثمان نے فقط اتنا کیا کہ انقلابیوں سے فیصلہ کن ملاقات کے لئے تین دن کی مہلت مانگی۔ جب یہ مدت پوری ہو گئی تو لوگوں کا جمِ غفیر حضرت عثمان کے دروازے پر جمع ہو گیا۔ خلیفہ کی طرف سے مروان بن حکم باہر آیا اور مجمع سے ایسا خطاب کیا جو احمقانہ اور متکبرانہ جملوں سے بھرپور تھا۔ کہا:

"لوگو تم کیوں جمع ہوئے ہو؟
گویا غارت گری چاہتے ہو؟
خدا تمہارے چہروں کو مسخ کردے' ہر کوئی اپنے ساتھی کو پکڑ کر لے آیا ہے۔ کیا اس لئے آئے ہو کہ ہماری دولت کو ہم سے چھین لو؟
دور ہو جاؤ۔ خدا کی قسم اگر ہمارے ساتھ کوئی بُرا سلوک ہوا تو تمہیں اس کی تلخی چکھنی پڑے گی۔
اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ۔ خدا کی قسم جو چیز ہمارے پاس ہے اسے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

یہ فتنہ انگیز تقریر انقلاب کے لئے بارود کی بتی ثابت ہوئی۔ اس وقت حضرت عثمان نے فوراً حضرت علیؑ کو بلا بھیجا لیکن آپؑ نے آنے سے انکار کر دیا اور فرمایا۔

"تحقیق میں نے عثمان کو بتا دیا تھا کہ دوبارہ نہیں آؤں گا"۔ ۱۴۱

اس کی وجہ یہ تھی کہ علیؑ پر مروان کی گفتگو ناگوار گزری تھی۔ جب وہ ناقابلِ تحمل، جوشیلے اور احمقانہ انداز میں خلیفہ کی طرف سے اچانک عوام کے اجتماع پر پھٹ پڑا۔ نیز آپؑ نے اندازہ کرلیا تھا کہ آپؑ کی وساطت فائدہ نہ دے گی۔ آپؑ مطمئن تھے کہ عثمان عوامی دباؤ میں آکر ان کے مطالبے تسلیم کرلیں گے اور مروان اور اس کے ٹولے کو برطرف کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن خلیفہ کی طرف سے کچھ بھی نہ ہوا۔ بلکہ مجموعی طور پر حالات ایسا رخ اختیار کرتے چلے گئے کہ انقلاب ناگزیر ہوگیا۔ اور تاریخِ اسلام کا ناقابلِ فراموش المیہ عروج کو پہنچا اور یہ شورش حضرت عثمان کے قتل پر منتج ہوئی۔

قبولِ حکومت میں امام کا موقف

قتلِ عثمان کے بعد منصبِ خلافت کے لئے عوام کی نظریں امام علیؑ پر مرکوز تھیں۔ لہٰذا انہوں نے آپؑ سے حکومت سنبھالنے کا مطالبہ کیا۔ لیکن آپؑ نے انکار فرمایا۔ یہ انکار اس بنا پر نہ تھا کہ آپؑ اپنے اندر حکومت سنبھالنے اور اس کی سختیوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں پاتے تھے۔ خاص کر ان حالات میں جب کہ آپؑ دیکھ رہے تھے کہ اسلامی معاشرہ عثمانی دور کے والیوں کی غلط پالیسیوں کے نتیجے میں اجتماعی و اقتصادی انحطاط اور انتشار و افتراق کے گڑھے میں گر رہا ہے۔ اور نبیؐ کی وفات کے بعد اب اسلامی تعلیمات لوگوں کی رہنمائی میں بے اثر ثابت ہو رہی ہیں۔

امت کی اس بدحالی کی وجہ یہ تھی کہ ان کو حکومتِ وقت پر اعتماد نہ رہا تھا۔

اس لئے اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے ان کو بذاتِ خود اقدام کرنا پڑا۔ یوں عوام کا رشتہ ان معنوی حقائق سے کٹ گیا جن کے مطابق ان کو زندگی گزارنی تھی۔ اس خرابی کے ازالے کی راہ ان کو یہ نظر آئی کہ وہ لوگوں کو یہ سمجھائیں کہ ایک صحیح حکومت ہی لوگوں کے اعتماد کو بحال کر سکتی ہے۔ لیکن یہ کام آسان اور جلد نتیجہ تک پہنچنے والا نہ تھا کیونکہ بعض ہوشیار گروہ اس کام کے مخالف تھے۔ اس لئے وہ ہر اصلاحی روش کا مقابلہ کرتے تھے۔

امتِ مسلمہ کو درپیش اجتماعی اور نفسیاتی حالات پر اپنی گہری نظر کی بدولت اور اس انقلابی طوفان کے پیشِ نظر جو حضرت عثمان کے قتل پر منتج ہوا۔ امام علیؑ کو علم تھا کہ اسلامی معاشرے میں اقتصادی، اجتماعی اور سیاسی نقطۂ نظر سے ایک بنیادی اور انقلابی و اصلاحی عمل کی ضرورت ہے ؂۱۵۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر امامؑ نے عوام اور اصحاب کے دباؤ کے باوجود فوری طور پر حکومت قبول کرنے سے انکار کیا۔ آپؑ عوام کو پرکھنا چاہتے تھے کہ وہ کس حد تک آپؑ کے انقلابی و اصلاحی عمل کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ تاکہ بعد میں خرابیوں کی اصلاح کی راہ میں موجود سختیاں دیکھ کر لوگ یہ نہ سمجھیں کہ آپؑ نے ان کو اندھیرے میں رکھا اور ان کے جوش و جذبے سے غلط فائدہ اٹھایا ہے ؂۱۶۔ اس لئے آپؑ نے ان کو یہ جواب دیا۔

"مجھے چھوڑ دو اور اس (خلافت کے لئے) میرے علاوہ کسی اور کو ڈھونڈ لو۔ ہمارے سامنے ایک ایسا معاملہ ہے جس کے کئی رخ اور کئی رنگ ہیں۔ جسے نہ دل برداشت کر سکتے ہیں اور نہ عقلیں اسے مان سکتی ہیں۔ (دیکھو افقِ عالم پر گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ راستہ پہچاننے میں نہیں

آتا۔) تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اگر میں تمہاری اس خواہش کو مان لوں تو تمہیں اس راستے پر لے کر چلوں گا جو میں مناسب سمجھوں گا اور اس بارے میں کسی کہنے والے کی بات اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کو نہ سنوں گا اور اگر تم میرا پیچھا چھوڑ دو تو پھر میں تمہاری ہی طرح زندگی گزاروں گا اور ہو سکتا ہے کہ جسے تم اپنا امیر بناؤ اس کی میں تم سے زیادہ بات سنوں اور مانوں۔ اور میرا (تمہارے دنیوی مفاد کے لئے) امیر ہونے سے وزیر ہونا بہتر ہے" ۱۷ے۔

لیکن لوگوں کا اصرار بڑھتا گیا اور آخرکار آپؑ نے حکومت قبول کرلی۔

حضرت علیؑ منصبِ خلافت پر

امامؑ نے ایسے معاشرے کی حکومت سنبھالی جسے فتنہ و فساد ورثے میں ملا تھا اور ہر سطح پر متعدد پیچیدہ مشکلات آپؑ کی منتظر تھیں۔ پس آپؑ نے لوگوں کو اپنی اس جدید اصلاحی اور انقلابی پالیسی سے آگاہ کیا جس کو اپنانے کا آپؑ نے فیصلہ کیا تھا۔ تاکہ وہ مقاصد حاصل ہوں جن کے لئے آپؑ نے حکومت سنبھالی تھی۔

آپؑ نے اپنی انقلابی پالیسی کو تین میدانوں میں چلانا تھا۔

(۱) قانونی میدان میں۔

(۲) مالی میدان میں۔

(۳) انتظامی میدان میں۔

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ امامؑ کی سیاست اور اصلاحی پالیسیوں کے خلاف زبردست شکوک و شبہات پھیلائے گئے اور ان کے بارے میں بغیر سوچے سمجھے

غلط فیصلے کئے گئے۔ یہاں تک کہ کتبِ تاریخ میں بھی ان کا تذکرہ ہوا اور تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں نے یہاں بحث و تحقیق کو ضروری نہ سمجھا اور ان باتوں کو مسلّمہ سمجھ لیا۔ خصوصاً آپؑ کی انتظامی پالیسی کے بارے میں مغالطے پر مبنی مختلف فیصلوں اور رنگ برنگی آراء کی کمی نہیں۔ قانونی اور مالی میدانوں میں بحث سے فارغ ہونے کے بعد ہم اس مسئلے پر تفصیلی گہری اور تحلیلی و تجزیاتی گفتگو کریں گے۔ تاکہ اس طرح سے حقیقت سامنے آسکے۔

(۱) قانونی میدان

اس میدان میں آپؑ کی اصلاحات میں سرِفہرست بیت المال اور وظائف کی تقسیم میں امتیازی سلوک کو ختم کرنا اور برابری کے اصول کو دوبارہ نافذ کرنا تھا۔ جس کے تحت سارے مسلمان اپنے حقوق اور فرائض میں مساوی تھے۔ اس سلسلے میں آپؑ نے فرمایا تھا۔

"پسا ہوا میرے نزدیک آبرومند ہے جب تک میں اسے اس کا حق نہ دلوادوں اور طاقتور میرے یہاں کمزور ہے جب تک کہ میں اس سے دوسرے کا حق نہ دلوادوں" ۱۸؎۔

(۲) مالی میدان

اس میدان میں آپؑ نے دو نکتوں کی طرف خصوصی توجہ دی۔

ایک حضرت عثمان کے دور میں جمع ہونے والے ناجائز اموال کی طرف۔

دوسرے تقسیمِ اموال میں امتیازی سلوک کی طرف۔

یہاں تک کہ امامؑ نے حضرت عثمان کی طرف سے طبقۂ اشراف کو دی گئی

تمام جاگیروں، زمینوں اور بے شمار اموال کو ضبط کرلیا۔ اور اپنی مالی پالیسی کا یوں اظہار فرمایا۔

"لوگو ! میں بھی تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں۔ میرے پاس اتنا ہی ہے جتنا تمہارے پاس۔ میں بھی اسی طرح ذمہ دار ہوں جس طرح تم۔ میں تمہیں نبیؐ کی راہ و روش پر لے کر چلنے والا اور اس کے احکام کو تمہارے درمیان نافذ کرنے والا ہوں۔ خبردار! ہر وہ جاگیر یا زمین یا اموال جو عثمان نے مالِ خدا سے لوگوں کو دیا ہے وہ بیت المال کے حق میں واپس لیا جاتا ہے، کیونکہ حق کو کوئی چیز باطل نہیں کرتی۔

خواہ کسی نے اس مال سے شادی کی ہو یا لونڈی خریدی ہو یا اس پیسے کو خرچ کرکے مختلف علاقوں میں پھیلا دیا ہو۔ بہرصورت میں ان اموال کو واپس لوں گا۔ کیونکہ عدل میں وسعت اور راحت ہے۔ جو شخص عدل میں تنگی محسوس کرے وہ جان لے کہ ظلم میں اس کے لئے زیادہ تنگی ہے"۔ ۱۹۰۔

شاید متموّل طبقہ نے حضرت علیؑ سے سودے بازی کا سوچ رکھا تھا۔ وہ اس طرح سے کہ وہ آپؑ کی اطاعت کریں اور آپؑ جواباً ان کے اموال اور سابقہ اموال سے چشم پوشی فرمائیں۔ اس لئے انہوں نے ولید بن عقبہ بن ابی معیط کو آپؑ کی خدمت میں بھیجا۔ اس نے عرض کیا۔

"اے ابالحسنؑ آپؑ نے تو ہم کو سخت نقصان پہنچایا۔ جب کہ ہم آپؑ کی طرح عبدِ مناف کی اولاد سے ہیں اور آپس میں بھائی بھائی۔ ہم آج آپؑ کی بیعت کرتے ہیں بشرطیکہ آپؑ عہدِ عثمانی میں حاصل شدہ اموال

کو ہمارے پاس ہی رہنے دیں اور عثمان کے قاتلوں کو سزائے موت دیں۔ اگر ہمیں آپ سے خطرہ ہوا تو آپؑ کو چھوڑ کر معاویہ سے جا ملیں گے"۔۲۰۔

لیکن امام علیؑ نے اپنے ایک خطبے میں ان کے لئے واضح کر دیا کہ آپؑ رسول اللہؐ کی روش کو زندہ رکھیں گے۔ فرمایا :

"رہا یہ (مالِ غنیمت وغیرہ) تو اس میں کسی کو دوسرے پر ترجیح حاصل نہیں۔ اس کی تقسیم بندی خدا نے کر رکھی ہے۔ یہ مالِ خدا ہے اور تم خدا کے مسلمان بندے اور یہ خدا کی وہ کتاب ہے جس کا ہم نے اقرار کیا ہے اور اسے ہم نے تسلیم کیا ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے نبیؐ کی وصیت ہمارے سامنے ہے۔ پس جو کوئی اس سے راضی نہ ہو تو جو چاہے سو کرے"۔۲۱۔

(۳) انتظامی میدان

اس میدان میں آپؑ نے دو کام کئے۔

(الف) عثمانی عہد کے والیوں کی معزولی۔ اس بارے میں فرمایا۔

"مجھے اس بات سے دکھ ہوتا ہے کہ اس امت کی باگ ڈور احمقوں اور فاجروں کے ہاتھوں میں رہے اور وہ اللہ کے مال کو اپنی املاک اور اس کے بندوں کو اپنا غلام بنالیں، نیکوں سے برسرِ پیکار رہیں اور بدکرداروں کو اپنے جتھے میں رکھیں۔ کیونکہ ان میں سے بعض کو تم دیکھ چکے ہو کہ ان میں وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے شراب نوشی کی اور جنہیں اسلامی حد

کے سلسلہ میں کوڑے لگائے گئے۔ اور ان میں ایسا شخص بھی ہے جو اس وقت تک اسلام نہ لایا جب تک اس کو عطیات نہیں ملے"۔ ۲۲۔

بے شک خود حضرت عثمان ان لوگوں کے قریب ہوئے جنہیں رسولؐ نے جلاوطن کیا تھا۔ بتحقیق عثمان اپنے چچا حکم بن امیہ کو مدینہ واپس لے آئے۔ جب کہ رسولِ خداؐ نے اس کو نکال دیا تھا اور وہ طریدِ رسول اللہؐ کے نام سے معروف تھا۔ نیز خود حضرت عثمان نے عبداللہ بن ابی سرح کو پناہ دی اور اسے والیٔ مصر بنایا۔ جبکہ رسولؐ نے اس کے خون کو مباح قرار دیا تھا۔ اس طرح عبداللہ بن عامر کو بصرہ کا گورنر بنایا جس نے وہاں وہ گل کھلائے کہ مومنین اس سے متنفر ہوئے۔ ۲۳۔

(ب) ان لوگوں کو والی بنایا جو دین دار، پاکدامن اور ارادے کے پکے تھے۔ کیونکہ آپؑ نے دیکھ لیا تھا کہ شکایات کی سب سے بڑی وجہ یہی امراء و حکام ہیں۔ اسی بناء پر آپؑ نے پرانی تقرریوں کو بدلنے کے لئے فوری اقدام اٹھایا۔ یوں عثمان بن حنیف کو بصرہ کا، سہل بن حنیف کو شام کا، قیس بن سعد بن عبادہ کو مصر کا اور ابو موسیٰ اشعری کو کوفہ کا والی بنایا۔ یہ علاقے اس وقت کے اہم صوبے تھے۔

بہت سے لوگوں نے اس سلسلے میں آپؑ سے گفتگو کی۔ جن میں سے ایک مغیرہ بن شعبہ تھا۔ اس نے عہدِ عثمانی کے والیوں کو برقرار رکھنے کی استدعا کی لیکن آپؑ نے انکار میں جواب دیا اور عثمانی والیوں کو معزول کیا۔ نیز طلحہ و زبیر کے ساتھ کوفہ و بصرہ کی امارت کے مسئلہ پر بھی ایسا ہی سلوک کیا، ان کو نرمی سے منفی جواب دیا۔ لیکن ان لوگوں نے امامؑ پر دباؤ بڑھا دیا اور آپؑ کی خلافت کے

بارے میں شکوک و شبہات پھیلانے شروع کردیئے۔ دونوں نے آپؑ کی بیعت توڑ ڈالی اور آپؑ سے خونِ عثمان کے بدلے کا اعلانیہ مطالبہ کرنے لگے اور اس بات کو بھول گئے کہ وہ خود حضرت عثمان کے خلاف لوگوں کو اکسانے والوں میں سے تھے۔ یہ لوگ اس حد تک پہنچ گئے کہ امرِ خلافت کو دوبارہ کسی شوریٰ کی صوابدید پر چھوڑنے کا مطالبہ کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ان دونوں نے جبراً بیعت کی تھی اس لئے وہ صحیح نہ تھی۔ ۲۴۔

طلحہ و زبیر کو بصرہ و کوفہ کی حکومت نہ دینے میں امیرالمومنینؑ کا موقف واضح ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ آپؑ کا یہ عمل سیاسی کوتاہ بینی پر مبنی تھا۔ طلحہ و زبیر کے بارے میں آپؑ کا موقف درجِ ذیل چار صورتوں سے خالی نہیں رہ سکتا تھا۔ جن میں سے ہر صورت کا مستقبل آپؑ کے اختیار کردہ موقف کے مقابلے میں زیادہ مضر تھا۔ ۲۵۔

پہلی صورت

پہلی صورت یہ تھی کہ ان دونوں کو کوفہ و بصرہ کا والی بنا دیتے۔ جیسا کہ ابنِ عباس کا موقف یہی تھا۔ لیکن آپؑ کو اس سے اتفاق نہ تھا کیونکہ بصرہ و کوفہ آبادی اور اموال سے مالامال تھے۔ اگر ان دونوں کو وہاں حکومت مل جاتی تو وہ کم عقلوں کو لالچ سے اپنا بنا لیتے، کمزوروں کو مختلف مشکلات میں پھنسا دیتے، طاقتوروں پر طاقت کے زور سے غلبہ پاتے اور آپؑ کے خلاف بغاوت کرنے کی بہتر پوزیشن میں ہوتے۔ لیکن اگر ان کے پاس گورنری نہ ہوتی تو انہیں ایسا کرنے کا موقع نہ ملتا۔

دوسری صورت

دوسری صورت یہ تھی کہ امامؑ ان دونوں کو جدا کردیتے تاکہ وہ کسی کام پر متفق نہ ہونے پائیں۔ وہ اس طرح کہ ایک کو حکومت دیتے اور دوسرے کو اس سے محروم رکھتے۔ اس صورت میں جس کو حکومت مل جاتی اس کے بغاوت نہ کرنے کی کوئی ضمانت نہ تھی اور جس کو محروم کرتے اس کے بھاگ جانے کا خطرہ تھا۔ (جس طرح پہلے بھی معاویہ سے سودے بازی کے لئے ایک شخص شام بھاگ گیا تھا) اور نہ بھاگنے کی صورت میں پوشیدہ دشمنی اور کینے کا خطرہ تھا۔

تیسری صورت

تیسری صورت یہ تھی کہ جب انہوں نے مکہ جانے کی اجازت مانگی تھی تو جانے نہ دیتے اور دونوں کو گرفتار کرلیتے۔ یاد رہے کہ وہ دونوں وہاں (مکہ) سے بصرہ چلے گئے تھے۔ تاکہ آپؑ پر حملہ آور ہوں۔

اور ان دونوں نے جب امیرالمومنینؑ سے عمرہ کے لئے مکہ جانے کی اجازت مانگی تھی تو آپؑ کو حقیقت کا علم تھا۔ اسی لئے فرمایا تھا کہ "تم دونوں عمرہ نہیں چاہتے بلکہ بغاوت کے لئے جانا چاہتے ہو۔"

گمانِ غالب یہی ہے کہ اگر آپؑ ان کو گرفتار کرلیتے تو اس سے آپؑ کے خلاف لوگوں کے جذبات بھڑک اٹھتے اور ان دونوں کا جرم ثابت ہونے سے پہلے ہی ان کی گرفتاری سے لوگ رنجیدہ خاطر ہوتے۔ بلکہ اس اقدام سے آپؑ کے مددگاروں کے دلوں میں بھی شکوک و شبہات پیدا ہوتے۔

امامؑ پر کئے جانے والے بے بنیاد اور غیر معقول اعتراضات میں سے ایک

اعتراض آپؑ کی انتظامی پالیسی خصوصاً والیٔ شام معاویہ کی برطرفی اور جنگِ صفین میں تحکیم پر راضی ہونے پر کیا جاتا ہے۔ لیکن واضح ہے کہ آپؑ نے تحکیم کو اس وقت قبول کیا جب آپؑ کی فوجوں نے جنگ سے ہاتھ روک لیا تھا۔ اور اندرونی اختلافات تحکیم قبول کرنے والوں اور تحکیم سے انکار کرنے والوں کے درمیان جنگ کی حد تک پہنچ گئے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے خلیفۂ ثالث کی طرح آپؑ کو قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔ اور آپؑ کے گرد گھیرا ڈال کر زور ڈالنے لگے تھے کہ آپؑ مالکِ اشتر نخعی کو (جو میدانِ جنگ میں مردانہ وار مقابلہ کررہے تھے اور فتح کو قریب دیکھ رہے تھے) واپس بلالیں۔

رہے وہ لوگ جو تحکیم قبول کرنے میں تو آپؑ کے موقف کی حمایت کرتے ہیں لیکن ثالث کے طور پر ابو موسیٰ اشعری کے انتخاب کو (نعوذ باللہ) آپؑ کی خطا سمجھتے ہیں۔ تو واضح ہو کہ یہ لوگ یہ فراموش کردیتے ہیں کہ ابو موسیٰ اشعری کے انتخاب میں آپؑ اسی طرح مجبور تھے جس طرح تحکیم قبول کرنے میں۔ نیز ہر صورت میں نتیجہ یکساں تھا۔ خواہ ابو موسیٰ اشعری آپؑ کی نیابت کرتا یا مالکِ اشتر یا عبداللہ بن عباس۔ کیونکہ عمرو بن عاص کبھی معاویہ کو خلافت سے معزول کرکے حضرت علیؑ کی خلافت کا اقرار نہ کرتا۔ اگرچہ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ مالکِ اشتر یا عبداللہ بن عباس عمرو عاص کی رائے کو بدل کر اسے امام علیؑ کی خلافت کا قائل کرسکتے تھے۔ لیکن بغور مطالعہ کے بعد اس خیال پر اطمینان نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ معاویہ کو کوئی حقیقت کے تسلیم کرنے اور ہتھیار ڈالنے پر راضی نہ کرسکتا تھا۔ جب کہ معاویہ کے چاروں طرف اس کے حامی اور مفاد پرست لوگ بھی تھے۔ جن کے لئے اپنی ناکامی اور محرومی اسی طرح قابلِ قبول نہ

تھی جس طرح معاویہ کے لئے۔

بنا برایں اعتراض کرنے والے مورخین کے پاس آپؑ کے اس حل کے علاوہ جسے آپؑ نے مجبوراً قبول کیا تھا کوئی اور بہتر حل یا تجویز موجود نہیں۔ خواہ آپؑ نے فیصلے کی غلطی کا علم رکھنے کے باوجود اسے قبول کیا تھا۔ خواہ اس صورت اور دوسری صورتوں کو مساوی سمجھ کر۔

رہا آپؑ کا معاویہ کو معزول کرنا تو اس مسئلے نے مورخین اور ان کی تاریخوں کی توجہ کو ہمیشہ اپنی طرف مبذول رکھا ہے۔ یہاں تک کہ ان مورخین نے کہا ہے کہ "معاویہ عربوں کی تاریخی ضرورت تھا کیونکہ وہ جدید حکومت اور اس کی مرکزیت کا باعث بنا۔" مورخین نے معاویہ کو ایک عظیم حکمران' سیاست دان اور زیرک انسان قرار دیا ہے۔ جس نے ایک حقیقت پسندانہ اور ممتاز سیاست اپنائی۔ جس کے برعکس اس کے مدِمقابل (امام علیؑ) کی سیاست کو وہ محض اخلاقی مظاہر پر مبنی ایک تصوراتی سیاست سمجھتے ہیں۔

یہاں ہم سوال کرتے ہیں کہ کیا امامؑ کے لئے معاویہ کو شام کی حکومت پر برقرار رکھنا ممکن تھا؟ اور بصورتِ امکان کیا ایسا کرنا صحیح ہوتا؟

عباس محمود عقاد جواب دیتے ہیں کہ امامؑ کے لئے معاویہ کو حکومت پر باقی رکھنا دو وجوہات کی بناء پر ممکن نہ تھا۔ ایک تو آپؑ نے بارہا عثمان سے معاویہ کو معزول کرنے کے لئے کہا تھا۔ کیونکہ معاویہ اور اس جیسے دوسرے حکام عثمانی حکومت کے لئے خطرے کا جال تھے۔ اگر آپؑ معاویہ کو باقی رکھتے تو آپؑ کے حامیوں کا ردِّعمل کیا ہوتا اور لوگ کیا کہتے؟ بالفرض اگر آپؑ اپنے پہلے نظریے سے دستبردار ہوجاتے تو بھی کیا آپؑ ان انقلابیوں کے جذبات کو مجروح کرسکتے

تھے جنھوں نے آپؑ کی بیعت ہی اس لئے کی تھی کہ آپؑ حالات کو بدل دیں اور عثمانی حکومت کی جگہ ایک جدید عادلانہ حکومت کی بنیاد رکھیں۔

اگر ہم یہ فرض کر بھی لیں کہ آپؑ کے لئے معاویہ کو حکومت پر برقرار رکھنا کسی نہ کسی بہانے سے ممکن تھا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس صورت میں آپؑ کا یہ عمل توافق اور اتحاد کی برقراری کے لئے بہتر راستہ ہوتا؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ معاویہ شام میں ایک والی کی حیثیت سے نہیں رہ رہا تھا جو فقط ولایت پر اکتفا کرتا اور جسے زیادہ کی لالچ نہ ہوتی۔ بلکہ معاویہ تو وہاں ایک مطلق العنان حکمران کی طرح اپنے اور اپنی اولاد کے لئے حکومت کی بنیادیں مضبوط بنا رہا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے بااثر اور اہم شخصیات کو اپنے گرد جمع کیا اور ہر ممکنہ قیمت پر لوگوں کو حامی بنایا اور مدّتِ دراز تک حکومت کرنے کے لئے طاقت و ثروت جمع کی۔ وہ امامؑ سے مقابلہ کے لئے موقع کی تلاش میں تھا اور ظاہر ہے کہ کون سا بہانہ قتلِ عثمان اور قصاصِ عثمان کے بہانے سے بہتر ہو سکتا تھا۔۲۶

معاویہ کی کامیابی کا راز دھوکہ و فریب' سیاسی جوڑ توڑ میں یدِ طولیٰ رکھنے اور مختلف حیلوں کے استعمال (علیؑ جن کے قریب بھی نہ پھٹکتے تھے) کے سبب سے نہ تھا۔ بلکہ اس کی بنیادی وجہ امامؑ اور معاویہ کے اصولوں کا اختلاف نیز اتفاقات و حالاتِ زمانہ کا معاویہ کے لئے سازگار ہونا تھا۔

باہمی کشمکش میں امامؑ اور معاویہ کی پالیسیوں کی نوعیت

شروع ہی سے امامؑ (جو دعوتِ اسلامی کے علمبردار تھے) کے موقف اور معاویہ (جو انحرافی روش کی قیادت کر رہا تھا) کے موقف کی نوعیت کچھ ایسی تھی

جس کا قدرتی نتیجہ وہی تھا جو ان دونوں کے درمیان جنگ کی صورت میں سامنے آیا۔ ★

امامؑ اور معاویہ کی کشمکش کی نوعیت کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں درجِ ذیل قابلِ ذکر تاریخی نکات و قرائن کو مدِّ نظر رکھنا ہو گا۔

(الف) حالات کی پیچیدگیوں اور باہمی نزاع کے مقابلے میں امامؑ کے موقف کی نوعیت کا تقاضا یہی تھا کہ آپؑ معاویہ پر حملہ آور ہو کر اسے سیاسی میدان سے خارج کردیتے۔ پس امامؑ کا موقف حملہ تھا اور معاویہ کا دفاع۔

جب امامؑ نے اسلامی حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو آپؑ نے اپنے کاندھوں پر براہِ راست یہ ذمہ داری محسوس کی کہ بنی امیہ کی غیر شرعی بغاوت کو کچل دیں۔ کیونکہ یہ وہ لوگ تھے جو "طلقاء" یعنی آزاد شدگان کے نام سے معروف تھے اور جنہوں نے شام کی حکومت پر (ناجائز) قبضہ کر رکھا تھا۔ بنی امیہ کی روش اسلام کے مقابلے میں ہمیشہ مخاصمانہ رہی تھی۔ یہ لوگ یا تو جان کے خوف سے مسلمان ہوئے تھے یا نفاق کی بناء پر۔ ۲۷

★ یہاں ہمیں بعض لوگوں کی ان آراء پر تعجب ہوتا ہے اور افسوس بھی جن پر انہوں نے علمی عظمت اور روشن فکری کا رنگ چڑھایا ہے تاکہ اس کی روشنی میں اپنے تئیں اس تاریخی کشمکش کی تصویر کشی کریں اور کہیں کہ "وہ دور تشکیلِ حکومت کا دور تھا اور یہ کہ معاویہ ایک زود فہم سیاستدان تھا جس نے ایسی حقیقت پر مبنی سیاست اپنائی جو دولتِ اسلامی کی بنیاد رکھنے کے لئے ضروری تھی لیکن اس کے دشمنوں (یعنی معاشرتی عدل و انصاف اور عظمتِ انسانی کی طرف دعوت دینے والوں) نے ایک ناقابلِ عمل اور تصوراتی سیاست اپنائی۔" لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اموی حکومت دیرپا ثابت نہیں ہوئی اور انقلابیوں کے ہاتھوں زمین بوس ہو گئی۔

خلاصہ یہ کہ امتِ مسلمہ کے بدن سے فتنہ و فساد کے ناسور کا ازالہ حضرت علیؑ کے سامنے بنیادی اہمیت کا حامل اور فوری اقدام کا طالب امر تھا۔

جب آپؑ نے کوفے میں اپنے دارالحکومت کی بنیاد رکھی اور عوامی مقبولیت و حمایت حاصل کی تو آپؑ کا پہلا سیاسی مطمع نظر اس عوامی حمایت کو مضبوط و منظم بنانا تھا۔ تاکہ اس کے بعد معاویہ کے غیر اسلامی اقدامات سے امتِ مسلمہ کے درمیان پڑنے والے اختلافات کو ختم کیا جاسکے۔

سیاسی تطہیر کے عمل کی منصوبہ بندی کا تقاضا یہ تھا کہ امامؑ معاویہ پر حملہ کرنے میں پہل فرماتے۔ اپنی حامی عوامی قوت کو حرکت میں لاتے اور لوگوں کو حکم دیتے کہ وہ راہِ خدا میں اپنے وطن سے نکلیں تاکہ اس انحرافی بحران سے نمٹا جاسکے جو معاویہ اور بنی امیہ کے ہاتھوں غیر شرعی طور پر امتِ مسلمہ کے (دو حصوں میں) بٹ جانے کی صورت میں ظاہر ہوا تھا اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کا سرحدی علاقہ (شام) علیحدگی پسندوں کا مرکز بن چکا تھا۔

اس کے برعکس معاویہ کی پوزیشن کچھ اور تھی۔ وہ راہِ خدا میں جہاد یا حملہ کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا بلکہ اسے فقط اس بات کی فکر تھی کہ کسی نہ کسی طرح شام اس کے قبضے میں رہے اور مرکزی حکومت سے شام کی جدائی کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جاسکے۔

اس کے علاوہ ہمیں اس عظیم تفاوت کو بھی سمجھنا چاہئے جس سے امامؑ اور معاویہ کی پالیسیوں کے درمیان موجود بنیادی فرق واضح ہوتا ہے اور باہمی کشمکش کی نوعیت پر اس کا اثر بھی روشن ہوتا ہے۔ ان دو قائدین کے درمیان موجود عظیم تفاوت صاف ظاہر ہے جن میں سے ایک اپنی فوج کو محض رضائے الٰہی کی

خاطر دشمن پر حملہ آور ہونے کے لئے اپنا گھربار چھوڑنے کا حکم دیتا ہے اور احیاء تعالیم اسلامی کے علاوہ اس کے پیشِ نظر کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا۔ کیونکہ شام کی علیحدگی سے عراقیوں کے مفادات کو کوئی زک نہ پہنچتی تھی اور وہ شامیوں سے ان کے فقط شامی ہونے کی بنا پر کوئی رنجش نہ رکھتے تھے۔ وہ تو محض دین اور اس کے انسانی تقاضوں کے پیشِ نظر جنگ لڑ رہے تھے۔ وہ صورتِ حال کی حقیقت اور اس کے مختلف پہلوؤں سے عمیق آگاہی رکھتے تھے یہاں تک کہ اس مشن کی راہ میں جان و مال کی قربانی سے دریغ نہ کرنے کی منزل پر پہنچ گئے تھے۔

اس کے برعکس معاویہ کے منصوبے میں اس قسم کی فداکاری کو دخل نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی فوج کو نہ ہی عراق پر قبضہ کرنے اور نہ ہی ریاستِ اسلامی کے دیگر حصوں سے جنگ لڑنے کے لئے کہا۔ معاویہ تو بس شامیوں کو آزادی و خودمختاری کی امید دلا رہا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ مستقبل میں اپنے لئے شام میں اسلامی مملکت کی قیادت کو مستحکم بنانے کا خواہاں تھا۔

ادھر امامؑ کے ساتھیوں اور آپؑ کی رکاب میں لڑنے والوں کی ایک بڑی تعداد بیدار مغز یا نیم آگاہ افراد پر مشتمل تھی۔ یہی وہ لوگ تھے جو آغازِ کار ہی سے آپؑ کے مشن پر لبیک کہتے آئے تھے اور اس بات کو اپنی شرعی ذمہ داری سمجھتے تھے کہ علیحدگی پسندی کا قلع قمع کر کے بغاوت کی روک تھام کی جائے۔ اسی بناء پر انہوں نے قربانیاں دیں، شدید ترین معرکوں میں حصہ لیا اور امامؑ کے پیش کردہ اسلامی لائحہ عمل کے لئے قابلِ قدر فداکاری کا مظاہرہ کیا۔

لیکن ظاہر ہے کہ ایثار و قربانی کا یہ جذبہ یکساں نہیں رہ سکتا تھا بلکہ امامؑ کے ساتھ ان کی وفاداری اور صورتِ حال سے آگاہی میں کمی و بیشی کی نسبت سے

اس جذبے میں بتدریج کمی قدرتی بات تھی۔ خاص کر قبائلی سرداروں کی بات تو اور تھی جو ایک طرف سے امامؑ کی حکومت کے تابع ہونے کی بنا پر اور دوسری طرف سے شامیوں کے مقابلے میں عراقیوں کی حمایت کے قومی جذبے کی بدولت یا اس لئے کہ امام علیؑ کی فتح کی صورت میں انہیں اقتدار اور دولت کے حصول کی امید تھی جنگ میں شریک ہوئے تھے۔

سیاسی میدان میں امام علیؑ کے حامیوں کی ایک تعداد ان لوگوں پر مشتمل تھی جو شعور اور آگاہی کی بناء پر آپؑ کی حمایت کررہے تھے یا مخصوص طبقاتی صورتِ حال اور حیثیت کے پیشِ نظر۔۲۸

ان حقائق کے مطالعے سے لشکرِ علیؑ میں پے در پے ظاہر ہونے والی خیانتوں کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ امامؑ کے چچا زاد عبداللہ ابنِ عباس اور ان کے بعد ان کے بھائی عبیداللہ ابنِ عباس (جنہوں نے معاویہ سے اس بات پر ساز باز کرلی تھی کہ انہوں نے بیت المال سے جتنی دولت حاصل کرلی ہے علیؑ کی وفات کے بعد وہ ان سے واپس نہ لی جائے) کا موقف کچھ زیادہ حیرت انگیز معلوم نہیں ہوتا۔۲۹

ان باتوں کی روشنی میں واضح ہوا کہ جدوجہد، منصوبہ بندی اور اسباب و محرکات کے درجات کے حوالے سے حضرت علیؑ کا موقف معاویہ کے موقف سے مختلف تھا۔ کیونکہ امام علیؑ کا موقف لشکریوں سے اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ راہِ خدا میں جہاد کے لئے ہجرت کریں۔ اور معاویہ کے موقف کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے افراد اپنے گھروں میں ہی براجمان رہیں اور فقط اپنے علاقے (شام) کی خود مختاری کی حفاظت پر اکتفا کریں۔ امامؑ اور معاویہ کے مقاصد اور مطلوبہ جدوجہد

میں گہرے اختلاف کا ان کے مختلف موقف اختیار کرنے میں بڑا دخل تھا۔

(ب) امامؑ کو اپنی قلمرو میں شامل اسلامی معاشرے میں اندرونی انحراف کا سامنا تھا۔ جو آپؑ کی حکومت سے قبل کے سیاسی حالات اور پیچیدگیوں کا نتیجہ تھا۔ ساتھ ساتھ بغاوت اور علیحدگی پسندی کے ناسور کا صفایا کرنے کی ذمہ داری بھی آپؑ کے اوپر تھی جس پر آپؑ کی پوری توجہ مبذول تھی۔

امامؑ کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ آپؑ اس داخلی انحراف کا مقابلہ کرتے جس کا عالمِ اسلام خصوصاً عراق و حجاز کو سامنا تھا۔ خلاصہ یہ کہ آپؑ کو دو جنگوں کا سامنا تھا۔ ایک جنگ باغیوں اور علیحدگی پسندوں کے ساتھ اور دوسری جنگ اسلامی حکومت کے اندر موجود انحراف کے مقابلے میں' جو سابقہ دور کے متعصبانہ سیاسی استبداد کا نتیجہ تھا۔۳۰

یہاں تک کہ کچھ ہی عرصے بعد ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ اسلامی نظام کی تجرباتی عمارت ان منافقین کے حملوں کی زد میں آکر کس طرح منہدم ہونا شروع ہو گئی۔ اس سے پہلے یہ لوگ حکمرانوں کو فریب دے کر بااثر اسلامی مراکز میں گھسنے اور نہایت بے شرمی و منہ زوری کے ساتھ قیادت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یوں خلافت ایسی موروثی حکومت میں بدل گئی جس کا کام اعلیٰ اقدار کی ہتکِ حرمت' صالح افراد کا قتل' اموال کی لوٹ مار اور احکام و قوانین کی پامالی سے عبارت تھا۔۳۱

اسی بناء پر امامؑ نے اس گمراہ کن صورتِ حال کا ازالہ کرنے' غصب شدہ اموال کو واپس لینے اور غیر اسلامی افکار و نظریات کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک بھرپور اور ہمہ جانبہ جنگ شروع کرنے کا عزم کیا۔

امامؑ کے اقدامات کی زد میں بعض با اثر روساء بھی آتے تھے۔ مثال کے طور پر طلحہ و زبیر وغیرہ۔ بات یہاں تک پہنچی کہ ان دونوں نے انتقامِ خونِ عثمان کے بہانے امامؑ کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے بصرہ میں باغیانہ کارروائی کا منصوبہ بنایا۔ امامؑ کی قلمرو میں موجود معاشرتی صورتِ حال اور پیچیدہ ماحول کی روشنی میں آپؑ کو ایک سخت اور طویل داخلی جنگ کا سامنا تھا۔ مذکورہ لوگوں کی ذمہ داری تھی کہ وہ علیحدگی پسندوں کے ساتھ امامؑ کی بیرونی جنگ میں آپؑ کا ساتھ دیتے۔

ادہر معاویہ کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ کیونکہ اسے اپنی قلمرو میں اصلاحی کارروائی کے لئے داخلی جنگ کا سامنا نہ تھا۔ وہ تو مال و دولت کے ذریعے لوگوں کے ضمیروں کو خریدنے اور غیر عادلانہ طریقے سے بعض طبقوں کو نوازنے اور بعض کو محروم کرنے میں مشغول تھا۔ اسے ٹیکس اور مالیہ ادا کرنے والے کسانوں اور تاجروں پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹ پڑنے کی کوئی فکر نہ تھی۔ معاویہ ان لوگوں سے حاصل شدہ آمدنی سے بعض قبائلی سرداروں کی آتشِ طمع کو خاموش کرتا تھا تاکہ ان سرداروں کو ہر قسم کی حریّت پسندانہ عوامی سرگرمیوں کو کچلنے یا ان کی روک تھام پر آمادہ رکھا جا سکے۔ ۳۲

یہاں اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے (جیسا کہ تمام تاریخی ماخذ کا اس پر اتفاق ہے) کہ شام فوجی کارروائی کے نتیجے میں اسلامی حکومت کی قلمرو میں شامل ہوا۔ مشہور یہی ہے کہ اسلام مکمل طور پر ان لوگوں پر اثر انداز نہیں ہوا تھا بلکہ رسمی اور ابتدائی شناخت کی حد تک ان کے دلوں میں داخل ہوا تھا۔ شامی لوگ اسلام کی حقیقی تعلیمات سے آشنا نہ ہوئے تھے۔ اسی لئے اہلِ شام قبل از اسلام کے نظریات و رسوم سے متاثر رہے۔ یہاں تک کہ ان کے ذہنی، معاشرتی

اور سیاسی حالات عہدِ جاہلیت والی صورتِ حال سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے۔ یوں معاویہ کو ایک طرف سے اپنے اہداف و مقاصد اور دوسری طرف سے شامی معاشرے کے درمیان کوئی تضاد نظر نہ آتا تھا۔ اہلِ شام اپنی فکری، اقتصادی، سیاسی اور سماجی صورتِ حال کے لحاظ سے معاویہ کی پالیسیوں کے ساتھ مکمل ہم آہنگی کے لئے آمادہ تھے۔ معاویہ کا اصل مقصد قیصر و کسریٰ کے طرز کی استبدادی حکومت کا حصول تھا۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ حقیقی رابطے پر مبنی حکومت کا قیام نہیں۔

جب کہ دوسری طرف حضرت علیؑ کے لائحہ عمل کو نبیؐ کی وفات کے بعد سے ایک شدید انحراف کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جس سے آپؑ کو ہر صورت میں بغیر پسپائی اختیار کئے نمٹنا تھا۔ خلاصہ یہ کہ امامؑ کو جن اندرونی مسائل کا سامنا تھا وہ معاویہ کو درپیش نہ تھے۔ شام کا معاشرہ فکری، سماجی، سیاسی اور اقتصادی نکتہ نظر سے معاویہ کے نظریے کو قبول کرنے پر مکمل طور پر آمادہ تھا جب کہ علیؑ جس معاشرہ میں تھے اس میں حضرتؑ کا نظریہ قبول کرنے کا یارا نہ تھا۔

(ج) خلافت کے حصول اور معاویہ کے ساتھ جنگ سے پہلے امامؑ کو مسلمانوں کی نظر میں جو حیثیت حاصل تھی، وہ اس حیثیت سے مختلف تھی جو معاویہ کو (آپؑ کے ساتھ جنگ سے پہلے) حاصل تھی۔ امامؑ کو (حکومت سنبھالنے سے پہلے) مسلمانوں میں سے بہت کم لوگ باقاعدہ خلیفہ سمجھتے تھے۔ ان کی نظر میں آپؑ کی حیثیت ایک ایسے بزرگ صحابی سے زیادہ نہ تھی جس نے رسولؐ کی زندگی میں اسلام کی راہ میں قابلِ قدر خدمات انجام دی تھیں۔ یوں وہ آپؑ کو حیاتِ رسولؐ میں اسلام کے لئے گراں قدر خدمات انجام دینے والے دیگر بڑے صحابیوں کی

مانند قرار دیتے تھے۔ امامؑ اس ذہنیت کے شروع ہی سے مخالف رہے۔ آپؑ سقیفہ کے ان فیصلوں کو مسترد کرتے رہے جن کے نتیجے میں فکری و سیاسی لحاظ سے آپؑ کے قائدانہ منصوبے بے اثر ہو کر رہ گئے اور حکومت دوسروں کو مل گئی۔ چنانچہ آپؑ پورے چھ ماہ تک بیعت کو مسترد کرتے رہے۔[۳۳] نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسلمانوں نے خلفاء ثلاثہ کی سیاست کے پیدا کردہ حالات کے آگے سر جھکاتے ہوئے آہستہ آہستہ امامؑ کے ساتھ محض ایک بڑے صحابی کی مانند برتاؤ کرنا شروع کردیا۔

امامؑ کے بارے میں اسی نقطۂ نظر کے باعث بہت سے اصحاب خود کو آپؑ سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ اپنے اور آپؑ کے درمیان معمولی فرق کے قائل تھے۔ ان کی نظر میں جس طرح وہ پیغمبرؐ کے اصحاب تھے اسی طرح آپؑ بھی تھے۔ جس طرح انہوں نے رسولؐ سے کسبِ علم کیا اسی طرح آپؑ نے بھی کیا۔ اگر وہ زیادہ سے زیادہ علم و فضل اور خدماتِ دینی میں آپؑ کی برتری تسلیم کرتے بھی تھے تو پھر بھی صرف چند درجوں کی حد تک فرق کے قائل تھے زیادہ کے نہیں۔

امامؑ کو لوگوں کی نظروں میں حاصل اس حیثیت کے برعکس معاویہ کو شامیوں کے درمیان حاصل حیثیت کی نوعیت کچھ اور تھی۔ اہلِ شام کسی کو معاویہ بن ابو سفیان کا ہم پلہ نہ سمجھتے تھے۔ کیونکہ شامی معاویہ کے بھائی (یزید بن ابو سفیان) کے ہاتھوں مسلمان ہوئے تھے جو حضرت ابوبکر کی طرف سے شام کا والی تھا۔ جب یزید مرا تو حضرت ابوبکر نے اس کے بھائی معاویہ بن ابو سفیان کو شام کا والی بنایا۔[۳۴]

خلاصہ یہ کہ اہلِ شام کافر تھے وہ معاویہ اور اس کے بھائی یزید کے ذریعے مسلمان ہوئے۔ لہٰذا وہ معاویہ کو احترام اور تشکر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ وہ ان کے اور اسلام کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنا تھا۔ امویوں نے بعد میں امام حسینؑ کے ساتھ جنگ میں اس تاریخی حقیقت سے خوب استفادہ کیا۔ انہوں نے امامؑ کو (نعوذ باللہ) دینِ اسلام سے خارج ہونے والا اور خلیفۂ برحق کا باغی قرار دے کر آپؑ کے ساتھ جنگ کی۔

مختصر یہ کہ اموی حکمرانوں نے شامیوں کے دلوں میں ان کو پہلے سے حاصل دینی حیثیت اور مقام سے کام لیتے ہوئے یہ جنگ لڑی۔۳۵۔

ان حقائق کی روشنی میں واضح ہوا کہ معاویہ کے بارے میں شامیوں کا نقطۂ نظر امام علیؑ کے بارے میں اہلِ مدینہ و عراق کے نقطۂ نظر سے متفاوت تھا۔ اسی بناء پر امامؑ کو اپنی زندگی میں ہر دم مخالفتوں اور متضاد نظریات بلکہ بہت سے موقعوں پر اپنی حکم عدولی کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ جب کہ دوسری طرف اہلِ شام معاویہ کے اوامر کو بسرو چشم قبول کرتے تھے۔

(د) معاویہ کے خلاف امامؑ کا دعویٰ حسی و مشاہداتی بنیادوں پر نہ تھا بلکہ تعقل و تفکر پر مبنی تھا اور ظاہر ہے کہ سارے مسلمان اہلِ فکر و نظر نہیں بلکہ لوگوں کی اکثریت عام طور پر حقائق کو سمجھنے سے عاجز ہوتی ہے۔ لوگ ایسی ظاہری و سطحی توجیہات کو قبول کرلیتے ہیں جو حس اور مشاہدے سے قریب تر ہوں نیز قریب الذہن اسباب و عوامل کے ذکر پر مشتمل اور بغیر کسی غور و فکر کے آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہوں۔ یہ لوگ حسیّاتی امور سے ماوراء سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے اور مختلف امور کے گہرے نظریاتی اسباب و عوامل کو جاننے کی

کوشش نہیں کرتے۔۳۶

معاویہ نے امام علیؑ کے خلاف اپنا دعویٰ حسّی اور مشاہداتی انداز میں پیش کیا، جب کہ لوگ بھی حس و مشاہدے کے زیادہ تابع ہوتے ہیں سوائے چند گنے چنے افراد کے جو اپنے مشن کی حقیقی اور عمیق پہچان کے ساتھ نظریاتی زندگی گزارتے ہیں۔

امام علیؑ فرمایا کرتے تھے کہ۔

"معاویہ اسلامی افکار و تعلیمات اور خدائی مشن کے کسی پہلو کا عملی نمونہ پیش نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اپنے باپ ابوسفیان کی جہالت کی عملی تصویر ہے۔ وہ اسلام کے وجود کو ختم کرنے کے درپے ہے اور اسلامی معاشرے کو ایک ایسے سماج میں تبدیل کرنا چاہتا ہے جسے قرآن و اسلام پر کوئی یقین نہ ہو۔ وہ اس بات کا طالب ہے کہ خلافت قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کی صورت میں ڈھل جائے۔"

یہ تھا معاویہ کے بارے میں امامؑ کا مدعا۔

ادھر امامؑ کے بارے میں معاویہ کے دعویٰ کا خلاصہ یہ ہے کہ علیؑ نے لوگوں کو وقت کے شرعی خلیفہ عثمان بن عفان کے خلاف بغاوت پر اکسایا اور ان کے اصحاب و اقارب دشمنانِ عثمان کی صفِ اوّل میں تھے۔ یوں علیؑ نے ان کے ذریعے قتلِ عثمان کا منصوبہ بنایا اور عثمان کے بعد تختِ خلافت پر قابض ہوئے۔

اسی ظاہری دعویٰ کو بنیاد بنا کر معاویہ مسلسل شور مچاتا رہا۔ جب کہ اس نے اپنے اصل مقصد کو دل میں پنہاں رکھا۔ ہوتے ہوتے معاویہ کی ہٹ دھرمیوں کی کثرت کے نتیجے میں حقیقت لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔۳۷

مختصر یہ کہ معاویہ کا دعویٰ حس و مشاہدے سے قریب تر ہونے کی بنا پر عام لوگوں کے لئے زیادہ قابلِ قبول تھا۔ چنانچہ قتلِ عثمان میں براہِ راست حصہ لینے یا مدد کرنے یا اس معاملے میں لوگوں کو اکسانے کے سلسلے میں معاویہ جن لوگوں کی فہرست پیش کر رہا تھا ان سے کون واقف نہ تھا۔ مثال کے طور پر محمد بن ابوبکر، ابوذرِ غفاری، عمارِ یاسر، مالکِ اشتر، محمد ابنِ ابی حذیفہ، عبید اللہ بن مسعود وغیرہ جو علیؑ کی حکومت کے رکنِ رکین تھے۔

عمار نے خلیفہ کے خلاف کارروائی میں کھل کر حصہ لیا۔ اسی طرح ابوذر نے بھی سرِعام خلیفہ اور اس کے عمال پر شریعتِ اسلامیہ کی مخالفت کا الزام لگایا۔ نیز توانگروں کو مال اندوزی سے پرہیز کی ترغیب دیتے رہے۔ یہاں تک کہ عثمان نے ابوذر کو مدینہ سے نکال کر شام کی طرف جلاوطن کردیا تاکہ وہاں معاویہ کی نگرانی میں رہیں۔ ابوذر غریبوں کو انقلاب و بغاوت کی دعوت دیتے تھے۔ ادھر محمد بن ابی حذیفہ اور محمد بن ابوبکر بھی مصر میں اسی قسم کی تبلیغ کرتے تھے۔ کوفے میں مالکِ اشتر نے ولولہ انگیز اور آتشیں تقریر کرتے ہوئے عثمانی حکومت پر زبردست تنقید کی اور اس پر ظلم و جور کا الزام لگایا۔۳۸

بنابرایں حضرت علیؑ کے اوپر ایک ہاتھ سے عثمان کو قتل کرنے اور دوسرے ہاتھ سے خلافت پر قبضہ کرنے کے الزام سے زیادہ قابلِ قبول الزام اور بہانہ کیا ہوسکتا تھا؟

ان حقائق کی روشنی میں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ (عام ذہنوں کے لئے) معاویہ کا الزام کسی حد تک قابلِ قبول تھا۔ کیونکہ حس اور مشاہدے سے قریب تر تھا۔ لیکن امام علیؑ کے موقف کی پہچان کے لئے کافی بیدار مغزی اور

آگاہی و تفکر کی ضرورت تھی۔

آج ہم معاویہ کی حقیقت سے مکمل طور پر آگاہ ہونے کے بعد اس پر تبصرہ کررہے ہیں۔ معاویہ نے عام الجماعۃ (جس سال صلح کے نتیجے میں معاویہ کو پوری حکومت مل گئی) میں سرِ منبر یہ کہا تھا۔

"میری جنگ تم سے اس لئے نہ تھی کہ تم نماز پڑھو' روزہ رکھو' حج کرو اور نیکو کار بن جاؤ ------ میں تو اس لئے تم سے جنگ لڑتا رہا تاکہ تمہارا امیر بن جاؤں۔ خدا نے میرا مقصود عطا فرمایا۔ اگرچہ تم ایسا نہیں چاہتے تھے" ؎۳۹۔

آج ہم معاویہ کے بارے میں جانتے ہیں کہ اس نے حجر بن عدی جیسے پرہیزگاروں اور پارساؤں کو قتل کیا نیز دیگر بہادر مسلمانوں اور امام حسنؑ کو زہر سے شہید کیا' اپنے فاسق و فاجر بیٹے کو ولی عہد بنایا اور امام حسنؑ کے ساتھ ہونے والی صلح کے معاہدہ کی دھجیاں اڑاتے ہوئے کہا۔

"میں نے حسن کو سبز باغ دکھائے اور اس سے کئی ایک وعدے کئے۔ آج وہ سارے وعدے میرے پاؤں تلے ہیں۔ میں ان میں سے کسی کو پورا نہ کروں گا۔ اس فتنے میں تلف شدہ جان و مال کی کوئی قیمت ادا نہیں کی جائے گی۔ حسنؑ کے ساتھ کئے گئے سارے وعدے آج میرے قدموں کے نیچے ہیں" ؎۴۰۔

خلاصہ یہ کہ آج ہم ان واضح حقائق اور تاریخی شواہد کی روشنی میں معاویہ کا مطالعہ کرتے ہیں جب کہ وہ تاریخِ پارینہ کا حصہ بن چکا ہے۔ لیکن خود معاویہ کے زمانے کے مسلمانوں کی عظیم تعداد معاویہ کے بارے میں یہ نقطہ نظر نہیں

رکھتی تھی۔ کیونکہ وہ مذکورہ حقائق اور حالات کا ہماری طرح مطالعہ نہیں کرسکتے تھے۔ اگر ہم معاویہ کی تاریخ سے قطع نظر کرلیں اور اس دور کے لوگوں کی مانند (جو فکر و نظر سے تہی تھے نیز جن کی زندگیاں حضراتِ ابوبکر، عمر اور عثمان کے ادوار میں گزری تھیں اور وہ ان کو امام علیؑ پر ترجیح دیتے تھے) معاویہ کا مطالعہ کریں اور ان غیر آگاہ سادے لوگوں کو بھی مدِّ نظر رکھیں جو معاویہ کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہوں کہ "معاویہ کون ہے؟" تو یقیناً اس سوال کا جواب (ان کی نظر میں) یہ ہوتا کہ معاویہ رسول اللہؐ کے صحابہ اور آنحضرتؐ کے خلیفہ حضرت ابوبکر کے معتمدین میں سے ایک ہے جنہوں نے اسے اپنی فوج کا سردار بنا کر شام بھیجا۔ ان کے مرنے کے بعد حضرت عمر کے دور میں بھی وہاں کا والی بنا رہا۔ وہ اس پر زبردست اعتماد کرتے تھے۔ خاص کر حضرت عمر کو اس زمانہ کے لوگ خاص تقدس کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ اس لحاظ سے معاویہ کی جو تصویر کشی ہوتی ہے وہ اس معاویہ سے مختلف ہے جسے آج ہم (تاریخ کے آئینے میں) دیکھتے ہیں۔ معاویہ حضرت علیؑ سے خونِ عثمان کا طالب تھا۔ وہ علیؑ کو قتلِ عثمان پر لوگوں کو ترغیب دینے کا ملزم ٹھہراتا تھا۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ امامؑ عثمان کے قاتلوں سے قصاص لینے پر قادر ہونے کی صورت میں قاتلوں کو ان کے حوالے کیوں نہیں کرتے؟ نیز قصاص پر قادر نہ ہونے کی صورت میں یہ نفاذِ شریعت سے علیؑ کے عاجز ہونے کی دلیل تھی۔ بنابرایں (اس کی نظر میں) آپؑ کو خلافت سے دستبردار ہو کر اسے کسی مناسب تر شخص کے حوالے کرنا چاہئے تھا۔[۱۴۱]

یہ تھا امامؑ کے بارے میں معاویہ کا دعویٰ۔

اس مجموعی صورتِ حال اور پیچیدہ ماحول کے نتیجے میں آہستہ آہستہ امام علیؑ کے زیرِ حکومت معاشرے میں شکوک و شبہات کے سائے پھیلنے لگے۔ جب کہ یہ عظیم امامؑ انہی لوگوں کے سہارے اندرونی اور بیرونی انحرافات کے خاتمے کے لئے جنگ میں مشغول تھے۔ امامؑ عوام کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ یہ جنگ ذاتی اقتدار کے لئے نہیں اور نہ ہی آپؑ کے قوم قبیلے یا آباء و اجداد کے نام پر لڑی جا رہی ہے۔ یہ تو محض اسلام اور جاہلیت کے درمیان جنگ ہے۔ بلکہ یہ اس خدائی امانت کی حفاظت کے لئے جنگ ہے جس کی خاطر ہزاروں انبیاء و صالحین نے جہاد کیا تھا۔

امامؑ لوگوں کو جنگ کی حقیقت اور اس کے پاک و مقدس اہداف سے آگاہ کرنے کے متمنی تھے۔ لیکن لوگ اس جنگ کی حقیقت میں شک کرنے لگے۔ جس قدر آپؑ لوگوں کو اطاعت اور جہاد کی دعوت دیتے تھے اسی قدر وہ لوگ اپنے معاندانہ موقف میں زیادہ سختی پیدا کرتے تھے۔ آپؑ نے ایک موقع پر فرمایا :

"میں خدا کے قضا و قدر اور تمہارے ذریعے اپنی آزمائش پر صابر و شاکر ہوں۔ اے لوگو جب میں تمہیں کوئی حکم دیتا ہوں تو تم روگردانی کرتے ہو۔ جب میں تمہیں بلاتا ہوں تو تم جواب نہیں دیتے ہو۔ اگر تمہیں جنگ کرنے سے مہلت مل جائے تو ڈینگیں مارتے ہو لیکن اگر جنگ کا سامنا ہو تو بزدلی دکھاتے ہو۔ جب لوگ امام پر ایکا کر لیتے ہیں تو تم طعن و تشنیع سے کام لیتے ہو۔ اور اگر بزور میدانِ کارزار کی طرف لائے جاتے ہو تو الٹے پاؤں لوٹ جاتے ہو"۔[۴۲]۔

مختصر یہ کہ ان لوگوں پر سختیاں آن پڑیں تھیں، جہاد نے ان کو تھکا دیا تھا۔ حالانکہ انہوں نے راہِ اسلام میں اس سے پہلے بہت ساری قربانیاں دی تھیں جن کو پیش کرنے سے اکثر معاشرے عاجز ہوتے ہیں۔ بہرحال ان کی ہمتیں جواب دے گئی تھیں، وہ جہاد کو برقرار نہ رکھ سکے اور انحراف نے غلبہ پالیا۔

یہ لوگ جو تھک چکے تھے اور مسلسل جہاد کے ہاتھوں تنگ آگئے تھے، اب یہ سوچنے لگے تھے کہ ان کی حالت ابتر ہوچکی ہے اور وہ ایک ایسے ہدف کے پیچھے جو ان کے ذاتی مفادات کے لئے سودمند نہ تھا اپنی دنیا سے دست بردار نیز اپنے بال بچوں اور اموال سے روگردان ہوچکے ہیں۔ یوں وہ اس قسم کے شکوک و شبہات کو اپنے دلوں میں جگہ دینے لگے۔ جب انسان ذہنی طور پر ہتھیار ڈال دیتا ہے تو یہ امر شکوک و شبہات کو جنم دیتا ہے اور انسان کے دل میں وسوسے ایجاد کرتا ہے۔ ان لوگوں کی خواہش تھی کہ خونریزی اور جنگوں کا یہ سلسلہ ختم ہو۔

اس سرکش نفسانی خواہش نے غیر منطقی توجیہات، بہانے اور شکوک جنم دیئے۔ یہ توجیہات اور بہانے اس نفسانی خواہش کا نتیجہ تھے کہ موجودہ حالت سابقہ حالت میں بدل جائے جب کہ ابھی انہوں نے ان سنگین امور کی ذمہ داریاں اپنے کاندھوں پر نہیں اٹھائی تھیں۔ مذکورہ شکوک و شبہات کو جنم دینے میں بہت سے عوامل و اسباب کا دخل رہا ہے جن میں سے بعض یہ ہیں۔

(۱) بعض اصحاب کا رویہ

بعض اصحاب جو لوگوں کی نظر میں پرہیزگاری و تقویٰ کے اونچے مقام پر فائز تھے اور نظریات و ایمان کے لحاظ سے مثالی شخصیات شمار کئے جاتے تھے۔ وہ

حضرات عوام کو یہ تاثر دیتے تھے کہ جنگ درست نہیں۔ بقول ان کے اس جنگ میں آرام سے بیٹھے رہنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر' سوئے رہنے والا بیٹھے رہنے والے سے بہتر اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہے۔

(۲) ابو موسیٰ اشعری کی طرف سے لوگوں کی غلط تلقین

ابو موسیٰ کی (منفی) تلقین کا اثر عمار یاسر کی (مثبت) تلقین کے مقابلے میں زیادہ موثر تھا۔ کیونکہ عمار کی تلقین موت کو اپنانے' جہاد پر قائم رہنے نیز زندگی اور اس کی رنگینیوں سے دست بردار ہونے کی متقاضی تھی۔ لیکن اس کے مقابلے میں ابو موسیٰ لوگوں کو زندہ رہنے کی تلقین کرتا تھا۔ گویا وہ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ اپنی جان بچاؤ' خطرات سے دور رہو' آرام سے گھر بیٹھے رہو۔ نیز اسلام کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دو اور خطرات کی موجوں کے حوالے کر دو۔

عمار یاسرؓ عظیم صحابی تھے۔ ابو موسیٰ بھی معروف صحابی تھا۔ لیکن ایک زندہ رہنے کی دعوت دے رہا تھا اور دوسرا موت کو گلے لگانے کی۔ ظاہر ہے کہ ایک عام بے ہدف اور سادہ لوح انسان ابو موسیٰ اشعری کی تلقین کو عمار یاسرؓ کی تلقین پر ترجیح دینا پسند کرتا کیونکہ وہ اس کو جان بچانے کی دعوت دے رہا تھا۔ گرچہ معاویہ اور اس کی گمراہ کن حکومت کے زیرِ سایہ گزاری جانے والی زندگی کتنی ہی بے کیف کیوں نہ ہو۔

(۳) بنی امیہ اور بنی ہاشم کی پرانی باہمی رنجش

یہ رنجش اسلام کے پھیلنے کے بعد بھی باقی رہی اور مذکورہ شکوک کو تقویت دینے میں مددگار ثابت ہوئی۔ کیونکہ لوگ جنگ کے کمزور پہلوؤں کے متلاشی تھے

لہٰذا میدانِ جنگ سے جان چھڑانے کے لئے بطورِ بہانہ اس ضعیف پہلو کا پرچار کرنے لگے اور کہنے لگے کہ علیؑ اور معاویہ کی جنگ بنی امیہ و بنی ہاشم کی پرانی دشمنی کا شاخسانہ ہے۔

مذکورہ بالا عوامل دیگر اسباب کے ساتھ مل کر لوگوں کے دلوں میں امامؑ کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کا باعث بن گئے۔ یوں ان کی نظروں میں جنگ کی معنوی اور نظریاتی حیثیت مبہم ہو کر رہ گئی' یہاں تک کہ امامؑ بار بار منبر سے لوگوں کو جہاد کی دعوت دیتے رہے لیکن کوئی آپؑ کی دعوت کا جواب نہ دیتا۔ آپؑ ان سے فرماتے تھے :

"اے اہلِ کوفہ جب تمہیں یہ خبر ملتی ہے کہ شامی دستوں کا خطرہ تمہارے سروں پر منڈلا رہا ہے تو تم سب اپنے گھروں میں گھس کر یوں دروازے بند کر لیتے ہو جس طرح گوہ اپنے سوراخ میں گھس جاتا ہے اور بجو اپنے بھٹ میں۔ فریب خوردہ ہے وہ شخص جو تمہارے دام میں پھنس جائے۔ جو تمہاری مدد سے جیتتا ہے اس کی جیت بس اتفاقی ہوتی ہے۔ نہ بلاوے کے وقت جوانمردی دکھاتے ہو اور نہ امن کے دوران جذبۂ اخوت رکھتے ہو۔ "انا للّٰہ و انا الیہ راجعون" مجھے تم لوگوں کی وجہ سے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے۔ تم لوگ ایسے اندھے ہو جو دیکھ نہیں سکتے' گونگے ہو جو بول نہیں سکتے اور ایسے بہرے ہو جو سن نہیں سکتے۔" "انا للّٰہ و انا الیہ راجعون"۔ ۴۳

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔

"خدا تمہارا بھلا کرے کیا کوئی ایسا دین موجود نہیں جو تمہیں ایک مرکز پر

جمع نہیں کرتا اور غیرت تمہیں (دشمن کی روک تھام پر) آمادہ نہیں کرتی؟ کتنی عجیب بات ہے کہ معاویہ چند تُند مزاج اور اوباشوں کو دعوت دیتا ہے اور وہ بغیر کسی امداد و اعانت اور بخشش و عطا کے اس کی پیروی کرتے ہیں اور میں تمہیں امداد کے علاوہ معیّنہ عطیوں کے ساتھ دعوت دیتا ہوں مگر تم مجھ سے پراگندہ اور منتشر ہو جاتے ہو اور مخالفتیں کرتے ہو۔ حالانکہ تم اسلام کے رہے سہے افراد اور مسلمانوں کی یادگار ہو"۔ ۴۴۔

نیز فرمایا۔

"افسوس ہو تم پر میں تو تمہیں ملامت کرتے کرتے بھی اکتا گیا ہوں۔ کیا تمہیں آخرت کے بدلے دنیوی زندگی اور عزت کے بدلے ذلت ہی گوارا ہے؟ جب تمہیں دشمنوں سے لڑنے کے لئے بلاتا ہوں تو تمہاری آنکھیں حلقوں میں اس طرح گھومنے لگتی ہیں کہ گویا تم موت کے گرداب میں ہو اور جاں کنی کی غفلت اور مدہوشی تم پر طاری ہے۔ میری باتیں جیسے تمہاری سمجھ میں ہی نہیں آتیں تم ششدر رہ جاتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے جیسے تمہارے دل و دماغ پر دیوانگی کا اثر ہے کہ تم عقل سے کام نہیں لے سکتے۔ تم ہمیشہ کے لئے مجھ سے اپنا اعتماد کھو چکے ہو۔ نہ تم کوئی قوی سہارا ہو کہ تم پر بھروسہ کر کے دشمنوں کی طرف رخ کیا جائے------ خدا کی قسم میں تمہارے بارے میں یہی گمان رکھتا ہوں کہ اگر جنگ زور پکڑ لے اور موت کی گرم بازاری ہو تو تم ابنِ ابی طالب سے اس طرح کٹ جاؤ گے جس طرح بدن سے سر (کہ دوبارہ پلٹنا

ممکن ہی نہ ہو)"۔ ۴۵۔

یوں امامؑ ان کے عزم و حوصلے کو بلند کرنے کی کوشش فرماتے تھے لیکن ان کی رگِ ہمت و حمیت نہ پھڑکتی تھی اور نہ ہی ان کے عزائم بلند ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ اپنے قائد اور امام کے بارے میں شک و شبہ میں گرفتار ہو گئے تھے۔ واضح ہے کہ قیادت پر شک کسی بھی مخلص قائد کے لئے سب سے سخت مرحلہ، امتحان ہوتا ہے اور اس کی قوم کے لئے سب سے خطرناک آزمائش۔ لوگوں کی طرف سے امامؑ پر کئے جانے والے شکوک کی تلخیاں اور سختیاں آپؑ کی جنگوں میں واضح طور پر نمایاں ہیں۔ آپؑ نے فرمایا :

"خدایا یہ لوگ مجھ سے تنگ آگئے ہیں اور میں ان سے تنگ آچکا ہوں۔ میں ان سے اکتا گیا ہوں اور وہ مجھ سے اکتا گئے ہیں۔ خدایا! مجھے ان لوگوں کے بدلے بہتر افراد عطا کر اور میرے بدلے کسی بُرے حاکم کو ان پر مسلط فرما۔ خدایا! ان کے دلوں کو اس طرح پگھلا دے جس طرح نمک پانی میں گھول دیا جاتا ہے"۔ ۴۶۔

اس قدر بد اعتمادی سے روبرو ہونے کے باوجود امامؑ بددل نہیں ہوئے اور نہ پیچھے ہٹے۔ بلکہ اپنے موقف پر ثابت قدم رہتے ہوئے معاویہ کے ساتھ جہاد کرنے اور بغاوت کا قلع قمع کرنے کے لئے جنگی تیاری میں مشغول رہے۔ یہ سلسلہ آپؑ کی زندگی کے آخری سال بلکہ آخری دن تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ آپؑ مسجدِ کوفہ میں اپنے خون میں نہا گئے۔ جب کہ ابھی علیحدگی پسندوں کی سرکوبی کے لئے آپؑ کی تیاریاں اوج پر تھیں۔ اور لشکر کے ابتدائی دستے شام کی طرف روانگی کے لئے لیس اور آمادہ تھے تاکہ معاویہ کی قیادت میں امت سے

جدا ہونے والے گروہ کا حساب چکایا جاسکے۔ امامؑ کی شہادت کے ساتھ ہی اسلام سے پھرنے والوں نے نظامِ اسلام کے دوبارہ عملی نفاذ کی اس آخری امید کو بھی خاک میں ملا دیا۔ جو آگاہ و بیدار مسلمانوں کے دلوں میں امامِ مبین علیؑ کی شکل میں کروٹیں لے رہی تھی۔ کیونکہ آپؑ نے حکومت سنبھالتے ہی راہِ اسلام میں مشکلات و مصائب کا مسلسل مقابلہ شروع کیا۔ نیز آپؑ اسلام کی تعمیر کی تمام منازل میں شریکِ عمل رہے۔ آپؑ نے رسولِ اکرمؐ کے ساتھ مل کر اسلام کی عمارت کھڑی کی۔ اور دعوتِ اسلام کے سارے مراحل میں مشکلات و آلام و مصائب کا مقابلہ کرتے ہوئے رسولِ کریمؐ کا ساتھ دیا۔ بنابرایں آپؑ آگاہ مسلمانوں کی وہ واحد امید تھے جو اسلامی نظام کے تجربے کو اس کے صحیح اور عملی خطوط پر اسلوبِ نبویؐ کے عین مطابق چلا سکتے تھے۔

ان حالات میں جب کہ انحراف کی جڑیں نومولود اسلامی معاشرے کے اندر کافی حد تک پھیل چکی تھیں، اس انحراف اور اس کے چیلنجوں کے مقابلے میں کامیاب ہونے کے لئے امامؑ کی ذات کے علاوہ کوئی اور امید نہ تھی۔ اسی لئے آپؑ کے المناک قتل سے درحقیقت صحیح معنوں میں اسلامی معاشرے کی تشکیل کی آخری امید بھی دم توڑ گئی۔

کیا گٹھ جوڑ سے انکار ہٹ دھرمی کی وجہ سے تھا؟

امامؑ کی زندگی کے ایک اہم گوشے کی طرف اشارہ کرنا باقی رہ گیا، جس پر اب ہم روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے اور وہ ہے آپؑ کا وہ آگاہانہ اصرار جس پر آپؑ قبولِ حکومت سے لے کر تادمِ شہادت قائم رہے۔ یعنی انحراف کا

مقابلہ کرنے کے لئے ہر قسم کی ناقص تجاویز اور سودے بازیوں کو سختی سے رد کرتے رہنا۔ آپؑ کسی صورت میں امت کے نام پر منحرفین کے ساتھ کسی بھی قسم کی مفاہمت اور سودے بازی کے لئے تیار نہ تھے۔

امامؑ کا ان نام نہاد مفاہمتوں اور سودے بازیوں کو مسترد کرنا اکثر قدیم و جدید مورخین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کا باعث بنا ہے۔ ان مورخین نے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ تاریخی حقائق اور امامؑ کی صحیح شناخت سے کوسوں دور ہیں۔ یہاں ہم اس حقیقت کو زیرِ بحث لاتے ہوئے دو زاویوں سے اس پر روشنی ڈالیں گے۔ اولاً سیاسی زاویے سے اور ثانیاً فقہی زاویے سے۔

(الف) سیاسی زاویہ

سیاسی نقطہ نظر سے ہم دیکھتے ہیں کہ امامؑ کے بعض معاصرین کی نظر میں (حکومت کو درپیش مسائل کے حل کے سلسلے میں) امام کی پالیسیوں نیز ہر قسم کے گٹھ جوڑ اور ناقص حلوں سے آپؑ کے انکار کی بنیاد (نعوذ باللہ) آپؑ کی ہٹ دھرمی تھی۔ یہ امر آپؑ کے منصوبوں میں پیچیدگی اور آپؑ کی حکومت کے لئے مشکلات پیدا کرنے کا باعث تھا۔ جس کا نتیجہ (کثرتِ مشکلات کے باعث) ان کو حل کرنے میں امامؑ کی ناکامی کی صورت میں نکلا۔ کیونکہ ان مسائل میں پھنس کر امامؑ اپنی حکومت کے بنیادی مقاصد اور اپنی منزلِ مقصود کو حاصل کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ مغیرہ بن شعبہ آپؑ کے پاس یہ تجویز لے کر آیا کہ تاوقتیکہ حالات درست نہ ہوجائیں معاویہ کو شام کی گورنری پر باقی رکھا جائے اس کے بعد وہ اطاعت و بیعت کرنے پر مجبور ہوگا۔ نیز آپؑ کی قلمرو میں

شامل سارے علاقوں کے لوگ جب بیعت کرلیں گے تو پھر معاویہ کی جگہ کسی اور کو معین کرنا بھی ممکن ہو گا۔

لیکن امامؑ کا موقف اس قسم کی تمام سودے بازیوں سے یکسر انکار تھا۔ یہاں تک کہ آپؑ نے اس قسم کی رعایتوں سے انکار پر مبنی پالیسی کی تاکید ان الفاظ میں کی۔

"مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ اس امت کی باگ ڈور جاہلوں اور فاسقوں کے ہاتھوں میں چلی جائے۔ یوں وہ مالِ خدا کو ذاتی ملکیت' بندگانِ خدا کو اپنا غلام' نیک لوگوں کو دشمن اور فاسقوں کو دوست بنالیں۔ ان لوگوں میں سے بعض نے شراب نوشی کی ہے اور ان پر شرعی حدود کے تحت کوڑے لگے ہیں۔ اور بعض ایسے بھی ہیں جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے جب تک ان کو عطیات نہیں دیئے گئے" ۴۷۔

غصب شدہ اموال اور ان کو واپس بیت المال میں جمع کرنے کے بارے میں فرمایا۔

"عثمان نے مالِ خدا میں سے جو کچھ بھی لوگوں کو دیا ہے واپس لیا جائے گا۔ کیونکہ کوئی چیز حق کو ختم نہیں کرسکتی۔ جسے حق میں تنگی محسوس ہو ظلم اس کے لئے بیشتر تنگی و سختی کا باعث ہے" ۴۸۔

اسی بناء پر آپؑ کے بعض ہم عصروں نے کہا تھا (اس بات کا آج کے نام نہاد مورخین بھی ورد کرتے نہیں تھکتے) کہ امامؑ اپنے دشمنوں پر یقینی فتح حاصل کرسکتے تھے بشرطیکہ آپؑ ان (نام نہاد) تجاویز کو قبول فرماتے اور کچھ لو کچھ دو کی پالیسی پر عمل کرتے۔

(ب) فقہی زاویہ

یہاں ہم ایک معروف فقہی اصطلاح "تزاحم" کی روشنی میں بحث کریں گے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ جب کسی واجب امر کی انجام دہی کسی حرام کام پر موقوف ہو اور اس واجب کی انجام دہی کی اہمیت اس حرام سے پرہیز کی بہ نسبت زیادہ ہو تو پھر اس واجب کام کا (اس بہانے سے کہ وہ حرام کام پر موقوف ہے) ترک کرنا جائز نہیں۔ بلکہ اس واجب کو انجام دینا ضروری ہے۔ مثلاً جب کسی ڈوبتے ہوئے انسان کو بچانا مقصود ہو لیکن یہ کام ایسی زمین سے گزرنے پر موقوف ہو جس کا مالک وہاں سے گزرنے پر راضی نہ ہو۔ تو اس صورت میں اسلام ہمیں اس زمین سے گزرنے کی اجازت دیتا ہے یوں اس زمین میں تصرف کی حرمت ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ کسی انسان کو بچانے کی ضرورت مذکورہ زمین سے بلا اجازت گزرنے کی ممانعت کی بہ نسبت زیادہ اہم ہے۔

چنانچہ رسولِ اکرمؐ نے ایک موقعے پر کسی جنگ میں اس اصول پر عمل کیا جب آپؐ کے لشکر کو کسی مزروعہ زمین سے گزرنے کی ضرورت ہوئی۔ اراضی کے مالک زراعت کو پہنچنے والے نقصانات کا معاوضہ طلب کر رہے تھے۔ لیکن رسول اللہؐ نے ان کی بات نہ مانی اور وہاں سے گزرنے کا حکم صادر فرمایا۔ یوں لشکر مزروعہ زمین سے گزر گیا۔ پس پیغمبرؐ کے اس اقدام کی علت یہ تھی کہ اس کے نتائج زمین سے گزرنے کی قباحت کے مقابلے میں زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ کیونکہ لشکر کے وہاں سے گزرنے کا ہدف یہ تھا کہ روئے زمین پر چھائی تاریکیوں کو نور میں تبدیل کر سکیں۔ اس عظیم مقصد کے سامنے ایک چھوٹے

سے قطعۂ زمین کی کیا حیثیت ہو سکتی تھی؟ اس حال میں کہ لشکرِ اسلام اپنے عظیم مقاصد کے ساتھ پوری دنیا میں اسلام کے طویل المدت پروگرام کے مطابق دولت کی عادلانہ تقسیم کے اصول کی حفاظت کرنے والا تھا۔

فقہی نقطۂ نظر سے یہ ایک معقول بات ہے۔ کیونکہ اس قاعدے کی رو سے جب کوئی واجب کسی حرام پر موقوف ہو اور واجب کی اہمیت حرام سے زیادہ بھی ہو تو اس صورت میں ظاہر ہے واجب کو حرام پر مقدم کرنا چاہئے۔ اس فقہی اصول اور مذکورہ سیاسی اجتہاد کی روشنی میں ہمارے موردِ بحث موضوع کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امامؑ نے اپنی سیاسی پالیسیوں اور اقدامات کے سلسلے میں اس فقہی قاعدے پر عمل کیوں نہیں کیا؟

امامؑ کی سیاست کے ناقدین اسی بناء پر کہتے ہیں کہ کاش علیؑ اس فقہی اصول کو عملاً اپناتے اور آپؑ کی جدوجہد زیادہ اہمیت کے حامل واجب (یعنی تمام عالمِ اسلام کی حکومت سنبھالنے اور عظیم تر اسلامی اہداف کے لئے جدوجہد کرنے) کی جانب مرکوز ہوتی۔ اس صورت میں شرعی و فقہی اجازت کے ہوتے ہوئے عظیم واجبات کی حفاظت کی راہ میں بعض محرمات کی موجودگی سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ خصوصاً اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ امامؑ کی قیادت مسلمانوں کے لئے خوبی و سعادت کے دروازے کھول دیتی اور روئے زمین پر مسلمانوں کے لئے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا باعث بنتی۔ بالفاظ دیگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امامؑ نے عظیم تر مقاصد کے حصول کی خاطر معاویہ کو شام کی حکومت پر باقی کیوں نہیں رکھا؟ اگرچہ کچھ وقت کے لئے ہی کیوں نہ ہو؟ اور بنی امیہ نے بیت المال سے جو دولت لوٹ لی تھی اس سے چشم پوشی کیوں نہیں کی اگرچہ مختصر مدت کے لئے ہی سہی؟

مختصر یہ کہ آپؑ نے مذکورہ اصول "تزاحم" کو کیوں نہیں اپنایا؟

یہاں ہم ان سارے سوالات کا جواب دینے کی سعی کریں گے۔

واضح رہے کہ امامؑ کے لئے دو وجوہات کی بناء پر اپنی پالیسیوں میں مذکورہ فقہی اصول کو اپنانا ممکن نہ تھا۔

پہلی وجہ

امامؑ نے جن اہداف کو اپنی سیاسی حکمتِ عملی میں ملحوظِ نظر رکھا ان میں سے ایک اپنی حکومت کے مرکز یعنی عراق کو مضبوط بنانا تھا۔ اس کی وجہ عراق میں آپؑ کے مددگاروں اور آپؑ سے فکری و قلبی و جذباتی لگاؤ رکھنے والوں کی موجودگی تھی۔ اگرچہ وہ لوگ آپؑ کے مشن اور مقاصد سے مکمل طور پر آگاہ نہ تھے۔ یہیں سے امامؑ کے لئے اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ ایسی اوّلین بیدار نسل کی تربیت کی جائے جو آپؑ کے مشن اور اہداف کی امین ہو اور عالمِ اسلام کے کونے کونے میں ان اہداف کی بنیادوں کو مضبوط کرنے والی بنے۔ اسی لئے آپؑ اپنی حکومت کے ابتدائی لمحوں سے ہی اس باایمان ہراول دستے اور عوامی طبقے کی تربیت کی اہمیت محسوس کرتے رہے تاکہ ان کی مدد سے اپنی حکومت کو بطریقِ احسن چلا سکیں۔ لیکن آپؑ کو اس باایمان دستے کی تربیت کا موقع اس صورت میں کیسے مل سکتا تھا اگر آپؑ دشمن کے ساتھ نام نہاد مفاہمتوں اور سودے بازیوں کے ماحول میں سرگرم رہتے؟ (اگرچہ یہ کام شرعاً صحیح ہوتا اور اس پر قاعدۂ تزاحم کا مذکورہ اصول بھی جاری ہوتا)

کیونکہ اگر امامؑ سیاسی سودے بازیوں میں مصروف رہتے تو آپؑ اپنے مطلوبہ

باایمان گروہ کی جس نہج پر روحانی تربیت کے خواہاں تھے اس کی بنیادیں مضبوط نہ ہوتیں۔ اگرچہ شرعی نقطۂ نظر سے یہ کام جائز ہوتا۔ کیونکہ شرعی جواز سے لوگوں کی فکری تربیت پر پڑنے والے بڑے اثرات زائل نہ ہوتے۔ بنابریں امامؑ کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ اولاً آپؑ کی حکومت اور ثانیاً امتِ مسلمہ کو بیدار و آگاہ عوامی طاقت کی ضرورت ہے۔ جو اسلام کے مشن کا بیڑا اٹھا سکے اور اسے امتِ مسلمہ کے درمیان راسخ بنیادوں پر استوار کرسکے۔

یہ بیدار اور آگاہ عوامی طاقت صحیح اسلامی حکومت چلانے کے لئے بنیادی قوت کا کام دیتی۔ لیکن جب امامؑ نے حکومت سنبھالی تو اس وقت اس آگاہ عوامی طاقت کا وجود نہ تھا جسے آپؑ اپنے ساتھ متفق بنا لیتے۔ یا کم از کم دشمن کے ساتھ (اصولِ تزاحم کے تحت) ہونے والی مفاہمتوں اور ان کی استثنائی ضرورت کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر سمجھا سکتے۔

پس اس وقت کے خارجی حالات کا تقاضا یہ تھا کہ آپؑ اپنی پوری کوشش اور توجہ ایک ایسے نظریاتی لشکر کی تیاری پر مبذول و مرکوز فرمائیں جو فکری، روحانی اور جذباتی لحاظ سے عمارِ یاسرؓ، ابوذرِ غفاریؓ اور مالکِ اشترؒ وغیرہ کی مانند بیدار اور آگاہ ہو۔

لیکن اگر اس کے برعکس امامؑ نام نہاد سیاسی مفاہمتوں اور سودے بازیوں میں مشغول ہو جاتے تو اس دستے کی تیاری نہ آسان تھی اور نہ ممکن۔ کیونکہ یہ روش آپؑ کی مذکورہ تربیتی پالیسی کی عین ضد ہوتی۔ اس تربیت شدہ نظریاتی طاقت کا فقدان حقیقی اسلامی حکومت کی تشکیل اور آئندہ نسلوں کے لئے امت کے اندر فعال اور بیدار گروہ کی تیاری کے لئے مطلوبہ قوت سے محرومی کے

مترادف ہوتا۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی نظریاتی حکومت کے لئے ایک ایسے باایمان ہراول دستے کی ضرورت ہوتی ہے جسے اس حکومت کے اہداف اور اس کی تاریخی اہمیت و ضرورت سے عمیق آگاہی حاصل ہو۔ یہی وجہ تھی کہ امامؑ ایک بیدار نظریاتی لشکر کی تیاری کے عمل کا تقدس ہر صورت میں محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپؑ کے اقدامات تربیتی اور اصلاحی نقطۂ نظر سے راہنما اصولوں اور نمونۂ عمل کی صورت اختیار کر گئے۔ امت کا باشعور طبقہ اور آپؑ کے حامی عناصر ان اقدامات سے رہنمائی حاصل کر رہے تھے۔ پس آپؑ کے اوپر لازم تھا کہ ایک ایسے رہبر کی حیثیت سے ابھریں جو خواہشات کے جال میں پھنسنے والا نہ ہو اور کسی قسم کی سودے بازی کے لئے آمادہ نہ ہو تاکہ یوں آپؑ اپنی ٹھوس اور اصولی پالیسیوں کے ذریعے اپنے جامع و نافع نظریاتی مقاصد کی عملی تعبیر کے سلسلے میں مذکورہ بیدار طبقے کی مدد فرماسکیں۔

ان باتوں کی روشنی میں ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ امامؑ نے "کچھ لو اور کچھ دو" کی پالیسی پر اس لئے عمل نہیں کیا کیونکہ آپؑ ایک نظریاتی فوج کی تشکیل نیز روحانی، فکری اور ولولے کی فضا قائم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ تاکہ یہ نظریاتی طبقہ آپؑ کی زندگی میں نیز آپؑ کے بعد عظیم اہداف و مقاصد کا پاسبان بن جائے۔

دوسری وجہ

امامؑ نے حکومت کی باگ ڈور ان حالات میں سنبھالی جب حضرت عثمان کے خلاف انقلاب آچکا تھا۔ اس انقلابی فضا کے بعد جو حضرت عثمان کے قتل اور ان

کی حکومت کے خاتمے کا سبب بنی امتِ مسلمہ کی زندگی میں پیدا ہونے والے ان تُند و تیز جذبات کو صحیح راہ پر لگانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ حکومت سنبھالنے کے بعد امامؑ کی پوری کوشش یہ تھی کہ انقلابی اقدامات کے ذریعے (جو آپؑ نے پیچیدہ حالات کے دوران کئے) اس جذباتی کیفیت کو گہرائی بخشی جائے اور اسلامی حکومت کے مفادات کی تکمیل کے لئے اس سے بھرپور استفادہ کیا جائے۔

یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس پُر تلاطم انقلابی و جذباتی ماحول میں اگر امامؑ باطل کو دہشت گردی اور من مانی کی کھلی چھٹی دیئے رکھتے نیز اس کی روک تھام کے لئے کوئی اقدام نہ فرماتے، سابقہ حکام کی دخل اندازیوں کو چپکے سے نظرانداز کردیتے اور معاویہ کے بارے میں بھی خاموشی اختیار فرماتے تو نہ جانے آپؑ کو کن نتائج کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس کے علاوہ اگر امامؑ انقلابیوں کے جذبات و احساسات کے ٹھنڈے پڑ جانے تک یونہی بیٹھے رہتے تو کیا آپؑ کا یہ موقف درست ہوتا؟ نیز اگر ہم اسے لازم قرار دے بھی دیں تو اس بات کی ضمانت کون دیتا کہ امامؑ کو ایک بار پھر اس قسم کے اقدامات کا موقع ملتا؟

بنابرایں حضرت عثمان کے خلاف شورش سے پیدا شدہ انقلابی فضا امامؑ کے اصلاحی اقدامات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بہترین موقع تھی۔ پس اس بات کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ آپؑ اپنی کارروائیوں کو عوام کے انقلابی جذبات اور جوش و خروش کے سرد پڑ جانے تک ملتوی فرماتے۔

مصادر و ماخذ

۱۔ مفصل مطالعہ کے لئے علامہ محمد مہدی شمس الدین کی کتاب "ثورۃ الحسینؑ" سے رجوع کیجئے۔ (یہ کتاب "انقلابِ حسینؑ پر ایک محققانہ نظر" کے نام سے اردو زبان میں دستیاب ہے)

۲۔ تاریخِ طبری۔ ج۵۔ ص۱۳۱، تاریخِ کامل ابنِ اثیر۔ ج۳۔ ص۱۳

۳۔ سیرۃ ابنِ ہشام۔ ج۲۔ ص۱۰۱۸

۴۔ مقریزی تحقیق نوس۔ ص۴۸

۵۔ ملل و نحل شہرستانی

۶۔ شرح نہج البلاغہ از ابنِ ابی الحدید۔ ج۸۔ ص۱۱۱

۷۔ تاریخِ یعقوبی۔ ج۲۔ ص۱۰۶

۸۔ تاریخِ یعقوبی۔ ج۲۔ ص۱۰۷

۹۔ تاریخِ یعقوبی۔ ج۲۔ ص۱۰۷

۱۰۔ کامل ابنِ اثیر۔ ج۲۔ ص۳۶

۱۱۔ ڈاکٹر طٰہ حسین کی کتاب "عثمان" نقل از دائرۃ المعارف الاسلامیہ الشیعہ۔ ج۲۔ ص۹۴

۱۲۔ نہج البلاغہ طبع دارالاندلس۔ ج۱۔ ص۱۵۱

۱۳۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ الشیعہ۔ ج۲۔ ص۸۷

۱۴۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ الشیعہ۔ ج۲۔ ص۸۷

۱۵۔ نہج البلاغہ۔ ج۱۔ ص۱۰۲۔۱۰۵۔ خطبہ نمبر۱۶

۱۶۔ ثورۃ الحسینؑ از علامہ مہدی شمس الدین۔ ص۳۵۔۳۸

۱۷۔ نہج البلاغہ۔ ج۱۔ ص۲۳۔ خطبہ نمبر۹۰

۱۸۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ نمبر۳۷

۱۹۔ نہج البلاغہ۔ ج۱۔ ص۵۹، شرح نہج البلاغہ۔ ج۱۔ ص۲۶۹۔۲۷۰

۲۰۔، ۲۱۔ شرح نہج البلاغہ۔ ج۷۔ ص۳۷

۲۲۔ نہج البلاغہ۔ مکتوب نمبر۶۲
۲۳۔ النظم الاسلامیہ نشاء تھا و تطورھا از صبحی صالح۔ ص۹۱
۲۴۔ الیمین والیسار فی الاسلام از احمد عباس صالح۔ ص۱۱۸-۱۱۹
۲۵، ۲۶۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ الشیعہ نقل از عباس محمود عقاد۔ ص ۸۴
۲۷۔ الیمین والیسار فی الاسلام از احمد عباس صالح۔ ص۹۰
۲۸۔ الیمین والیسار فی الاسلام از احمد عباس صالح۔ ص۱۳۸
۲۹۔ ایضاً۔ ص۱۴۲
۳۰۔ اسی کتاب میں امامؑ کی انتظامی اصلاحات کے تحت گفتگو میں ملاحظہ فرمائیے۔
۳۱۔ بحث فی حول الولایہ از سید محمد باقر الصدر
۳۲۔ ثورۃ الحسینؑ از محمد مہدی شمس الدین۔ ص۴۶
۳۳۔ احتجاجِ طبرسی
۳۴۔ صانعوا التاریخ العربی (تاریخ سازانِ عرب) فلپ ہٹے
۳۵۔ الدولۃ العربیہ، سقوطھا نیز تاریخ طبری ج۴۔ ص۳۳۱
۳۶۔ مفاہیم اسلامیہ عامہ۔ الحلقۃ الخامسہ از علامہ سید محمد حسین فضل اللہ۔ ص ۴۳
۳۷۔ الیمین والیسار فی الاسلام۔ ص۱۱۸
۳۸۔ دائرۃ المعارف۔ ص۹۷
۳۹، ۴۰۔ اعیان الشیعہ۔ ج۴۔ ص۲۶ نیز شرح نہج البلاغہ از ابنِ ابی الحدید
۴۱۔ صانعوا التاریخ العربی۔ ص۶۵
۴۲۔ شرح نہج البلاغہ از ابنِ ابی الحدید۔ ج۱۰۔ ص۶۷۔ خطبہ نمبر۱۷۸
۴۳۔ تاریخ کامل ابنِ اثیر۔ ج۳۔ ص۱۸۸
۴۴۔ شرح نہج البلاغہ از ابنِ ابی الحدید۔ ج۱۰۔ ص۶۷۔ خطبہ نمبر۱۷۸
۴۵۔ شرح نہج البلاغہ از ابنِ ابی الحدید۔ ج۲۔ ص۱۸۹۔ خطبہ نمبر۳۴
۴۶۔ شرح نہج البلاغہ از ابنِ ابی الحدید۔ ج۱۔ ص۳۳۲۔ خطبہ نمبر۲۵
۴۷، ۴۸۔ نہج البلاغہ۔ ج۱۔ ص۵۹، شرح نہج البلاغہ از ابنِ ابی الحدید۔ ج۱۔ ص۲۶۹ تا ۲۷۰

امام حسن ابنِ علی علیہ السلام

امام حسنؑ نے اپنے پدرِ گرامی حضرت علی ابنِ ابی طالبؑ کے بعد پریشان کن، پیچیدہ، غیر یقینی اور پُرفتن حالات میں خلافت کی ذمہ داری سنبھالی۔ مذکورہ سخت اور پیچیدہ حالات میں سے ہم درجِ ذیل کا ذکر کرتے ہیں۔

(ا) امام حسنؑ نے اپنی حکومت کی ابتداء ایسے لوگوں کے ساتھ کی جو جہاد کے مقاصد اور اہداف پر واضح اور مکمل ایمان نہ رکھتے تھے۔ نیز دینی و اسلامی نقطۂ نظر سے (معاویہ کے ساتھ آپؑ کی) اس جنگ کے تقاضوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے تھے۔ اس وقت یہ قوم چار گروہوں میں بٹی ہوئی تھی۔

(الف) اموی گروہ

یہ ایسے مضبوط اور با اثر افراد پر مشتمل تھا جن کا اثر و نفوذ قوی تھا اور تعداد میں بھی زیادہ تھے۔ یہ لوگ امام حسنؑ کے حامیوں میں گھس کر معاویہ کے لئے کام کرتے تھے۔ گویا امامؑ کی حرکات و سکنات سے معاویہ کو مطلع کرنے کے لئے جاسوسی کا کام انجام دیتے تھے۔

(ب) خوارج

اہلِ کوفہ کے درمیان یہ لوگ نسبتاً سب سے زیادہ جنگ پر مصر تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے امام حسنؑ کی بیعت کرتے وقت متجاوز گمراہوں کے ساتھ جنگ کی شرط رکھی، لیکن آپؑ نے اس شرط کو ٹھکرادیا۔ پس یہ لوگ امام حسینؑ کے پاس آئے اور بیعت کرنی چاہی جس پر آپؑ نے ان سے فرمایا کہ "خدا نہ کرے کہ میں حسنؑ کی زندگی میں تم لوگوں سے بیعت لوں۔" حسینؑ کا یہ جواب سن کر خوارج امام حسنؑ کی بیعت پر مجبور ہوئے۔ ان لوگوں نے امام حسنؑ کی پالیسیوں کے مقابلے میں خطرناک سازشوں کا جال بچھانے میں بنی امیہ کے ساتھ تعاون کیا۔

(ج) متذبذبین

یہ لوگ خوارج کی تبلیغ سے متاثر تھے۔ گو خود ان میں سے نہ تھے۔ گویا ایسے متذبذب لوگ تھے جو نہ اِدہر کے تھے نہ اُدہر کے۔ ان کی فطرت پر راہِ فرار اختیار کرنے کا غلبہ تھا۔

(د) الحمرا

یہ لوگ زیاد کے سپاہی تھے۔ ان کی قابلِ ذکر خصوصیت یہ تھی کہ یہ ہوا کے رخ پر چلتے تھے اور فاتح و غالب گروہ کے ساتھ مل کر جان کی بازی لگاتے تھے۔ اس دور میں ان کی اہمیت اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ کوفہ کو اپنی طرف نسبت دیتے ہوئے اسے "کوفہ الحمراء" کہتے تھے۔

ان سارے گروہوں کے مقابلے میں امام حسنؑ کے پیروکار وہ لوگ تھے

جنہوں نے امام علیؑ کی وفات کے بعد فوراً آپؑ کی بیعت کی تھی۔ کوفہ میں انہی لوگوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ لیکن دوسرے لوگ ان کی ہر حرکت کو ناکام بنانے کے لئے سازشوں اور فتنہ پردازیوں میں مشغول تھے۔

(۲) دوسری چیز امام حسنؑ اور آپؑ کے والدِ گرامی امام علیؑ کی حیثیتوں میں تاریخی تفاوت تھا۔

یہاں تاریخی تفاوت سے مراد لوگوں کے ذہنوں میں ان دو ہستیوں کی حیثیتوں میں پایا جانے والا فرق ہے۔ وگرنہ خدا کے نزدیک تو ان دونوں پاکیزہ ہستیوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ دونوں ہی معصوم ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اس دور میں سوائے مٹھی بھر لوگوں کے باقی مسلمان امامت کے منصوص من اللہ ہونے پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ اسی لئے ان کا رویّہ امام حسنؑ کے ساتھ ایک ایسے امام کی مانند نہ تھا جس کی اطاعت اللہ کی جانب سے فرض اور اس کی امامت خدا کی جانب سے تصریح شدہ ہو۔ ان کے نزدیک آپؑ کی حیثیت ایک عام خلیفہ کی سی تھی جو سقیفہ والی خلافت کی ایک کڑی ہو۔ یہاں ہماری مراد یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں امام علیؑ کو جو تاریخی حیثیت حاصل تھی وہ ان کے نزدیک امام حسنؑ کو حاصل نہ تھی۔

(۳) آپؑ نے اپنے والدِ گرامی کی شہادت کے فوراً بعد خلافت سنبھالی تھی اس وجہ سے لوگوں کے دلوں میں جنگ کی مقصدیت کے بارے میں شکوک کو تقویت ملی۔ اور وہ یہ سوچنے لگے کہ یہ جنگ دو خاندانوں (بنی ہاشم و بنی امیہ) کی باہمی جنگ ہے نہ کہ ایک اصولی، بامقصد اور نظریاتی جنگ۔

ان اسباب و حالات نے حکومت کے بارے میں امامؑ کی پالیسیوں کو

مشکلات اور پیچیدگیوں سے دوچار کردیا۔

ان اسباب کی بنا پر امامؑ کے آگے چار ممکنہ راستے تھے جن میں سے ایک کو آپؑ نے اختیار کرنا تھا۔ پانچواں راستہ کوئی نہ تھا۔

☆ پہلا راستہ یہ تھا کہ آپؑ روساء اور بااثر افراد کو مال و زر اور عہدوں کے وعدوں سے اپنی طرف مائل فرماتے۔ کچھ لوگوں نے امامؑ کو یہ تجویز دی بھی تھی لیکن آپؑ نے یہ کہہ کر انکار فرمادیا کہ۔

"کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں ظلم کے سہارے کامیابی تلاش کروں؟ خدا کی قسم یہ کبھی نہ ہوگا۔"

☆ دوسرا راستہ یہ تھا کہ آپؑ ابتدا ہی سے صلح کے درپے ہوتے۔ خصوصاً ان حالات میں جب کہ امت عیش و آرام سے زندگی گزارنے کی طالب تھی اور قوم کے روساء معاویہ کے ساتھ ساز باز میں لگے ہوئے تھے۔

آخرکار امام حسنؑ نے ان دونوں راستوں کو قابلِ عمل نہ سمجھا کیونکہ دونوں صورتوں میں کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلتا۔

☆ بنابرایں آپؑ کے سامنے تیسرا راستہ یہ تھا کہ آپؑ ایک ایسی بے فائدہ جنگ لڑتے جس میں آپؑ اور آپؑ کے تمام اصحاب شہید ہوجاتے۔

☆ چوتھا راستہ یہ تھا کہ آپؑ حقیقی پالیسیوں کو صفحہ تاریخ پر ثبت کرتے نیز حق پر ڈٹنے اور حق سے منحرف ہونے والوں کو لوگوں کے سامنے بے نقاب فرمانے کی پوری پوری کوشش کرنے کے لئے ممکنہ وقت تک جنگ

کو طول دینے کے بعد صلح کر لیتے۔

یہاں ہم اپنے طور پر سوال کرتے ہیں کہ کیا ایک بے فائدہ جنگ میں کود پڑنے کا کوئی نتیجہ نکلتا یا اس سے اس دور کے اسلامی معاشرے میں کوئی مثبت تبدیلی آتی؟

اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اس مایوس کن جنگ کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ جنگ کے معاملے میں شکوک و شبہات میں مبتلا تھے۔

اسی بناء پر بہت سے مورخین نے امام حسنؑ پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ آپؑ نے جنگ سے جان چھڑا کر آرام و سکون کی زندگی گزارنے کے لئے تن آسانی و بے ہمتی کا ثبوت دیا اور اپنے حق سے چشم پوشی کی۔

ہم اس بہتان کا جواب یہ دیں گے کہ امامؑ کا اچانک ایک بے نتیجہ جنگ لڑنا لوگوں کی نگاہ میں (عبدالملک کے ساتھ) عبداللہ ابنِ زبیر والی جنگ کی طرح ہوتا۔ جس میں وہ اور اس کے تمام قریبی ساتھی کام آئے۔

اس مقام پر ہم یہ سوال کریں گے کہ کیا کسی مسلمان نے ابنِ زبیر کے بارے میں سوچا؟ اور کیا اس کی جنگ کا اسلام کے حق میں کوئی مثبت نتیجہ نکلا؟ یا ایک اور مصیبت کا پیش خیمہ بنی؟ جواب یہ ہے کہ کسی نے بھی اس کے بارے میں غور نہیں کیا، کیونکہ لوگ اس کے بارے میں ایک واضح نظریہ رکھتے تھے۔ ان کی نظر میں عبداللہ نے ذاتی اقتدار کے حصول کے لئے عبدالملک بن مروان سے جنگ لڑی اور اس کا مقصد اسلام کی حفاظت نہ تھا اور نہ ہی بنی امیہ کی منحرف حکومت کی اصلاح۔

پس اسی قسم کا شک (بلکہ اس سے بھی قوی تر) امام حسنؑ کے زمانے کے لوگوں کو آپؑ کے بارے میں تھا۔ یہاں متعدد تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ اپنی صورتِ حال سے بخوبی واقف تھے اور جانتے تھے کہ آپؑ کو معاویہ کے ساتھ جنگ میں کبھی بھی کامیابی حاصل نہ ہوگی۔ کیونکہ لوگ ذہنی شکوک اور غیر یقینی کیفیت کا شکار تھے۔ امامؑ نے اپنے تاریخی بیانات کے ذریعہ ہمارے لئے اپنے موقف کی وضاحت فرمائی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ آپؑ نے کس طرح اپنے اصحاب کے ساتھ موجود پیچیدہ مسائل کا آگاہی کی ساتھ معالجہ کیا۔ اور دشمن کے مقابلے میں کیسی مناسب پالیسی اپنائی۔ امامؑ کے موثر سیاسی بیان میں ہم حالات کی تلخی اور لوگوں کی بے وفائی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ آپؑ کے ہر لفظ سے اس برحق موقف کا اظہار ہوتا ہے جس پر آپؑ یقین رکھتے تھے۔

یہاں ہم خود امامؑ کی زبانی آپؑ کے دور کے لوگوں' نیز مشکلات کے مقابلے کے سلسلہ میں آپؑ کے موقف کی وضاحت سنیں گے۔ فرمایا :

"میں نے اہلِ کوفہ اور ان کی تُلُوّنُ مزاجی کو خوب سمجھا ہے۔ یہ لوگ میرے کسی کام نہیں آسکتے۔ ان میں وفا کا شائبہ تک نہیں۔ نہ ہی ان کے قول و فعل کا کوئی اعتبار ہے۔ وہ افتراق و انتشار کا شکار ہیں۔ زبان سے یہی کہتے ہیں کہ ان کے دل ہمارے ساتھ ہیں حالانکہ ان کی تلواریں ہمارے خلاف بے نیام ہیں۔"

دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ۔

"تم لوگوں نے مجھے دھوکہ دیا ہے جس طرح سے مجھ سے پہلے والے کو دیا تھا۔ میرے بعد کس امامؑ کی رکاب میں جنگ کروگے؟ کیا اس کافرو

ظالم کے ہمراہ جسے خدا اور اس کے رسولؐ پر کوئی ایمان نہیں۔"

"خدا کی قسم ہم نے ذلت پسندی یا قلتِ عدد کی بناء پر شامیوں کے ساتھ جنگ سے ہاتھ نہیں کھینچا، ہم تو صبر و صلح کے ہتھیار سے ان کا مقابلہ کریں گے۔ ہم صلح و سلامتی کو عداوت اور صبر کو بے قراری سے آمیختہ کریں گے۔ شروع میں جب تم لوگوں نے ہمارا رخ کیا تو اس وقت تمہارا دین تمہاری دنیا پر مقدم تھا لیکن اب تمہاری حالت یہ ہو گئی ہے کہ تمہاری دنیا آگے ہے اور دین پیچھے۔ پہلے تم ہمارے ساتھ تھے لیکن اب ہمارے مخالف ہو گئے ہو۔"

معاویہ کی طرف سے ملنے والے جاہ و مقام اور آسائش کی لالچ میں امامؑ کے طرفدار خیانت اور دشمن کے ساتھ سازباز کی حد تک جا پہنچے۔ یہاں تک کہ کوفہ کے روساء معاویہ کے ساتھ خط و کتابت کرنے لگے اور اس سے وعدہ کیا کہ جب بھی وہ چاہے وہ امامؑ کو دست بستہ اس کے حوالے کریں گے۔ یہی لوگ امامؑ کے پاس آکر اظہارِ عقیدت و اطاعت کرتے اور کہتے کہ۔

"آپؑ اپنے والد کے جانشین ہیں اور ہم آپؑ کے مطیع و فرمانبردار۔ پس جو حکم ہو کیجئے۔"

امامؑ نے ان لوگوں سے فرمایا۔

"خدا کی قسم جھوٹ بولتے ہو۔ خدا کی قسم تم نے اس شخص کے ساتھ وفاداری نہیں کی جو مجھ سے بہتر تھا، مجھ سے کیسے وفا کرو گے؟ میں کیونکر تم پر اعتماد کروں؟ مجھے تم لوگوں پر کوئی بھروسہ نہیں۔ اگر تم سچے ہو تو ہماری تمہاری وعدہ گاہ "مدائن" کی فوجی چھاؤنی ہے، وہاں جمع ہو کر

دکھاؤ۔"

اس کے بعد امامؑ نے مدائن کی طرف کوچ فرمایا۔ لیکن لشکر کے اکثر افراد نے آپؑ کا ساتھ چھوڑ دیا۔

امام حسنؑ کی تاریخ اور آپؑ کی مثبت پالیسیاں ان لوگوں کے منہ پر طمانچہ ہیں جو آپؑ کو اپنے حق سے دست برداری اور ضعف و سستی کا طعنہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپؑ نے معاویہ کا کام چکانے یا اس سے جنگ کرنے کے لئے کچھ کئے بغیر ہی حکومت اس کے حوالے کردی۔

ہم امامؑ کے مثبت موقف کی تائید کرتے ہیں کیونکہ آپؑ کا موقف انحراف کے لئے ایک چیلنج تھا اور آپؑ معاویہ کے ساتھ جنگ کے لئے آمادہ تھے۔ جیسا کہ آپؑ نے فرمایا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ معاویہ کو ہمارے عزمِ سفر کی خبر ملی ہے۔ لہٰذا وہ نکل پڑا ہے۔ خدا تم لوگوں پر رحمت کرے نخیلہ میں اپنی لشکر گاہ کی طرف کوچ کرو۔ تاکہ وہاں پہنچ کر دیکھیں-----"

ایک دوسرے مقام پر امامؑ اشارہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں میں موجود شکوک و شبہات اور مخلص افراد کی قلت کی بدولت جنگ میں کامیابی ممکن نہیں۔ فرمایا۔

"خدا کی قسم میں نے حکومت فقط اس لئے (معاویہ کے) حوالے کی کیونکہ مجھے حامی اور مددگار میسر نہ آئے۔ اگر مددگار ملتے تو میں رات دن مسلسل اس سے جنگ کرتا یہاں تک کہ خدا میرے اور اس کے درمیان فیصلہ فرماتا۔"

ان باتوں کی روشنی میں امامؑ کے سامنے (جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا) یہی ایک راستہ رہ جاتا ہے کہ آپؑ ایک بے فائدہ جنگ لڑتے جس میں آپ شہید ہوتے اور بہت سی جانیں تلف ہو جاتیں۔

امامؑ نے فرمایا۔

"مجھے اس بات کا خوف ہوا کہ کہیں مسلمان صفحہ ہستی سے ختم ہی نہ ہو جائیں۔ بنابرایں میں نے بہتر سمجھا کہ دین کے نام لیوا باقی رہیں۔"

ایک اور موقع پر فرمایا۔

"بے شک معاویہ نے ایک ایسے حق پر میرے ساتھ نزاع کیا جو میرا ہے اس کا نہیں۔ بنابرایں میں نے امت کی صلاح دید اور فتنہ و فساد کی بیخ کنی کے بارے میں سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ معاویہ کے ساتھ مصالحت کر کے جنگ کا خاتمہ کروں۔ میں نے محسوس کیا کہ جانوں کی حفاظت خونریزی سے بہتر ہے۔ میں نے فقط اور فقط تم لوگوں کے فائدے اور بقاء کو مدِ نظر رکھا ہے۔ اگرچہ میرے خیال میں یہ تمہارے لئے باعثِ آزمائش ہے اور اس کا فائدہ مختصر ہے۔"

یہ سارے اجتماعی حالات اس بات کی دلیل ہیں کہ امامؑ اگر جنگ کرتے تو اس کا کوئی بھی مثبت نتیجہ نہ نکلتا اور آپؑ کے عظیم اہداف کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچتا۔ یعنی وہ تبدیلی جو ایک تمدن اور حیات بخش عمل کی حیثیت سے (تمام نسلوں کے لئے) آپؑ کے خدائی مشن کا حصہ تھی، اس جنگ سے حاصل نہ ہوتی۔

یہاں اس جنگ کے اہداف کے بارے میں ہر ذہن میں سوال اٹھنا ضروری

ہے۔ خصوصاً ان حالات کے پیشِ نظر جبکہ امتِ مسلمہ شکوک و شبہات میں مبتلا تھی، جنگ کا سامنا کرنا ان کے لئے سخت تھا اور فتح و نصرت ناممکن نظر آرہی تھی۔ سوال یہ ہے کہ جنگ کے اغراض و مقاصد کیا تھے؟ اس کی نوعیت کیا تھی؟ کیا مقصد فقط دشمنی برائے دشمنی تھا؟ یا ایک ارفع مشن اور عظیم امانت کا مسئلہ درپیش تھا؟ امام حسنؑ نے فرمایا تھا۔

"بے شک شر سے بچنا بھی خیر کی ایک صورت ہے۔"

جب کسی سائل نے آپؑ سے جہل کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے جواب دیا۔

"حالات پر قابو پانے سے پہلے جلد بازی کرنا اور جواب دینے سے عاجز ہونا۔"

"بہت سے مواقع پر سب سے بہترین مددگار خاموشی اختیار کرنا ہے اگرچہ تم فصیح ہی کیوں نہ ہو۔"

دوسرے موقع پر جب آپؑ سے عقل کے بارے میں سوال ہوا تو جواب میں آپؑ نے اپنے موقف کو زیادہ واضح انداز میں بیان فرمایا ہے۔

"موقع کے حصول تک غصے کے گھونٹ پیتے رہنا عقل مندی ہے۔"

ان تاریخی شواہد کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اگر امام حسنؑ ایک فضول جنگ لڑتے تو بڑی حد تک آپؑ کی جنگ عبداللہ بن زبیر کی بے فائدہ جنگ جیسی ہوتی۔ جس سے اسلام اور اس کے ابدی پیغام کو کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ انہی حقائق کی بناء پر امامؑ نے اپنے صائب فیصلے پر عملدرآمد کرتے ہوئے وقتی طور پر صلح قبول کرلی اور معاویہ کو عالمِ اسلام پر تسلط کا موقع دیا۔ تاکہ

اس کی حقیقت واضح ہو جائے اور اس کے غیر اسلامی منصوبے آشکار ہو جائیں۔ نیز ان سادہ لوح مسلمانوں پر بھی حقیقت واضح ہو جائے جن کی معلومات ان کی ظاہر بین آنکھوں یا حواسِ خمسہ تک محدود تھیں اور جو نہیں جانتے تھے کہ معاویہ کون ہے؟ اس کی حکومت کی حقیقت کیا ہے؟ علی ابنِ ابی طالبؑ کون تھے اور ان کے منصوبے کیا تھے؟ بنا بر ایں امامؑ نے صلح کی دعوت ایسے حالات میں قبول کی جب کہ صلح کا قبول کرنا معاویہ کی ظاہری فتح لیکن لوگوں کے سامنے اس کی فریب کارانہ سیاست کے بے نقاب ہونے اور اس کی خصلتوں کے ظاہر ہونے کا باعث بنا۔

معاویہ مسلمانوں کے خون کی حفاظت کا مدعی اس لئے بنا بیٹھا رہا کیونکہ وہ جنگ کے نتائج کو اپنے لئے مفید سمجھتا تھا اور امام حسنؑ کو جنگ پر آمادہ بھی پاتا تھا۔ بنا بر ایں اس نے یہ ٹھانی کہ وہ صلح اور خونِ مسلمین کی حفاظت کے طالب کی حیثیت سے ابھرے۔ لیکن اچانک اسے صلح کے لئے امام حسنؑ کی آمادگی کا سامنا کرنا پڑا۔ یوں اسے اپنی مکّارانہ سیاست ناکام ہوتی نظر آئی۔ خاص کر صلح کے نکات اور دفعات نے اسے بعض امور کے قبول کرنے پر مجبور کر دیا جو درجِ ذیل ہیں۔ (صلح کے یہ نکات شیخ راضی آلِ یاسین کی کتاب "صلح الحسنؑ" کے ص ۲۵۹ تا ۲۶۱ سے ماخوذ ہیں)

☆ حکومت معاویہ کے حوالے کی جائے اس شرط پر کہ وہ کتابِ خدا، سنتِ رسولؐ اور صالح خلفاء کی سیرت پر چلے۔

☆ معاویہ کے بعد حکومت امام حسنؑ کی ہوگی۔ اگر آپؑ کو کوئی حادثہ پیش آیا تو آپؑ کے بھائی حسینؑ حکومت کے حقدار ہوں گے اور معاویہ کو یہ حق نہ ہوگا کہ

وہ کسی کو ولی عہد بنائے۔

☆ معاویہ امیرالمومنین (علیؑ) پر سب و شتم کا سلسلہ بند کرے گا اور آپؑ کا ذکر فقط نیکی کے ساتھ کیا جائے گا۔

☆ کوفہ کے بیت المال میں جو کچھ ہے وہ مستثنٰی ہو گا (اس کی مالیت پچاس لاکھ تھی) اور معاویہ اسے چھوڑ دے گا۔ نیز معاویہ امام حسینؑ کو تیس لاکھ درہم سالانہ دے گا۔ بنی ہاشم کو عطیات میں بنی عبدالشمس پر ترجیح دے گا۔ نیز جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں علیؑ کی رکاب میں شہید ہونے والوں کی اولادوں میں دس لاکھ درہم تقسیم کرے گا۔ یہ مال اہواز کے قریب واقع فارس کے ایک صوبے "ابجرد" کے خراج سے ادا کرے گا۔

☆ لوگ ہر جگہ امان میں ہونگے۔ خواہ وہ شام میں ہوں یا عراق میں، حجاز میں ہوں یا یمن میں۔ معاویہ ہر سیاہ و سفید کو امان دے گا۔ ان کی خطاؤں سے چشم پوشی کرے گا۔ اور ان کے گزشتہ اعمال سے کوئی سروکار نہ رکھے گا۔ نیز اہلِ عراق سے کینہ و عداوت کی بناء پر انتقام نہ لے گا۔ علیؑ کے اصحاب جہاں کہیں ہوں امان میں ہوں گے۔ آپؑ کے شیعوں میں سے کسی کو کوئی اذیت نہیں دی جائے گی۔ آپؑ کے اصحاب اور شیعوں کی جان و مال اور ان کے اہل و عیال کو امان حاصل ہوگی، ان سے کوئی تعرض نہیں ہو گا۔ ہر صاحبِ حق تک اس کا حق پہنچایا جائے گا اور اصحابِ علیؑ کے پاس جو کچھ ہے وہ انہی کے پاس رہنے دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ حسنؑ بن علیؑ اور آپؑ کے بھائی حسینؑ نیز دیگر اہلِ بیتِ رسولؐ کے ساتھ کسی قسم کی خفیہ یا اعلانیہ بدسلوکی نہیں کی جائے گی۔ ان میں سے کسی کو (وہ جہاں کہیں بھی ہوں) ڈرایا دھمکایا نہ جائے گا۔"

امام حسنؑ کا اقدام کامیابی سے ہمکنار ہوا اور معاویہ نے بڑی حد تک خود بخود اپنی حقیقت اور پوشیدہ انحرافات کو بَرملا کرنا شروع کردیا۔ اس نے اتنا بھی انتظار نہ کیا کہ حالات و وقائع زمانہ اس کی حقیقت کو منکشف کریں۔ بلکہ پہلے ہی دن سے اپنے منصوبوں کا اعلان شروع کیا۔ ایک دفعہ کہا :

"خدا کی قسم میری جنگ تم سے اس لئے نہ تھی کہ تم نماز پڑھو' روزہ رکھو' حج کرو یا زکات دو بلکہ میں نے تو فقط تمہارے اوپر حکومت کرنے کے لئے تم سے جنگ کی تھی۔ خدا نے مجھے میرا مقصود عطا فرمایا اگرچہ تم نہ چاہتے تھے۔ آگاہ رہو کہ میں نے حسنؑ کو بہت سے سبز باغ دکھائے ہیں اور اس کے ساتھ کئی ایک وعدے کئے ہیں لیکن آج میں وہ سارے وعدے اپنے قدموں تلے روندتا ہوں' ان میں سے کسی کو پورا نہ کروں گا۔"

اس اعلان کے ساتھ ہی مسلمانوں نے واضح طور پر یہ محسوس کرنا شروع کردیا کہ معاویہ کا منصوبہ دورِ جاہلیت کے آثار کی کڑی ہے جس کا مقصد اسلام کی عمارت کو زمین بوس کرنا ہے۔ نیز یہ کہ امام علیؑ اسلامی اہداف و نظریات کے حقیقی علمبردار تھے' یہاں تک کہ آپؑ کا مختصر سا دورِ حکومت امتِ مسلمہ کی نظر میں ایک آئیڈیل اور ایک شیریں یاد کی حیثیت سے زندہ رہا۔ حالانکہ وہ دور سختی اور تنگی کے عروج کا تھا۔

صلح توڑنے کا مطالبہ

جب معاویہ نے صلح کی متفق علیہ شرائط کو پامال کیا تو بہت سے مسلمانوں

نے امام حسنؑ سے معاہدۂ صلح توڑنے اور دوبارہ معاویہ سے جنگ کرنے کا مطالبہ شروع کیا۔ لیکن آپؑ ان کو یہ جواب دیتے تھے۔

"ان لکل شیءاجل و لکل شیءحساب"

"یعنی ہر چیز کا ایک مخصوص وقت ہوتا ہے نیز ہر امر کا ایک معینہ حساب۔"

نیز فرمایا۔

"یہ (صلح) تمہارے لئے ایک فتنہ ہے اور اس کا فائدہ مختصر۔"

امامؑ صلح توڑنے کے نظریے کے یکسر مخالف نہ تھے البتہ آپؑ مذکورہ بالا اصول (ہر چیز کا ایک مخصوص وقت اور حساب کتاب ہوتا ہے) کے تحت اسے کسی اور وقت پر موکول فرما رہے تھے۔ کیونکہ آپؑ چاہتے تھے کہ معاویہ کی شخصیت خوب اور بہتر واضح ہو جائے اور اس کے ایامِ جاہلیت والے مقاصد و منصوبے ہر ایک کے لئے عیاں ہو جائیں۔

ادہر معاویہ نے امامؑ کے عزائم کو محسوس کرلیا تھا اور جان لیا تھا کہ امامؑ اس کو لوگوں کے سامنے بے نقاب کردیں گے اور کامیابی سے اپنا رول ادا کریں گے۔ یوں مسلمانوں کے سامنے اس کی رسوائی ہوگی۔ لہٰذا اس نے رسوائی سے بچنے اور امامؑ کے اقدامات کو ناکام بنانے کے لئے فوری قدم اٹھایا تاکہ اسے بھی حضرت عثمان والی صورتِ حال کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

معاویہ چونکہ اپنی حکومت کے ذریعے ممکن حد تک دنیوی لذتوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا (یوں اس نے ایک نہ ایک دن لوگوں کے سامنے واضح ہو کر رہنا تھا) اس لئے اس نے اپنی رسوائی چھپانے کے لئے ایسا منصوبہ بنانا شروع کیا

جس کے ذریعے وہ امت کے ضمیر، ارادے اور ظالموں کے ساتھ مقابلہ کرنے کی قوت کو ختم کر کے رکھ دے۔ اسی لئے بیس سال تک معاویہ کی سیاست مسلسل ان منصوبوں کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں گزری تاکہ امت کے ضمیر وارادے کو مردہ کیا جائے، امت کی سوچ کو عظیم اہداف سے ہٹا کر روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے مسائل میں مبتلا رکھا جائے تاکہ وہ ان بلند مقاصد سے بے خبر ہو جائیں جن کا انہوں نے اپنے عظیم پیامبرؐ کی معیت میں (دنیا سے جاہلیت کو مٹانے کے لئے) بیڑا اٹھایا تھا۔ یوں وہ ان اہداف کی بجائے ذاتی مفادات اور بیت المال سے ملنے والی حقیر رقوم کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیں۔

وقتی طور پر معاویہ کے چند ایک منصوبے کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ یہاں تک کہ وہ مسلمان جو قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کو سرنگوں کرنے کی ہمت رکھتے تھے، ان کے افکار آج حقیر عطیات اور پست زندگی کے تصور میں پھنس کر رہ گئے۔ کوفہ کے بعض روساء کی حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ امیرالمومنینؑ کے شیعہ ہونے کے باوجود معاویہ کے لئے جاسوسی کرنے لگے۔ وہ قبائلی روساء کی جانب سے ہونے والی ہر مخالفانہ یا باغیانہ سرگرمی کی اطلاع فوراً معاویہ کو پہنچا دیتے تھے، نتیجہ کے طور پر حکومت کے کارندے آدھمکتے اور ان کو گرفتار کر کے ہر مخالف آواز کا گلا دبا دیتے۔

معاویہ کی حکومت کے یہ بیس سال امتِ مسلمہ کے لئے ذلت و حقارت اور تنگی کے بدترین تاریخی ایام تھے۔ اس دور کا مسلمان یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ وہ مظلوم ہے اور امتِ مسلمہ تباہی و بربادی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ شریعت کے احکام سے کھیلا جارہا ہے، مالِ غنیمت نیز کوفہ و بصرہ کی درمیانی بستیاں اور

آبادیاں قریش کے لئے تر لقمے کی حیثیت اختیار کرچکی ہیں اور خلافت بنی امیہ کے چھوکروں کے ہاتھوں میں ایک گیند بن چکی ہے جس سے وہ خوب کھیل رہے ہیں۔

امام حسنؑ کے موقف کی حمایت

مقامِ افسوس ہے کہ بہت سے تاریخ نویس امامؑ کے بارے میں (اپنے درمیان معروف) اس باطل نظریے کی حمایت کرتے ہیں کہ آپؑ کی قائدانہ صلاحیت کمزور تھی۔ آپؑ نے حالات کے آگے ہتھیار ڈال دیئے، جنگ سے بچنے کے لئے اپنا حق چھوڑ دیا اور اسلامی انقلاب کے ساتھ (نعوذ باللہ) خیانت کرتے ہوئے اسے بغیر کسی جنگ کے (آرام پسندی کی بناء پر) دشمنِ اسلام معاویہ کے حوالے کردیا۔ یہ نام نہاد تاریخ دان اسی قسم کی دیگر باتیں بھی نہایت باآسانی کہہ ڈالتے ہیں۔

اس معروف (لیکن باطل) نظریے کی بنیاد غالباً ان مورخین کا یہ عقیدہ ہے کہ (حکومت سے محرومی کے باعث) ائمہ اہلِ بیتؑ نے اپنی زندگی میں سیاست کے بارے میں عموماً گریز اور پہلو تہی کی روش اختیار کی ہے۔

یہ نظریہ باطل ہونے کے علاوہ تاریخِ ائمہؑ سے ان مورخین کی لاعلمی و جہالت کی بھی دلیل ہے کیونکہ ائمہؑ حکومت سے محرومی کے باوجود پیغمبرؐ کے مشن کی حفاظت، اس کو انحراف سے محفوظ رکھنے نیز اس کو بلند اسلامی اقدار اور اصولوں سے مکمل طور پر دور ہونے سے بچانے کے لئے ہمیشہ اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے۔

اسی لئے جب امام حسنؑ نے معاویہ کے ساتھ مصالحت کی اور حکومت سے دستبردار ہوئے تو آپؑ آرام سے نہیں بیٹھے بلکہ آپؑ امت کی اصلاح، حفاظت اور پاسبانی کرنے، اس کو اسلامی تشخص کے تقاضوں سے آگاہ کرنے اور حیاتِ نو عطا کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔

آپؑ کا یہ مثبت اور موثر کردار آپؑ کے اوپر بہت سی سختیوں اور پابندیوں کا باعث بنا۔ آپؑ کو بار بار شہید کرنے کی کوششوں سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت کو آپؑ کے وجود سے خطرہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپؑ امت کی روز افزوں بیداری کے لئے کوشاں تھے۔ کبھی کبھی وہ آپؑ سے بنی امیہ کے مظالم کے خلاف انقلاب کا خطرہ بھی محسوس کرتے تھے۔

امامؑ کا زہر سے شہید کیا جانا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپؑ امتِ مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کے لئے مسلسل سرگرمِ عمل تھے۔

گزشتہ حقائق کی رو سے یہ معلوم ہوا کہ امامؑ نے امت کی قیادت کے تقاضوں کے مطابق جدوجہد سے کبھی پہلوتہی نہیں کی۔ ادھر معاویہ نے خوب جان لیا تھا کہ امامؑ ایک مشن اور اصول کے علمبردار ہیں۔ بنابرایں مختلف طریقوں سے اپنے مشن کی بالادستی اور حاکمیت کے لئے آپؑ کی زبردست جدوجہد ایک ضروری بات تھی۔

امام حسین ابنِ علی علیہ السلام

امام حسینؑ کا کردار امام حسنؑ کے کردار سے مختلف ہے۔ کیونکہ امام حسینؑ کے دور میں بنی امیہ کے ساتھ جنگ کی ضرورت اور شرعی حیثیت کے بارے میں مسلمانوں کے شکوک زائل ہو گئے تھے۔ اس دور میں مسلمان حضرت علیؑ کے عہدِ حکومت کو یاد کرنے اور آپؑ کی عادلانہ اسلامی حکومت کو بہترین نمونہ سمجھنے لگے تھے۔ انہوں نے یہ درک کر لیا تھا کہ بنی امیہ کی کامیابی دراصل عہدِ جاہلیت کے اشرافی نظام کی کامیابی تھی جس نے رسول اللہؐ اور آپؐ کے اصحاب کی شدید مخالفت کی تھی۔ جسے رسول اللہؐ نے جہاد کے ذریعے ختم کیا اور مسلمانوں نے اس کے ملبے پر اسلام کی بنیادوں کو استوار کیا۔

ہمیں اس دور میں یہ دیکھ کر کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ مسلمانوں نے بنی امیہ کی خود پسندی و تکبر، ان کی طرف سے گزشتہ عداوتوں کے احیاء اور دورِ جاہلیت کی سوچ کی طرف میلان سے نفرت کا اظہار شروع کر دیا تھا۔

بنی امیہ نے اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے اسلام قبول کیا تھا۔ انہوں نے تاریخِ اسلام میں سب سے پہلے کھلے عام بدعتوں اور غیر اسلامی آداب و رسوم کی داغ بیل ڈالی تھی تاکہ ایران و روم کے بادشاہوں کی تقلید کریں۔ اس

طرح انہوں نے خلافت کو قیصرو کسریٰ کی استبدادی اور خاندانی حکومتوں کی شکل میں ڈھال دیا تھا۔۲

یہ حقائق کھل کر مسلمانوں کے سامنے آگئے تھے اور یوں بنی امیہ کے خلاف جنگ کی شرعی حیثیت کے بارے میں شکوک زائل ہوئے۔ جب کہ وہ ایک مدت تک بنی امیہ کے ظلم وستم کی آگ میں جلتے رہے تھے اور بنی امیہ اسلامی اقدار کی حرمت کو پامال کرکے اپنے ذاتی مفادات کی حفاظت کرتے رہے تھے۔ صورتِ حال یہاں تک پہنچی کہ یزید نے اسلامی اصولوں کا اعلانیہ مذاق اڑاتے ہوئے یہ کفر آمیز جملے کہے۔

لعبت بنو ہاشم بالملک فلا ۔۔۔ خبر جاء ولا وحی نزل
لست من خندق ان لم انتقم ۔۔۔ من بنی احمد ما کان فعل۔۳

ترجمہ : "بنی ہاشم نے حکومت کے حصول کے لئے ایک کھیل کھیلا تھا۔ وگرنہ نہ آسمان سے کوئی خبر آئی نہ وحی کا نزول ہوا۔ اگر میں آلِ احمد سے احمد کے کارناموں کا انتقام نہ لوں تو پھر میرا شمار خندق والوں کی اولاد میں نہ ہو۔"

امتِ مسلمہ اور اسلام سے امت کی آگاہی کے بارے میں امام حسینؑ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ پیغمبرؐ کے بعد امتِ مسلمہ نظریاتی بیداری سے لیس نہیں تھی۔ بلکہ پیغمبرؐ سے ان کی وابستگی جذباتی بنیاد پر تھی اور وہ بھی آپؑ کی وفات کے بعد بتدریج کم ہوتے گئے اور اس کی وجہ امت کی علمی اور عملی میدان میں مسلسل غلطیاں تھیں۔

ان غلطیوں میں سے ہر ایک کا جداگانہ اثر ممکن ہے کہ قابلِ توجہ نہ ہو لیکن

جب غلطیوں کے انبار لگ جائیں تو اس کے اثرات خطرناک ہوتے ہیں اور اس کا نتیجہ فتنہ و فساد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ۴۔ جیسا کہ یزید کے زمانے میں امام حسینؑ کو اس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔

امام حسینؑ نے اپنے والد کا پانچ سالہ دورِ حکومت دیکھا تھا۔ جب وہ اس کوشش میں تھے کہ مکمل تباہی سے پہلے امت کی اصلاح اور اسے نشاۃ ثانیہ عطا کر سکیں اور اگر امت اپنے مشن سے دور ہونے پر مصر تھی تو کم از کم اسے اس بات پر آمادہ کر سکیں کہ وہ تاریخ میں آپؑ کے نظریاتی و انقلابی لائحہ عمل کو دوسروں تک منتقل کرے۔

چھٹے سال کے خاتمے سے قبل آپؑ نے اپنے بھائی حسنؑ کے سامنے امت کو آخری سانسیں لیتے اور اپنے نظریاتی وجود کو خیرباد کہتے دیکھا۔ آپؑ نے مشاہدہ کیا کہ امتِ مسلمہ لوگوں کے ایک ایسے ریوڑ کی شکل اختیار کر گئی ہے جو اپنے آپؑ کو بنی امیہ کی بے پایاں دنیوی خواہشات کی بھینٹ چڑھا رہا ہے۔ ۵۔

ان حقائق نے امام حسینؑ کو ایک مایوس کن جنگ لڑنے پر مجبور کیا۔ ایک ایسی جنگ جس میں آپؑ کو وقتی طور پر جنگی نقطہ نظر سے کامیابی حاصل نہ ہو۔

یوں ظاہری اور وقتی طور پر تو آپؑ نے جنگ ہارنی ہی تھی۔ لیکن آپؑ اپنے اس عمل سے امت کے ضمیر کو جھنجھوڑنا اور مسلمانوں کے نظریاتی عزائم کو زندہ کرنا چاہتے تھے۔ حالانکہ مسلمان چھوٹی چھوٹی مصلحتوں کے گرداب میں کانوں تک ڈوب چکے تھے۔

مختصر یہ کہ امام حسینؑ اس نتیجے پر پہنچے کہ امت کو بیدار کرنے کے لئے آپؑ کو ایک سخت فداکاری کے ذریعے اپنے اعزہ و اقارب اور اصحاب کی جانوں کو

قربان کرنے اور کسی قسم کی جانثاری سے دریغ نہ کرنے کی ضرورت ہے۔ خواہ امت کے بہترین افراد کی قربانی پیش کرنی پڑے، خواہ اپنی جان کی۔ ادھر امویوں کی مکّارانہ کوشش یہ تھی کہ امام حسینؑ کے ساتھ بُرا سلوک نہ کیا جائے۔

گو کہ آپؑ کے مفادات محفوظ تھے، آپؑ کا مقام بلند تھا اور آپؑ کی منزلت عظیم۔ امام حسینؑ کے لئے آسائش کے سارے وسائل مہیا تھے۔ لیکن امت نے دیکھا کہ آپؑ نے دنیا کا دروازہ اپنے اوپر بند کرلیا ہے اور ظالموں کے ساتھ نمٹنے نیز اسلامی تعلیمات و نظریات کو انحرافات سے بچانے کے لئے دنیوی مفادات اور ظاہری کامیابی کو خیرباد کہہ دیا ہے۔

ان حالات میں اگر امامؑ قیام نہ کرتے اور صورتِ حال جوں کی توں رہتی تو انحراف کا بحران امتِ مسلمہ اور نومولود اسلامی نظام (جو ایک برتر تمدن کے طور پر پیش ہوا تھا) کو لے ڈوبتا۔

امام حسینؑ نے آنے والے حالات کی ٹھیک ٹھیک پیش بینی کے ساتھ یہ اندازہ کرلیا تھا کہ امت کو باتوں یا جوشیلی تقریروں کے ذریعے بیدار کرنا ممکن نہیں بلکہ امت کے شکست خوردہ عزائم کو بیدار کرنے کے لئے ایک ایسی خونین اور بے مثال قربانی کی ضرورت ہے جو حال اور مستقبل میں آپؑ کے نقطۂ نظر کی صداقت کی واضح دلیل ہو۔

حسینؑ قیام کرتے ہیں

جب امام حسینؑ نے یقین کرلیا کہ اسلامی نظریات ان گمراہ کن مذاہب و اعتقادات کے سائے تلے مٹتے چلے جارہے ہیں جنہیں بنی امیہ نے اپنی ناپاک

حکومت کو تباہی سے بچانے کے لئے رائج کیا تھا تو آپؑ اپنے نظریات کو لے کر میدانِ عمل میں اتر آئے۔ جب آپؑ نے دیکھا کہ اسلامی معاشرہ موجودہ حالات نیز دینی بے حسی اور مادی مظالم کے خوف کے شدید احساس، اس کے علاوہ طویل عرصے تک ظالم حکمرانوں کی اطاعت سے متاثرہ ذہنیت کے نتیجے میں اسلام کے نظریاتی مفاہیم کو زبانی گفتگو اور فکری بحثوں کے ذریعے قبول کرنے سے قاصر ہے۔ تو آپؑ نے میدانِ عمل میں اترنے کے لئے فوری اقدام فرمایا۔ اب آپؑ ہی امت کی بیداری کی آخری امید تھے۔

امام حسنؑ کے دور میں امتِ مسلمہ حقیقی قیادت کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا تھی۔ آپؑ کی صلح کے نتیجے میں لوگ شک سے نکل کر دوبارہ یقین کے مرحلے میں داخل ہوئے۔ لیکن امام حسینؑ کے دور میں ایک اور مشکل مسئلہ درپیش تھا اور وہ یہ کہ امتِ مسلمہ اپنا عزم و ارادہ کھو چکی تھی۔ عزمِ جہاد زائل ہو چکا تھا۔ لوگ ذلت و پستی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اگرچہ وہ بنی امیہ کی اسلام سے دوری کو خوب سمجھتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ امام حسینؑ خلیفۂ برحق ہیں لیکن آپؑ کی مدد کے سلسلے میں ان کے حوصلے اور ارادے ضعیف تھے۔ بقولے ان کے دل آپؑ کے ساتھ تھے لیکن ان کی تلواریں آپؑ کے خلاف۔٦٠

مذکورہ قول اس معاشرتی صورتحال کی صحیح تصویر کشی کرتا ہے جو بنی امیہ کے ہاتھوں ظلم و ستم اور قتل و غارت گری کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ بنابرایں مشکلات اور ذمہ داریوں سے گریز کے لئے حالات کے آگے بے بسی کے بہت سے بہانے وجود میں آئے۔٦٧

ان حالات میں امام حسینؑ اور آپؑ کے ستّر اصحاب نیز خواتین و اطفال

کمربستہ ہو کر نکلے۔ آپؑ نے اپنے موقف کو خوب پہچان لیا تھا۔ آپؑ کو علم تھا کہ عبید اللہ ابنِ زیاد کا لشکر آپؑ کا راستہ روکے گا۔ اور ایسا ہو کر رہے گا اور نتیجہ کے طور پر کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ لیکن آپؑ کو یقین تھا کہ پھر بھی ایک عظیم قربانی کی ضرورت ہے۔ ایسی قربانی جو خون سے رنگین ہو۔ نیز امامؑ جانتے تھے کہ آپؑ ہی وہ واحد فرد ہیں جس میں امت کے عزم و ارادے کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے قربانی پیش کرنے کی اہلیت ہے۔۸۔

خلاصہ یہ کہ شکست خوردہ عزائم کی بیداری اور مردہ ضمیروں کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے کامیاب ترین راہِ حل کے طور پر آپؑ کا خونچکاں انقلاب معرضِ وجود میں آیا۔ کیونکہ آپؑ کو معلوم تھا کہ آپؑ کی عادلانہ جنگ اور دردناک شہادت ہی مسلمانوں کو اپنی اجتماعی صورتِ حال پر تجدیدِ نظر اور حقیقی تفکر پر آمادہ کر سکتی ہے۔ اور ساتھ ساتھ معاشرے کو بھی اس کی بدحالی اور مستقبل کے خطرات و احوال سے آگاہ کر سکتی ہے۔ امامؑ چاہتے تھے کہ آپؑ کی اس بے مثال قربانی سے حال و مستقبل کے بارے میں آپؑ کے نظریات کی بھی تصدیق ہو جائے۔۹۔

پس امام حسین علیہ السلام نے اپنی المناک شہادت کے ذریعے امت کے ان عزائم کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش فرمائی جو خود ساختہ مذاہب و نظریات کے باعث بے حس ہو چکے تھے۔ امامؑ نے چاہا کہ آپؑ کی شہادت ظالم حکمرانوں کی پشت پر کوڑوں کی مانند برسے اور اسے لہولہان کر دے اور غافل انسانوں کو بیدار کر دے تاکہ وہ آگاہی کے ساتھ مکتبِ اسلام کے حوالے سے اپنا احتساب آپ کریں۔ نیز نظریاتی شکوک اور عادلانہ قیادت کے بارے میں شبہات کا خاتمہ ہو

اور امت ایک ایسا موقف اختیار کرے جس کی بنیادیں ہر قسم کے انحراف سے پاک اور شریعتِ اسلامی کے اصولوں کے مطابق استوار ہوں۔

انقلاب کو روکنے کی کوششیں اور انحراف کا مقابلہ نہ کرنے کے نصائح

خونین انقلاب کے لئے امامؑ کے عزمِ صمیم کے مقابلے میں آپؑ کو نصیحت کرنے اور سمجھانے کی متعدد کوششیں ہوئیں تاکہ آپؑ کوئی ایسا اقدام نہ کریں جو یزید کے ساتھ جنگ پر منتج ہو۔ دلیل یہ تھی کہ ممکنہ عسکری تصادم کی صورت میں شکست اور ناکامی یقینی ہے۔ لیکن امامؑ کو اپنی خداداد اور بے عیب بصیرت کی بناء پر بخوبی علم تھا کہ آپؑ کی المناک شہادت ہی آپؑ کی کامیابی ہوگی۔ امامؑ کو وقتی عسکری فتح نہ ملنے کی کوئی پروانہ تھی۔ آپؑ کو مددگاروں کی کمی کا بھی علم تھا۔

امام حسینؑ کے انقلاب کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپؑ کے اہداف و مقاصد اور انقلابِ کربلا کے نتائج کا وقتی عسکری فتح اور حصولِ اقتدار سے قطع نظر مطالعہ کیا جائے۔

ہمارے پاس اس بات کے کافی شواہد موجود ہیں اور واضح فرمودات کی بھی کمی نہیں کہ امامؑ کو اپنے انجامِ کار کا بخوبی علم تھا۔ جب آپؑ کو ساز باز اور خاموشی کا مشورہ ملا اور موت سے ڈرایا گیا تو آپؑ نے فرمایا۔

"میں نے زندگی کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ میں امرِ خداوندی کو عملی جامہ پہنانے کا عزم کرچکا ہوں"۔۱۰

آپؑ کے بھائی محمد بن حنفیہ نے آپؑ کو یوں ناصحانہ مشورہ دیا :

"اے برادر آپؑ میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہستی ہیں۔ میں نے اپنی نصیحتوں کو فقط آپؑ کے واسطے جمع کر رکھا ہے اور آپؑ ہی ان کے اہل ہیں۔ جہاں تک ہو سکے یزید کی بیعت سے کنارہ کشی کیجئے اور اس کے زیرِ فرمان شہروں اور علاقوں سے دوری اختیار کیجئے" ۔۱۱۔

آپؑ نے جواب میں فرمایا۔

"شاءاللہ ان یرانی قتیلا و ان یر النساء سبایا"

"خداوندِ عالم چاہتا ہے کہ مجھے مقتول دیکھے اور خواتین کو اسیر" ۔۱۲۔

ادہر عبداللہ بن زبیر نے آپؑ سے مدینہ میں رہنے کی گزارش کی تو آپؑ نے انکار فرمایا۔ اس نے کہا :

"اگر آپؑ حجاز میں رہنا پسند فرمائیں تو ہم آپؑ کے غم خوار، مددگار و خیر خواہ ہوں گے اور آپؑ کی بیعت کریں گے۔ لیکن اگر آپؑ حجاز میں بیعت لینا پسند نہ فرمائیں تو مجھے بیعت لینے کا حکم دیں۔ اس صورت میں آپؑ کی اطاعت ہوگی اور کوئی آپؑ کی نافرمانی نہ کرے گا" ۔۱۳۔

احنف بن قیس (جو بصرہ کے پانچ عمائدین میں سے ایک تھا) نے امام حسینؑ کی خدمت میں یہ لکھا۔

"امابعد آپؑ صبر کیجئے کیونکہ خدا کا وعدہ سچا ہے۔ ہوشیار رہئے گا وہ لوگ جو اس امر پر یقین نہیں رکھتے نہیں وہ آپؑ کو سبکبار بنا دیں" ۔۱۴۔

عبداللہ بن جعفرِ طیار نے اپنے دو بیٹوں (عون و محمد) کے ہمراہ آپؑ کو یہ پیغام تحریر کیا۔

"آپ کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ میرا یہ خط ملتے ہی اپنا ارادہ بدل

دیجئے۔ کیونکہ آپؑ کے اس سفر میں مجھے خطرہ نظر آتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپؑ قتل ہو جائیں اور آپ کے اہلِ بیتؑ برباد۔ اگر آپؑ قتل ہو جائیں تو زمین تاریک ہو جائے گی کیونکہ آپؑ پرچمِ ہدایت اور مومنین کی امید ہیں۔ پس سفر میں تعجیل نہ کیجئے"۔۱۵۔

لیکن امام حسینؑ کو اپنے انجامِ کار کا علم تھا۔ آپؑ ان حضرات کو یہ جواب دیتے تھے۔

"اگر میں کسی کیڑے کے بل میں بھی گھس جاؤں تو یہ لوگ مجھے وہاں سے بھی باہر نکال کر اپنا مقصد حاصل کریں گے"۔۱۶۔

عمر بن لوذان بھی آپؑ کو نصیحت کرنے اور انجامِ کار سے ڈرانے کے لئے حاضرِ خدمت ہوا اور عرض کیا۔

"اے فرزندِ رسولؐ آپ کو خدا کا واسطہ اپنا ارادہ بدل دیجئے۔ خدا کی قسم آپؑ نیزوں کی نوک اور تلواروں کی دھار کا ارادہ فرما رہے ہیں۔ ہاں جن لوگوں نے آپؑ کے نام پیغامات بھیجے ہیں، اگر وہ جنگ میں آپؑ کی مطلوبہ مدد کے لئے آمادہ ہوں اور اپنی تلواروں کے ساتھ آپؑ کی اطاعت کریں تو پھر ان کی طرف جانا غلط خیال نہیں"۔۱۷۔

لیکن امامؑ نے انہیں یہ فیصلہ کن جواب دیا۔

"حقیقت مجھ سے پوشیدہ نہیں لیکن حکمِ خدا کے آگے چارہ نہیں۔ یہ لوگ اس وقت تک مجھے نہ چھوڑیں گے جب تک میرا خون نہ بہالیں"۔۱۸۔

ان شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ کو ایک مقررہ وقت پر کربلا میں اپنی شہادت کا علم تھا۔

اگر کوئی شخص امامؑ کا وہ خطبہ پڑھے جو آپؑ نے مکہ سے عراق کی طرف روانگی سے پہلے دیا تھا تو مذکورہ بالا بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ آپؑ نے اس خطبے میں فرمایا تھا۔

"گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ بیابانی بھیڑیے اس زمین میں جو نواویس اور کربلا کے درمیان ہے میرے بدن کے جوڑ ایک دوسرے سے جدا کررہے ہیں۔ پس وہ مجھ سے اپنی امید کے شکم اور خالی توشہ دان پُر کررہے ہیں۔ قلمِ تقدیر نے جو دن مقرر کیا ہے اس سے مفر نہیں۔ ہم اہلِ بیتؑ اس امر پر راضی ہیں جو خدا کی منشاء کے مطابق ہو۔ ہم اس کی آزمائش پر صبر کریں گے۔ وہ ہمیں صابرین کا اجر عطا فرمائے گا" ؎۱۹۔

قیام کب جائز ہوتا ہے؟

مذکورہ بالا وجوہات کی بناء پر امام حسینؑ کو اپنے عہد کی ظالم اور اسلام دشمن اموی حکومت کے خلاف انقلاب اور قیام کا جواز حاصل ہوا۔

کسی بھی قیام اور اس کے جواز کا حالات کی نزاکت اور اسلامی اصولوں سے ان حالات کی دوری کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر اور حکمِ شرعی سے گہرا تعلق ہے۔

اس لحاظ سے اسلام کا نقطہ نظر مختلف حکومتوں اور مختلف حالات کی مناسبت سے مختلف ہوتا ہے۔

درحقیقت طرزِ حکومت درجِ ذیل چند صورتوں کے علاوہ نہیں ہوتا۔

☆ یہ کہ حکومت کی بنیاد اسلام کے وضع کردہ اصولوں پر استوار ہو۔ اور

اپنے سارے قوانین ان اصولوں سے اخذ کرے اور انہی کے مطابق خود کو ڈھالے۔ اسلامی تعلیمات کو زندگی کی بنیاد قرار دے اور زندگی کے تمام شعبوں کے لئے اسلام ہی کو قانون سازی کا منبع قرار دے۔

☆ یہ کہ اسلام کو اپنے لئے قانون سازی کا منبع قرار نہ دے اور احکامِ اسلام کو انسان کے لئے نظامِ حیات نہ سمجھے۔ اس لحاظ سے ایسی حکومت غیر اسلامی (کافر) ہوگی خواہ حکومت چلانے والا (حکمران) بذاتِ خود مسلمان ہو یا کافر۔ کیونکہ حکومت کے اسلامی ہونے اور حکمران کے کلمہ گو مسلمان ہونے کے درمیان کوئی نسبت نہیں۔ عین ممکن ہے کہ حکومت غیر اسلامی ہو لیکن حکمران مسلمان۔ ان باتوں کی روشنی میں ہم حکومت کو دو مختلف قسموں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

☆ قسمِ اوّل

پہلی قسم یہ کہ حکومت انسان کے اوپر خدا کی حاکمیت و سرپرستی اور قانونِ الٰہی کے آگے انسان کے سرِ تسلیم خم ہونے کی بنیاد پر استوار ہوگی۔ اس صورت میں حکمران مومن، مسلمان اور خدا کا فرمانبردار ہوگا اور حکومت کی بنیاد اسلام۔ اس پہلی قسم کی بھی تین صورتیں ہوسکتی ہیں۔

(الف) یہ کہ حکمران معصوم ہو اور اس کا کوئی قول و فعل یا کام اسلامی اصولوں کے منافی نہ ہو۔ مثال کے طور پر ائمہ معصومینؑ۔

(ب) یہ کہ حکمران (خود معصوم نہ ہو لیکن) معصوم کا نائب ہو یا اسلام کے نظریہ حکومت کے مطابق چلنے والا ہو۔

(ج) یہ کہ حکمران نہ معصوم ہو نہ معصوم کا نائب نہ جائز حاکم بلکہ ایسا فرد ہو جو اپنے زورِ بازو سے حکمران بنا ہو۔ یعنی اسلامی اصولوں اور نظریہ حکومت کی بناء پر اسے حکومت نہ ملی ہو۔

اب مذکورہ بالا حقائق کی رو سے ہمارے سامنے تین صورتیں آتی ہیں۔

پہلی صورت

اگر قیادت معصوم کے پاس ہو تو اس صورت میں انحراف ممکن نہیں۔ کیونکہ معصوم حکمران (یعنی معاشرے میں اسلامی احکام کو نافذ کرنے والا شخص) اپنے قول و فعل میں انتہائی ممکنہ حد تک اسلام کے مطابق چلتا ہے۔ وہ اپنی عصمت کی بناء پر کبھی منحرف نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا امت کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ہر امر میں اس معصوم حکمراں کی مکمل اطاعت کرے تاکہ راہِ اسلام میں پیش قدمی جاری رہے اور عظیم اسلامی اہداف تک رسائی حاصل ہو۔

دوسری صورت

یعنی اگر حکمران اسلامی اصولوں کے مطابق چلنے والا ہو تو اس صورت میں حکمران کی حیثیت قانونی تو ہوگی لیکن وہ معصوم نہ ہوگا۔ بنابرایں جب تک حکمران اسلامی اصولوں کا پابند رہے گا انحراف واقع نہ ہوگا۔ کیونکہ انحراف کی صورت میں حکمران کی اہلیت خود بخود سلب ہو جاتی ہے۔

اس صورت میں اس بات کا امکان موجود ہے کہ حاکم اسلام کی مصلحتوں کا غلط اندازہ لگا بیٹھے۔ یعنی کسی اسلامی موضوع کے بارے میں اجتہادی غلطی کر بیٹھے۔ پس جب حاکم ایسی غلطی کر بیٹھے تو ضروری ہے کہ حتی الوسع اس کو خبردار

کیا جائے اور ایسے بہتر راستے کی طرف رہنمائی کی جائے جو اسلام کی حقیقت کا زیادہ آئینہ دار ہو اور جس سے مکتبِ اسلام اور امتِ مسلمہ کی فی زمانہ زیادہ نمائندگی ہوتی ہو۔

البتہ اگر حاکم اپنی رائے پر مصر رہے (خواہ حاکم کی تنبیہ ممکن ہو یا نہ ہو) تو اس صورت میں لامحالہ ساری امت پر لازم ہے کہ اس کی رائے کا اتباع کرے۔ خواہ اس کی خطا کی معترف ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ حاکم کی حکمرانی سے مراد اس کی رائے کے مطابق امور کا چلایا جانا اور اس کی رائے کا امت کے اوپر نافذ ہونا ہے۔ پس امت کے ہر فرد کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ اپنی رائے کے مطابق علیحدہ علیحدہ موقف اختیار کرے۔

بنابرایں اگر کوئی شخص حاکم کی رائے اور حکم کے برخلاف کسی حکمِ شرعی پر چلے تو گناہگار ہوگا۔ کیونکہ اسلامی حکمران کے حکم کے بعد مسلمانوں کے لئے حکمِ شرعی اسی کا حکم ہوگا۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا حکم مسلمانوں کے لئے شرعی حیثیت کا حامل نہ ہوگا۔ اس لئے کہ کسی شخص کے لئے ایک ہی مسئلے میں ایک سے زیادہ حکمِ شرعی کا ہونا ممکن نہیں۔

تیسری صورت

یہ کہ حاکم اسلامی اصولوں کے مطابق حکومت چلائے لیکن خود انحراف کا شکار ہو۔ مثال کے طور پر خلفاء ثلاثہ جنھوں نے امام علیؑ اور آپؑ کی آل کا حقِ خلافت غصب کیا۔

پس ان کا طرزِ حکمرانی، اسلامی ضوابط اور نظریات کے مطابق تھا لیکن ان

کی حیثیت حکمران کے تعین کے اسلامی اصولوں کے برخلاف تھی۔ بنابرایں انحراف حکمران کی ذات میں تھا نہ کہ اس اصول میں جس کے مطابق حکومت چل رہی تھی۔ اس حالت کے پیشِ نظر ہمارے سامنے دو مفروضے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ حاکم کے انحراف کا خطرہ فقط اسلامی اصولوں کو لاحق ہو اور دوسرا یہ کہ اس انحراف سے اسلامی معاشرے کی بنیادیں بھی متاثر ہوں۔

پس اگر حاکم کا انحراف اسلامی معاشرے کی بنیادوں کے لئے خطرہ ہو تو اس صورت میں امتِ مسلمہ پر لازم ہے کہ نظریۂ امربالمعروف و نہی عن المنکر کی رو سے اس انحراف کے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑی ہو۔ اور فقہی کتب میں مذکور شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس اسلامی اصول (امربالمعروف و نہی عن المنکر) کو عملی جامہ پہنائے۔ نیز امت کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ اگر حاکم کے انحراف سے اس کے حقوق کو خطرہ ہو تو اپنے جائز حقوق کی حفاظت کے لئے اقدام کرے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کوئی مظلوم ظالموں کے مقابلے میں اپنے حقوق کا دفاع کرتا ہے۔ یہ اس حق کے ضمن میں ہے جو اسے اپنے نفس کے جائز دفاع کے لئے حاصل ہے۔

لیکن اگر مفروضہ انحراف سے خود اسلام کے اصولوں کو خطرہ ہو۔ ساتھ ساتھ اسلامی تشخص اور اسلامی معاشرے کی بنیادیں بھی متاثر ہوں تو اس صورت میں جہاد کا مرحلہ آجاتا ہے۔ تاکہ مکتبِ اسلام کو اس عظیم خطرے سے نجات دی جاسکے۔ لہٰذا جب اسلام کو نظریاتی خطرہ لاحق ہو تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ جہاں ضرورت پڑے، حکمرانوں کی بے راہ روی کا مقابلہ کریں۔ البتہ اس سلسلے میں ان حدود کو مدِ نظر رکھنا ہوگا جو اسلام کے نظریے اور اصولوں کی بقاء نیز

انحراف سے نجات کے لئے ضروری ہوں۔

✪ قسمِ دوم

دوسری قسم یہ ہے کہ حکومت غیر اسلامی اور کافرانہ بنیادوں پر استوار ہو۔ اور لادینی نظریات کے تحت حکومت کا کام چلایا جائے۔ اس قسم کی حکومت اسلام کے لئے واضح چیلنج اور خطرے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس مقام پر دو حالتوں کا فرض کرنا ممکن ہے۔

پہلی حالت یہ کہ انحراف اسلام کے بنیادی نظریات اور اصولوں کے لئے خطرناک ہو۔

دوسری حالت یہ کہ اسلام کے بنیادی نظریات کو انحراف کا کوئی خطرہ نہ ہو۔

لیکن عملاً یہ دونوں مفروضے غیر ممکن ہیں۔ کیونکہ جب حکومت غیر اسلامی اصولوں پر استوار ہو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے انہی اصولوں پر اپنی بنیاد رکھی ہے اور اپنا نظریۂ زندگی اختیار کیا ہے۔ بنابراین وہ اپنے نظریات اور افکار کی حمایت کرے گی اور زندگی کے بارے میں اپنی پالیسی اور خاص روش کی تبلیغ کرے گی۔ اس سلسلے میں حکومت اپنی تمام تر قوتوں کو استعمال میں لائے گی۔ تاکہ مسلمانوں کو اپنے مشن سے بیگانہ اور دینی نظریات و عقائد سے دور کیا جاسکے۔ اس صورت میں اسلام کے وجود کی بنیادیں ہی تباہی و بربادی کے خطرے سے دوچار ہوں گی۔

◐ ⊜ ◑

ان مذکورہ حقائق کی روشنی میں حسینیؑ انقلاب کو خاص نقطۂ نظر سے جانچنا

چاہئے۔ خاص کر اس حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد کہ امام حسنؑ نے وقتی طور پر سیاسی معرکہ آرائی سے ہاتھ کھینچ کر معاویہ کے ساتھ صلح کا اعلان فرمایا تھا۔ یاد رہے کہ یہ صلح امام حسنؑ نے اس وقت قبول کی تھی جب آپؑ کی حکومت کے لئے نظامِ اسلام کا عملی نفاذ مذکورہ وجوہات کی بناء پر ممکن نہ تھا۔ خصوصاً امت اور عوامی حلقوں (جن پر حضرت علیؑ کی حکومت موقوف تھی) کے اذہان میں موجود شکوک و شبہات میں اضافے کی بناء پر جو امام حسنؑ کی قیادت کے دور میں مخصوص حالات کے تحت اور بھی گھمبیر شکل اختیار کر گئے تھے۔ یہاں تک کہ آپؑ کے لئے جہاد کا برقرار رکھنا ممکن نہ رہا تھا اور اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی تھی کہ پہلے دشمن کی حقیقت کو لوگوں پر عیاں کیا جائے۔

ان معروضات کے پیشِ نظر امام حسنؑ نے وقتی اور عارضی طور پر سیاسی اور عسکری کارروائی روک دی تاکہ معاویہ کی حقیقت لوگوں پر منکشف ہو جائے اور اس کے غیر اسلامی منصوبوں کا پول کھل جائے۔ یوں آپؑ کی قیادت بھی بحال ہو سکے اور آپؑ پر عوام کا اعتماد بھی۔ اسی لئے ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ زندگی کے آخری ایام میں معاویہ نے اپنی معنوی حیثیت کھو دی تھی اور مسلمانوں کے دلوں میں اپنے کرتوتوں کو صحیح دکھانے کے لئے اس نے جو چالیں چلی تھیں ان کا اثر بھی زائل ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا بیٹا اور ولی عہد یزید بھی اس کے لئے رحم کی دعا نہ کر سکا اور نہ ہی اس کی تعریف میں ایک لفظ ادا کر سکا۔ اور جب ضحاک بن قیس معاویہ کی موت کا اعلان کرنے کے لئے منبر پر چڑھا تو وہ بھی معاویہ کی تعریف و تمجید سے عاجز رہا۔ اور اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ "بتحقیق معاویہ مر چکا اور اپنے اعمال کے ساتھ چل بسا۔"

امام حسنؑ کے ساتھ صلح کے نتیجے میں جب معاویہ حکومت پر براجمان ہوا تو اس نے اپنے منصوبوں اور اپنی غیر اسلامی قیادت کو مستحکم کرنے کے لئے دو مختلف زاویوں سے مسلسل جدوجہد شروع کی۔

(الف) فکری زاویے سے

اس لحاظ سے معاویہ نے اسلامی آئیڈیالوجی کو مٹانے، مسخ کرنے اور اس کا مقام گھٹانے کی کوشش کی۔ بنی امیہ کی سب سے بڑی کامیابی شاید یہی تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کی انقلابی فکر پر کنٹرول حاصل کیا۔ نیز مسلمانوں کے درمیان اہلِ بیتِ رسولؐ کو حاصل روحانی مقام اور غلبہ کا زور توڑا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے لوگوں کے دینی شعور کو بے حس بنایا اور بنی امیہ کی حکومت کے لئے خود ساختہ شرعی جواز پیدا کئے۔ بنی امیہ نے اسلامی نظریے کو مٹانے اور مسخ کرنے کے لئے درجِ ذیل طریقے اختیار کئے۔

☆ جعلی احادیث گھڑنے اور حضرت علیؑ کو بُرا بھلا کہنے یا رسول اللہؐ پر جھوٹ باندھنے کی اہلیت رکھنے والے مناسب افراد کو من پسند جھوٹی احادیث بنانے پر معقول معاوضہ دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کام کے لئے تشویق اور تخویف کے تمام ممکنہ ہتھکنڈے اختیار کئے گئے۔ خاص کر سقیفہ کے واقعے اور اس کے آثار و نتائج کو من گھڑت، خود ساختہ اور جعلی طریقوں سے پیش کرنے کی کوشش ہوئی۔ تاکہ اسلام کے حقیقی نظریے کو مسخ کیا جائے اور یوں بنی امیہ کی حکومت کے لئے کوئی نہ کوئی جواز (خواہ معمولی ہی کیوں نہ ہو) ہاتھ لگ سکے اور اسلام کے حقیقی

لائحہ عمل کو اپنانے کے سلسلے میں امتِ مسلمہ کی امیدوں پر پانی پھیرا جاسکے، کوشش یہ تھی کہ امتِ مسلمہ معاویہ کے خود ساختہ اسلام کے مطابق زندگی گزارنے پر آمادہ ہوجائے۔

رہے وہ لوگ جو رسول اللہؐ سے جھوٹی احادیث منسوب کرنے میں معاویہ کے احکام کی اطاعت کرنے سے انکار کرتے تھے تو ان کو ہر طریقے سے ڈرانے اور دبانے کی کوشش کی گئی۔ تاکہ یہ لوگ اسلامی تعلیمات و نظریات کے ان گوشوں کو آشکار کرنے سے باز رہیں جو حکومت و سیاست اور طرزِ حکمرانی سے مربوط ہیں۔

اسی لئے معاویہ نے عام الجماعہ (جس سال امام حسنؑ کے ساتھ صلح ہوئی اور پوری حکومت معاویہ کو مل گئی) کے بعد اپنے عاملوں کو لکھا کہ۔

"اس شخص کو امان حاصل نہیں جو علیؑ اور ان کے اہلِ بیت کی شان میں کوئی بات نقل کرے۔"

اس کے بعد سے خطیب حضرات ہر مقام اور منبر سے حضرت علی علیہ السلام پر سب و شتم اور آپؑ سے بیزاری کا اظہار کرنے لگے۔ کوفہ میں چونکہ آپؑ کے شیعوں کی تعداد زیادہ تھی لہٰذا ان کو سب سے زیادہ سختیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی بات کے پیشِ نظر معاویہ نے زیاد بن سمیہ کو وہاں کا گورنر بنایا اور بصرہ کو بھی اسکی حکومت میں شامل کیا۔ "زیاد" شیعوں کی تلاش میں لگا رہتا تھا اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کو قتل کرتا تھا۔ وہ ان کے ہاتھ پاؤں قطع کرتا، ان کی آنکھیں نکال لیتا، ان کو کھجور کے درختوں پر سولی چڑھا دیتا اور ان کو عراق سے نکال باہر کرتا تھا۔۲۰

عمرو بن عاص، ابو ہریرہ، مغیرہ بن شعبہ اور عمرو بن زبیر وغیرہ کی گھڑی ہوئی احادیث کے منحوس اثرات ظاہر ہوئے اور ان کے خبیث نتائج بنی امیہ کی مکمل اور اندھی اطاعت کی صورت میں سامنے آئے۔۲۱

☆ معاویہ نے اپنی حکومت بچانے کے لئے اسلام کے نام پر سیاسی فرقہ سازی شروع کی۔ ان فرقوں کی گمراہ کن توجیہات اور تفسیریں گھڑیں اور ان کو خود ساختہ اسلام کے سانچوں میں ڈھالا۔ ان فرقوں میں سے ایک "جبریہ" کے نام سے معروف ہوا اور دوسرا "مرجیہ" کے نام سے۔ ان رذیل اعمال کے پس پردہ یہی مقصد کارفرما تھا کہ بنی امیہ کے خلاف کوئی انقلاب یا قیام برپا نہ ہو۔

یاد رہے کہ معاویہ وہ پہلا شخص ہے جس نے نظریہ جبر پیش کیا اور اس کی حمایت شروع کی۔ اس طرح وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اس سے صادر ہونے والے سارے اعمال قضاء الٰہی کا نتیجہ ہیں۔ تاکہ اس کے اعمالِ قبیحہ کی توجیہ ہو سکے۔ اس نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس کے اعمال برحق ہیں اور خدا نے اسے لوگوں کے لئے خلیفہ و امام بنایا ہے۔۲۲

معاویہ اپنے موقف کی حمایت میں بار بار قرآن کی یہ آیت پیش کیا کرتا تھا "یوتی الملک لمن یشاء" "یعنی خدا جسے چاہتا ہے حکومت عطا کرتا ہے۔" وہ اسی بات کو دلیل بنا کر اپنے کرتوتوں کی توجیہ کرتا تھا۔

رہا فرقہ مرجیہ تو اس کے معتقدین بھی معاویہ کی حکومت کے پشت پناہ ثابت ہوئے۔ ان کے نظریات و اعتقادات کی بنیاد معاویہ کی خلافت کو جائز ثابت کرنا اور مسلمانوں کو اس کی اطاعت کے وجوب کا قائل بنانا تھی۔ گناہانِ کبیرہ کا

ارتکاب کرنے والوں کے بارے میں مرجئہ کا نظریہ یہ تھا کہ ان کو کچھ نہ کہا جائے اور ان کا مسئلہ خدا پر چھوڑ دیا جائے۔۲۳۔

یہ لوگ کہتے تھے کہ ایمان سے مراد زبان سے اقرار کرنا ہے۔ اور عمل سے ایمان کا کوئی ربط نہیں۔۲۴۔

سب سے پہلے حسان بن بلال المزنی نے بصرہ میں لوگوں کو اس مذہب کی طرف دعوت دی۔۲۵۔ اس کی یہ دعوت مقبول ہوئی کیونکہ اہلِ بصرہ کو اس مکتبِ فکر (مرجئہ) کی صورت میں ان کی متاع گم گشتہ مل گئی تھی۔ یہ لوگ جنگِ جمل و صفین اور نخیلہ میں پیش آنے والے ہولناک حوادث کے نتیجے میں جنگ سے اکتا کر آرام و عافیت کی زندگی کو ترجیح دینے لگے تھے۔ ہوتے ہوتے یہ نظریہ مذہبی شکل اختیار کر گیا۔ یہ نظریہ اہلِ بصرہ کی آرام پسندی اور راحت طلبی کا غماز تھا۔۲۶۔ بغیر کسی مبالغے کے ان لوگوں کی اکثریت نے فرقہ مرجئہ کو اپنایا۔ یوں وہ اپنے ذاتی اور اندرونی امور میں کھو کر رہ گئے۔۲۷۔

ان کو اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ ان کے اوپر کس قسم کی حکومت مسلط ہے۔ وہ حکومت کو غیر اسلامی نہ سمجھتے تھے اور اپنے مذہب کی رو سے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ پُر آشوب اوقات میں انسان کو فقط اپنی فکر کرنی چاہئے۔ اس عقیدے کی حمایت میں وہ مندرجہ ذیل حدیث سے مدد لیتے تھے، جسے وہ نبی کریمؐ سے منسوب قرار دیتے تھے۔

> ''عنقریب فتنے برپا ہوں گے۔ جس میں بیٹھے رہنے والے چلنے والوں سے بہتر ہوں گے اور چلنے والے دوڑنے والوں سے۔ خبردار! جب وہ فتنہ آجائے تو جس کسی کے پاس اونٹ ہو وہ اس اونٹ سے ملحق ہو جائے۔

جس کے پاس بھیڑ بکریاں ہوں وہ انہی کے ساتھ رہے اور جو زمین کا مالک ہو وہ اسی سے سروکار رکھے۔"

ایک صحابی نے سوال کیا کہ اگر کسی کے پاس نہ زمین ہو نہ اونٹ اور نہ بکریاں تو وہ کیا کرے؟

فرمایا :

"ایسا شخص اپنی تلوار کی دھار کو کند کرے اور خود کو اس فتنہ سے نجات دلائے"۔۲۸۔

وہ لوگوں پر حکمرانی کے مسئلے کو خدا پر چھوڑتے تھے۔۲۹۔

بہرحال ہم دیکھتے ہیں کہ دینی بے حسی کا ہتھیار کارگر ہوا اور لوگوں کے ارادوں پر غالب آگیا۔ دینی شعور گرنے لگا یہاں تک کہ اسلام کے نظریۂ حیات کو شدید خطرہ لاحق ہوگیا۔

(ب) امتِ مسلمہ کے زاویے سے

اس زاویے سے معاویہ نے لوگوں کو ذلیل و خوار بنانے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کئے۔ علاوہ ازایں امتِ مسلمہ کے تشخص کو ختم کرنے اور مسلمانوں کے درمیان نسلی، علاقائی اور قومی عداوتوں کی آگ بھڑکانے کے لئے مسلسل کوششیں کیں۔ یہاں تک کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن مسلمانوں نے کسریٰ کے ساتھ ٹکرلی اور اس کے مقابلے میں کمالِ خودداری کے ساتھ مردانہ وار آن کھڑے ہوئے۔ نیز جن کو دور دراز کے اجنبی مظلوموں کے دکھوں کا بھی احساس تھا۔ وہی مسلمان مختصر سی مدت میں اس قدر بدل چکے تھے کہ آج انہیں اپنی حقیر

آمدنی اور ذاتی مفادات کے علاوہ کسی چیز کی فکر نہ رہی تھی۔

خلاصہ یہ کہ بنی امیہ نے اپنے دشمنوں کا قلع قمع کرنے اور مخالفتوں کی روک تھام کے لئے جبرو تشدد کے تمام حربے استعمال کئے اور درجِ ذیل طریقوں سے کام لیا۔

(۱) دہشت

فقط شبہ کی بناء پر لوگوں کی گرفتاری عمل میں آتی تھی۔ اس سلسلہ میں ابنِ زیاد کا کردار آج تک سب کو معلوم ہے۔ اس نے ایک بار لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے مجرم کے بدلے بے گناہ کو پکڑنے کی دھمکی دی۔ یہاں تک کہ جب حجر بن عدی نے اسے اس بات پر ٹوکا اور خدا کا یہ کلام یاد دلایا "ولا تزروا زرۃ و زر اخری" "یعنی کسی شخص کو دوسرے کے گناہوں کی سزا نہ ملے گی۔" تو حجر کے ساتھ وہ سلوک ہوا جو تاریخ میں معروف ہے۔[۳۰]

(۲) بھوک

بنی امیہ کی سیاسی پالیسی یہ تھی کہ عراقیوں کی تنخواہوں میں کمی کی جائے۔[۳۱] اور شامیوں کی تنخواہوں میں اضافہ ہو۔ اس عمل کی توجیہ میں معاویہ یہ کہتا تھا کہ۔

> "زمین خدا کی ہے، میں خلیفۂ خدا ہوں۔ پس مالِ خدا سے جتنا لوں وہ میرا بن جاتا ہے اور جس قدر چھوڑ دوں اس میں بھی تصرف کا حق رکھتا ہوں۔"

(۳) نسلی اور قبائلی تعصبات کو ہوا دینا

معاویہ اس حربے کو دو مقاصد کے لئے استعمال کرتا تھا۔ ایک تو کچھ قبائل کو اپنا حلیف بنانے اور ان کی حمایت کو یقینی بنانے کے لئے اور دوسرا یہ کہ اگر ان میں سے کسی سے اپنے اقتدار کو خطرہ میں پائے تو انہیں آپس میں لڑادے۔ معاویہ نے غیر عرب مسلمانوں کے خلاف عرب قومیت کے تعصب کو ہوا دی۔ مورخین ان غیر عرب مسلمانوں کو "موالی" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ۳۲۔

(۴) اجتماعی جلاوطنی

زیاد بن سمیہ عراق کے والی نے پچاس ہزار کوفیوں کو کوفہ چھوڑ کر خراسان جانے پر مجبور کیا۔ یوں کوفہ اور خراسان دونوں میں مخالفت کا قلع قمع کیا۔ ۳۳۔

معاویہ کی غیراسلامی سازشیں اور امام حسینؑ کا موقف

امتِ مسلمہ کے تشخص کو ختم کرنے کے لئے معاویہ کی طرف سے ہونے والی سازشوں کے پیشِ نظر امام حسینؑ کے لئے ضروری تھا کہ آپؑ ایک ایسا موقف اختیار کرتے جو دو پہلوؤں کا حامل ہوتا۔

(الف) اسلامی نظریے کو مسخ کرنے کی سازش کے خلاف

چنانچہ اس میدان میں امامؑ کا موقف یوں ظاہر ہوا کہ آپؑ نے رسول اللہؐ کے مشن کے حامل بچے کھچے مہاجرین و انصار پر مشتمل اصحاب و تابعین وغیرہ کو ان دشوار ترین حالات میں جمع کیا۔ انہوں نے آپؑ کی دعوت پر لبیک کہا۔ یہ لوگ باہم جمع ہوئے تھے تاکہ رسول اللہؐ کی جن احادیث کا انہیں علم تھا انہیں

لوگوں کے لئے نقل کریں۔ در واقع ان احادیث میں سے ہر ایک کی بڑی قدر و قیمت ہے۔ کیونکہ انہوں نے یہ احادیث ان حالات میں بیان کیں جب کہ معاویہ کی تلوار ان کے سروں پر لٹک رہی تھی۔

اس قسم کے موقف اور جرات مندانہ اقدامات کے ذریعے امام حسینؑ اسلامی نظریے کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یوں آپؑ نے امتِ مسلمہ کے اذہان میں یہ حقیقت ثبت فرمادی کہ محمدؐ کے مشن کے حامل باقی ماندہ نیک اور صالح افراد تمام تر شجاعت و مردانگی کے ساتھ ظالم حکومت کی قوت و جبروت کے سامنے اسلام کے حقیقی پیغام کو بیان کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔

(ب) امت کی سطح پر

اس لحاظ سے آپؑ نے جو موقف اختیار فرمایا وہ ایک سیاسی مبارزے کی صورت میں تھا جس کے ذریعے آپؑ نے بنی امیہ کی حکومت کو للکارا۔ امام حسینؑ کی نظر میں امت کو ایک موقع دینے کی ضرورت تھی تاکہ وہ بذاتِ خود بنی امیہ کی سازشوں کی حدود اور ان کے غیر اسلامی افکار و نظریات کی حقیقت کو درک کرلیں۔ چنانچہ اب امت بنی امیہ کے انحراف کی حقیقت سے آگاہ ہونے لگی تھی۔ وہ امام علیؑ کی حکومت کو حسرت سے یاد کرنے لگے تھے اور جذبات کا رخ بھی تابناک ماضی کی طرف مڑ گیا تھا۔ امت کو شک کی بیماری سے نجات مل چکی تھی اور اب کوئی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ امام علیؑ کی کوششیں ذاتی مفادات یا اقتدار کے لئے تھیں۔ بلکہ یہ بات عیاں ہوچکی تھی کہ معاویہ کے ساتھ آپؑ کی جنگ ویسی تھی جیسی عرب جاہلیت کے خلاف رسول اللہؐ کی جنگ۔ کیونکہ وہی

جاہلیت اب اسلام کا لبادہ اوڑھ چکی تھی تاکہ مسلمانوں کے مخالفانہ جذبات کا سامنا کئے بغیر دوبارہ سیاسی مرکز پر قبضہ کرلے۔

لیکن افسوس کہ امتِ مسلمہ (معاویہ کی سازشوں کے نتیجے میں) ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہوچکی تھی جو پہلی والی بیماری سے زیادہ خطرناک اور سخت تھی اور وہ بیماری تھی امت میں اصلاح وانقلاب کے لئے عزم وہمت اور قوتِ ارادی کا فقدان۔ چنانچہ امت سب کچھ جانتی تھی لیکن اصلاح اور اپنے مرض سے گلوخلاصی پر قادر نہ تھی۔ امت کو احساس تو تھا لیکن علاج کا یارا نہ تھا۔ خلاصہ یہ کہ افرادِ امت کی نظر میں کسی چیز کو اتنی اہمیت حاصل نہ تھی جتنی اس ظاہری مادی زندگی کو جسے وہ ذلت وعاجزی اور خواری کے ساتھ گزار رہے تھے۔

ان حالات کے پیشِ نظر امام حسینؑ نے دیکھا کہ اب خوابِ غفلت میں غرق لوگوں کے درمیان اسلام کی پکار بلند کرنے کے لئے ہر چیز آمادہ ہے تاکہ یہ آواز ان کی سماعت سے ٹکرائے اور ان کو بیدار کرے! اگرچہ اس کا اثر اس وقت نہ سہی ایک مدت بعد ہی کیوں نہ ہو۔ امام حسینؑ وہ پہلے فرد تھے جنہیں امت کے درمیان اس قدر کامیابی حاصل ہوئی اور جس نے امت کی اندرونی اصلاح کے واسطے اپنا سب کچھ قربان کیا۔ آپؑ نے اس مقصد کی راہ میں کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کیا، خواہ آپؑ کو امت کے بہترین افراد کے خون کا خراج دینا پڑے یا اپنا خونِ جگر بہانا پڑے۔

مرگِ معاویہ کے بعد امام حسینؑ کا موقف

جب معاویہ کی موت کے بعد اس کے بیٹے یزید نے امام حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ کیا تو امام حسینؑ کے سامنے چار ممکنہ موقف تھے۔ جن میں سے کسی ایک کو

بہرصورت آپؑ نے اختیار کرنا تھا۔

☆ پہلا موقف یہ کہ آپؑ یزید کی بیعت کرتے۔ جیسا کہ آپؑ کے پدرِ بزرگوار امام علیؑ نے ابوبکر، عمر اور عثمان کی بیعت کی تھی۔

☆ دوسرا موقف یہ کہ آپؑ بیعت سے انکار فرماتے اور مکہ یا مدینہ میں رسول اللہؐ کے حرم کے پاس اپنے گھر میں مقیم رہتے اور تقدیرِ الٰہی کا انتظار فرماتے۔

☆ تیسرا موقف یہ کہ آپؑ عالمِ اسلام کے کسی اور حصے میں چلے جاتے۔ جیسا کہ محمد بن حنفیہ نے آپؑ کو یمن جا کر اسلامی معاشرے کی تشکیل اور اس کے بعد مرکز سے جدائی کا مشورہ دیا تھا۔

☆ چوتھا موقف یہ کہ آپؑ بیعت سے انکار کرتے ہوئے کوفہ کی طرف حرکت فرماتے اور اہلِ کوفہ کی تحریری دعوتوں کو قبول فرماتے۔ اور یوں اس راہ میں شہید ہو جاتے (جیسا کہ واقع ہوا)۔

مذکورہ بالا چار راہوں میں سے کسی ایک کا انتخاب آپؑ کو لامحالہ کرنا تھا۔ لیکن یہاں اس بحث سے ہمارا مقصود یہ دیکھنا ہے کہ امام حسینؑ نے صرف آخری موقف ہی کو کیوں اختیار فرمایا؟

امامؑ نے آخری موقف کو اپنایا کیونکہ آپؑ اپنے زمانے کے حالات کی نوعیت سے مکمل طور پر آگاہ تھے۔ آپؑ نے اپنے موقف کی بنیاد انہی حقائق پر رکھی اس لئے کہ آپؑ اپنی اس پالیسی کے ذریعے امتِ مسلمہ کے مختلف گروہوں کا معالجہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ گروہ درجِ ذیل ہیں۔

پہلا گروہ

یہ گروہ امت کے سب سے بڑے حصے پر مشتمل تھا۔ جو عہدِ معاویہ میں اجتماعی خرابیوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت و قوت سے محروم ہو چکا تھا اور اپنے آپؑ کو معاویہ کی حکومت کے آگے بے بس اور ادنیٰ سمجھتا تھا' اس حکومت کے سامنے جس نے اسلامی خلافت کو ہرقل و کسریٰ کی حکومتوں کی مانند استبدادیت میں بدل کر غیر اسلامی آداب و رسوم کو ترویج دی تھی۔ ۳۴۔

اس صورتِ حال کے نتیجہ میں امت کے اندر انحرافات کا مقابلہ کرنے کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ اس کے برعکس وہ مکمل طور پر شہوتوں اور دنیوی لذتوں کی اسیر ہو چکی تھی۔ اب ان کے پاس وہ عقل و دل باقی نہ رہے تھے جن کے بل پر وہ فاسد ماحول کی اصلاح کے لئے اقدام کرتے۔ اس قسم کے معاشرے کی فرزدق نے اپنے اس قول سے خوب تصویر کشی کی ہے کہ :

"قلوبھم معک و سیوفھم علیک"

"ان کے دل آپؑ کے ساتھ ہیں لیکن ان کی تلواریں آپؑ کے خلاف۔"

ان کو معلوم تھا کہ بنی امیہ دن رات اسلام کی پامالی میں مصروف ہیں لیکن وہ مخالفت یا اعتراض کرنے کی ہمت اور طاقت سے محروم ہو چکے تھے۔

دوسرا گروہ

یہ گروہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو پیغمبرؐ کے مشن کو اتنی اہمیت نہیں دیتے تھے جتنی اپنے ذاتی مفادات اور انانیت کو۔ یہاں تک کہ عظیم اسلامی اہداف

ان کی نظروں سے بتدریج او جھل ہوگئے اور ان کی جگہ حقیر، پست اور بے قیمت خواہشات نے لے لی۔

امت کے پہلے گروہ اور اس دوسرے گروہ میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر کو اسلام پر ٹوٹنے والی مصیبت کا علم تھا اور انحراف و ظلم سے بھی آگاہ تھے۔ لیکن ان میں مقابلے کی ہمت و طاقت نہ تھی لیکن موخر الذکر کو تو سرے سے احساسِ زیاں ہی نہ تھا۔

تیسرا گروہ

یہ امت کے ان سادہ لوح اور غافل افراد پر مشتمل گروہ تھا جو بنی امیہ کے دھوکے کا شکار ہو چکے تھے۔

اس سے قبل ہم یہ جان چکے ہیں کہ رسول اللہؐ کے بعد عملاً اسلامی خلافت اپنے حقیقی شرعی مفہوم سے دور ہونے لگی تھی۔ گرچہ خلافت کے مفہوم میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی تھی لیکن معاویہ کے دور میں ہم یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ خلافت کے مفہوم میں بھی بڑی تبدیلی واقع ہوگئی۔ لوگوں نے خلافت کو اسلامی حکومت سمجھنا چھوڑ دیا۔ کیونکہ خلافت قیصر و کسریٰ کی استبدادی حکومتوں کا روپ دھار چکی تھی۔ ۳۵۔

معاویہ نے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے اپنی حکومت کو شرعی لبادہ اوڑھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اگر معاویہ اپنے اس کھیل اور خلافت کے مفہوم میں تباہ کن تبدیلی لانے میں کامیاب ہو جاتا اور صحابہ اس خطرناک تبدیلی پر خاموش رہتے تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ بہت سے سادہ لوح مسلمان اس

حیلے سے متاثر ہو جاتے اور وہ صحابہ کے سکوت کو ان کی رضامندی پر محمول کر کے اس تبدیلی کو شرعی و قانونی طور پر صحیح سمجھنے لگتے۔

چوتھا گروہ

اس گروہ کے نظریات حکومت سے امام حسنؑ کی دست برداری اور صلح (جسے آپؑ نے خاص پیچیدہ حالات میں ایک رہبر اور نظریۂ اسلام کے محافظ و امین کی حیثیت سے واحد معقول راہ کے طور پر قبول کیا تھا) کے نتیجے میں پروان چڑھے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ امام حسنؑ کی صلح کی حقیقت ان لوگوں پر خاطر خواہ طور پر واضح نہیں تھی۔ غالباً امام حسنؑ کا موقف عالمِ اسلام کے اہم مرکزی مقامات جو حالات سے متاثر رہے اور اس المیے کے قریبی شاہد بھی تھے مثلاً کوفہ و عراق وغیرہ کے علاوہ دیگر جگہوں کے مسلمانوں کے لئے واضح صورت میں سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ مسلمان جو عالمِ اسلام کے دور دراز مقامات اور آخری سرحدوں مثلاً خراسان وغیرہ میں رہ رہے تھے (جن کا اسلامی دنیا کی نت نئی مشکلات و مسائل سے واسطہ نہیں پڑتا تھا۔ اور جو مشکلات کی تپش سے اس طرح آشنا نہ تھے جس طرح کوفہ میں امام حسنؑ) وہ معرکۂ گیر ودار اور پیچیدہ مسائل سے فقط معمولی سی آگاہی حاصل کر سکے تھے (وہ بھی مسافروں کی زبانی) اور حالات و حقائق سے مکمل آگاہی ان کے بس میں نہ تھی۔

اسی بناء پر امام حسینؑ نے اپنی قوتِ تدبیر کی بدولت آخری موقف اختیار کیا۔ اور تمام مسلمانوں خاص کر دور دراز رہنے والوں، جنہوں نے امام حسنؑ کی صلح اور حکومت سے دستبرداری کی خبر دور سے سنی تھی کے لئے اعلان کیا کہ

امام حسنؑ کی صلح اور حکومت سے دستبرداری کا مطلب یہ نہیں کہ اہلِ بیتؑ نے اس تبدیلی کو اصولی طور پر تسلیم کرلیا ہے یا وہ معاویہ کے غیر اسلامی اہداف اور منصوبوں سے متفق ہیں۔

بنابرایں امام حسینؑ کے سامنے یہی ایک راستہ تھا تاکہ آپؑ مذکورہ حقائق و اسرار اور حالات کو واضح کرسکیں اور امت کے مذکورہ چاروں گروہوں کا معالجہ فرمائیں۔ یہ آخری موقف اپنائے بغیر آپؑ کے کسی بھی ہدف کی عملی تعبیر ممکن نہ تھی کیونکہ۔

★ آپ کے لئے پہلا موقف اختیار کرنا (اور یزید کی بیعت کرنا جس طرح امام علیؑ نے خلفاء ثلاثہ کی بیعت کی تھی گرچہ وہ اس کے اہل نہ تھے) ممکن نہ تھا۔ کیونکہ اس صورت میں آپؑ امت کے مذکورہ چار گروہوں کے معالجے کے لئے کچھ بھی نہ کرسکتے تھے۔ علاوہ ازایں ہم یزید کی حیثیت اور خلفاء ثلاثہ کی حیثیت کو بھی مساوی قرار نہیں دے سکتے۔ کیونکہ یزید جو تبدیلیاں لے کر آیا وہ نہایت خطرناک اور بنیادی نوعیت کی تھیں۔ یزید اسلامی خلافت کے مفہوم ہی کو بدل دینے کے درپے تھا۔ اس تبدیلی کا مقصد چہروں کی تبدیلی نہ تھا۔ یعنی یہ کہ خلافت برقرار رہتی اور اس کے اسلامی اصولوں کو کوئی دھچکا نہ لگتا۔ بلکہ یزید اور امویوں کا ارادہ خلافت کے مفہوم اور اس کے بنیادی اصولوں کو بدل ڈالنا تھا۔ اور یہی امر مسلمانوں کی تاریخ کے اس تاریک دور کے بعد سے معروف ہوگیا۔

ان وجوہات کے پیشِ نظر، خطرناک سازشوں اور تحریف کو ناکام بنانے کے لئے امام حسینؑ اور آپؑ کے اہلِ بیتؑ و اصحابؓ کی طرف سے مسلح ٹکراؤ کی ضرورت پیش آئی۔

★ امامؑ دوسرا موقف بھی اختیار نہ کرسکتے تھے جو یہ تھا کہ آپؑ مکہ یا مدینہ میں قیام فرماتے اور بیعت کئے بغیر مذکورہ تحریف اور تبدیلی پر اپنے دکھ درد کا اعلان فرما کر حالات کو خدا کے سپرد کر کے بیٹھ جاتے۔

واضح ہو کہ اس دور کے خاص حالات امام حسینؑ کے اختیار کردہ موقف کی مکمل طور پر تائید کرتے ہیں۔ امامؑ نے بذاتِ خود بار بار اس بات کی تصریح فرمائی تھی کہ اگر آپؑ مدینہ یا مکہ میں قیام فرماتے تو بنی امیہ آپؑ کا پیچھا کر کے آپؑ کو شہید کر دیتے۔ خواہ آپؑ کو کعبہ کے پردوں ہی سے لپٹا ہوا کیوں نہ پاتے۔ عملاً بھی ایسا کرنے کی کوشش ہوئی کیونکہ یزید نے تیس افراد کو خفیہ طریقے سے روانہ کیا تاکہ وہ حج کے ایام میں امام حسینؑ کو شہید کر ڈالیں۔ اسی بناء پر آپؑ حج کو عمرۂ مفردہ میں بدل کر مکہ سے نکلنے پر مجبور ہوئے۔ (جبکہ لوگ حج کے مناسک میں مصروف تھے) تاکہ کعبے کا تقدس برقرار رہے۔ وگرنہ آپؑ کے قتل سے کعبے کا تقدس برقرار نہ رہتا۔

علاوہ ازایں آپؑ کے یوں قتل ہو جانے کا کوئی اثر نہ ہوتا اور یوں آپؑ امت کے مذکورہ چار گروہوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچا پاتے۔ کیونکہ راہِ خدا میں فاسق و فاجر یزید کی بیعت سے انکار کی بناء پر یونہی آپؑ کا قتل ہو جانا اور بات تھی اور پیغمبرِ اسلامؐ کے مشن کی حفاظت کے لئے باقی ماندہ مسلمانوں کے جذبات کو شعلہ ور نیز ان کے مُردہ ارادے اور وقار کو زندہ کر کے شہید ہونا اور بات۔

لوگ عام طور پر دین یا کسی عقیدے کو اس وقت تک مانتے رہتے ہیں جب تک ان کا جذباتی لگاؤ برقرار رہے، اگرچہ ان کے دلوں میں نظریاتی چمک دمک باقی نہ رہے۔ ان دلوں کو عقیدے کی طرف واپس لانے کے لئے ایسے عمل کی

ضرورت ہوتی ہے جو جذبات کو ابھارے اور ظاہر ہے کہ یہ مقصد ایک رہ گزر میں قتل ہوجانے سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ مذکورہ جذبات کو حرکت میں لانے کے لئے ان تمام عوامل کو یکجا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے لئے مہمیز کی حیثیت رکھتے ہوں اور وہ بھی اس حد تک کہ عمر بن سعد جیسا قاتل بھی رونے پر مجبور ہوجائے جو لشکرِ عدو کا سردار تھا اور جس نے امامؑ اور آپؑ کے بہترین ساتھیوں کے خلاف قتل و غارت گری کا حکم دیا تھا۔

★ تیسرا ممکنہ موقف جو آپؑ نے اختیار نہیں کیا وہ یہ تھا کہ آپؑ یمن یا اس جیسے کسی دور دراز سرحدی مسلمان علاقے میں تشریف لے جاتے اور وہاں اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لئے سعی فرماتے۔

اگر امامؑ یہ موقف اختیار کرتے تو نہ صرف یہ کہ کوئی کامیابی حاصل نہ ہوتی بلکہ آپؑ لوگوں سے کٹ کر تنہا رہ جاتے، کیونکہ اس دور میں عالمِ اسلام کے دیگر علاقوں کی بہ نسبت شام، عراق، مدینہ اور مکہ انقلابات کے مراکز تھے۔ اسی لئے امامؑ نے اپنے انقلاب کے لئے اس جگہ کو منتخب کیا جو حادثات و انقلابات کی آماجگاہ تھی، تاکہ اس انقلاب کے نتائج تمام عالمِ اسلام میں پھیل سکیں۔ اور اس کے نفسیاتی، تربیتی اور اخلاقی اثرات تمام مسلمانوں پر مرتب ہوں۔

اس صورت میں آپؑ اسلامی معاشرے کی اصلاح کے لئے کیونکر مرکز سے دور یمن جاکر گوشہ نشین ہوجاتے؟ جب کہ اس مطلوبہ اسلامی معاشرہ کا خواب آپؑ کے والدِ بزرگوار امام علیؑ کے دور میں شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا تھا حالانکہ آپؑ کوفے میں تھے۔ تو پھر حسینؑ کو یمن میں رہ کر یہ موقع کیسے فراہم ہوتا جب کہ یمن اسلامی دنیا کے مراکز سے دور ایک خطہ تھا۔ خلاصہ یہ کہ تیسرا مجوزہ موقف

بھی امتِ مسلمہ کی روحانی، نفسیاتی اور ذہنی بیداری کے لئے امامؑ کے موقف کے برخلاف تھا۔

مذکورہ بالا حقائق کے پیشِ نظر امام حسینؑ نے چوتھا موقف اختیار کیا، تاکہ اس طرح امت کے مختلف گروہوں کے مردہ ضمیر بیدار ہوں نیز ان کو اسلام کے مشن اور بلند مقاصد سے وابستہ رہنے کی اہمیت کا احساس ہو۔

شکست خوردہ ذہنیت اور امام حسینؑ

ہم نے امام حسینؑ اور انقلاب کے بارے میں ہونے والی ان بعض کوششوں کا تذکرہ کیا جن کا مقصد آپؑ کو انحراف و ضلالت کا مقابلہ نہ کرنے کی نصیحت کرنا اور حکومت کی کھلم کھلا مخالفت سے باز رکھنا تھا۔ امامؑ کو عام مسلمانوں کے علاوہ بعض بزرگوں بالاخص آپؑ کے بعض رشتہ داروں اور مددگاروں کی طرف سے بھی اس قسم کی نصیحتوں کا سامنا ہوا۔

یہ سارے نصائح مسلمان روساء اور بزرگوں کے بشمول باقی امت کی روحانی و نفسیاتی شکست کی واضح علامت ہیں جو اخلاق و کردار اور خواہشات کی رو سے خوفناک تباہی کا شکار ہو چکے تھے۔

امامؑ نے محسوس کیا کہ ایک ایسی امت (جو اپنے عزائم، ارادوں اور ذوقِ عمل سے محروم ہو چکی ہو اور قربانی پیش کرنے سے کتراتی ہو) کا واحد علاج یہ ہے کہ آپؑ تعداد کی کمی اور مددگاروں کی قلت کے باوجود ایک المناک قربانی پیش کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوں۔ جیسا کہ آپؑ نے فرمایا۔

"الا و انی زاحف بهذه الاسرة علی قلة العدد و خذلان

الناصر"

"بتحقیق میں تعداد کی کمی اور مددگاروں کی قلت کے باوجود اس گھرانے کے ساتھ نکل پڑا ہوں۔"

واضح رہے کہ امت کی بیماری جس قدر شدید ہو اسی تناسب سے قربانی کو بھی عظیم ہونا چاہیے۔

لوگوں کی شکست خوردہ ذہنیت مستقبل میں استبداد کرنے والوں کے ہاتھوں میں ایک موثر قوت بننے والی تھی اور وہ اس کے ذریعے لوگوں کی ذلت پذیر ذہنیت کو باقی رکھتے ہوئے اس میں مزید گہرائی اور وسعت پیدا کرتے۔ یوں مردانگی و شجاعت کو جذباتیت اور مسلمانوں کے معاملات کے بارے میں احساسِ ذمہ داری کو عجلت پسندی و عدم سنجیدگی اور اسلام و مسلمین کی خاطر فداکاری کے جذبے کو سبکی و غیر معقولیت قرار دیتے۔ امامؑ اس شکست خوردہ ذہنیت اور احساسِ کمتری کو جڑ سے اکھیڑنا چاہتے تھے۔ ساتھ ہی اس کی جگہ ایک ایسی تازہ ذہنیت اور جدید روح پھونکنے کا ارادہ کر چکے تھے جو امت کے عزم و عمل کی قوت سے ہم آہنگ ہو۔

مذکورہ منفی ذہنیت کے وسیع اثرات کے بارے میں بہت سے شواہد ملتے ہیں جن کا مشاہدہ امامؑ کو پیش آنے والے اہم ترین اور سخت ترین تاریخی مواقع پر ہوتا ہے۔ چنانچہ جب حبیب ابنِ مظاہر اسدی امام حسینؑ سے اجازت لے کر اپنے اہلِ قبیلہ (بنی اسد) کو آپؑ کی مدد کی دعوت دینے گئے لیکن اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ لوگ امامؑ کا ساتھ دینے کی بجائے اسی رات علاقہ چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کے برعکس عبیداللہ ابنِ زیادہ مسلم بن عقیل کی شہادت کے دو

ہفتے بعد ان ہزاروں لوگوں کو جو اب تک امام علیؑ کے مکتب کے حامی اور آپؑ کے دوستدار بنے ہوئے تھے، اپنا مطیع بنانے اور اپنے لشکر میں شامل کرنے میں کامیاب ہوا۔ مسلمؑ اور ہانیؒ کا المیہ بھی مسلمانوں کے درمیان مذکورہ ذہنیت کے دائرے کی وسعت کو واضح کرتا ہے۔ چنانچہ ابنِ زیاد نے ہانی بن عروہ کو ملاقات کی دعوت دی۔ اس سے قبل اسے معلوم ہو چکا تھا کہ ہانی نے مسلم کو اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے۔ ابنِ زیاد نے ہانی پر مسلم کو چھپا کر رکھنے، بنی امیہ کی حکومت کے خلاف خروج کی سازش کرنے اور امت کے درمیان افتراق ڈالنے کا الزام لگایا۔ ہانی نے غصے سے جواب دیا کہ وہ مسلم کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور وہ ان الزامات کو قبول بھی نہیں کرتے لیکن ابنِ زیاد اپنی بات پر اڑا رہا اور اب کی بار ہانی کو صاف دھمکی دی اور کہا "تمہیں اسے (حضرت مسلم کو) حکومت کے حوالے کرنا ہوگا۔"

ہانی نے نہایت مردانگی کے ساتھ جواب دیا۔ "اگر مسلم میرے قدموں کے نیچے پوشیدہ ہوتے تو پھر بھی میں اپنے قدم نہ اٹھاتا۔"

جب ہانی یہ جملے ادا کر رہے تھے تو اس وقت ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ وہ کوفہ کے ممتاز افراد میں سے ہیں اور دسیوں ہزار افراد ان کی پشت پناہی اور حفاظت کریں گے۔

جب ابنِ زیاد کا غصہ تیز ہوا تو اس نے ہانی کو قید کرنے کا حکم دیا۔ ہانی کی گرفتاری کی خبر کوفہ میں پھیل گئی اور یہ خبر بھی نکل پڑی کہ ہانی کے قتل کا منصوبہ ہے۔ چند ہی گھنٹوں بعد عمرو بن حجاج اپنے قبیلے کے چار ہزار افراد کے ساتھ اس خبر کی تصدیق کے لئے آیا اور دارالامارہ کے دروازے پر پہنچ کر ہانی کو زندہ رکھنے کا

مطالبہ کرنے لگے۔ اس موقع پر ابنِ زیاد نے قاضی شریح کو بلا کر اس سے درخواست کی کہ وہ وساطت کا کام انجام دے اور اس کمرے میں جانے کے لئے کہا جہاں ہانی قید تھے تاکہ اس کے بعد مجمع کے سامنے گواہی دے کہ ہانی زندہ ہیں اور ان کی موت کی افواہ بے بنیاد ہے۔ جب ہانی نے شریح کو دیکھا تو چیخ کر کہا ''مسلمان کہاں چلے گئے؟ اگر دس مسلمان بھی محل پر حملہ کرتے تو مجھے بچا سکتے تھے کیونکہ اس محل میں نہ فوج ہے نہ محافظ۔'' ہانی کا مقصد یہ تھا کہ اگر دس آدمی بھی راہِ خدا میں مرنے مارنے پر تل جاتے تو کوفہ کی حالت بدل جاتی۔

قاضی شریح لوگوں کو اطمینان دلانے اور عمرو بن حجاج کے سامنے ہانی کے زندہ ہونے کی گواہی دینے کے لئے نکلا۔ شریح کا کہنا ہے کہ میں دوسری بار لوٹا تاکہ عمرو بن حجاج کو ہانی کی یہ خواہش سناؤں کہ اگر دس آدمی بھی قصر پر حملہ آور ہوں تو اسے بچا سکتے ہیں۔ میں نے یہ بات بتانی چاہی لیکن میں نے اپنے پہلو میں ابنِ زیاد کے ایک جاسوس محافظ کو موجود پایا تو میں ڈر کر خاموش ہو گیا، اور مطلوبہ گواہی پر ہی اکتفا کیا۔ اس کے بعد عمرو بن حجاج اور اس کے ساتھی لوٹ گئے۔ کیونکہ ان کا مقصد صرف ہانی کے زندہ یا مردہ ہونے کی خبر حاصل کرنا تھا۔ عمرو بن حجاج اور اس کے ہمراہیوں کی واپسی کے دوسرے دن ابنِ زیاد نے زندان میں ہانی کا کام تمام کر دیا۔

ادھر مسلم بن عقیل دوسرے دن چار ہزار افراد کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے اور دارالامارہ کے گرد گھیرا ڈالنا شروع کیا۔ اس وقت ابنِ زیاد کے ساتھ تیس سے زیادہ محافظ نہ تھے لیکن مسلم کے پورے لشکر نے پسپائی اختیار کی اور کوئی بھی وہاں باقی نہ رہا۔ ان باتوں کی وجہ یہ تھی کہ وہ جنگ کرنے کے حوصلے اور عزم سے

عاری تھے۔ اس متضاد حقیقت (جس نے امتِ مسلمہ کے انسانی جذبے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا) کی تعبیر فرزدق نے نہایت رسا انداز میں یوں کی ہے۔

"قلوبھم معک و سیوفھم علیک"

"ان کے دل آپؑ کے ساتھ ہیں لیکن تلواریں آپؑ کے خلاف۔"

اگر کوئی شخص اپنے ارادے کا آپ مالک نہ ہو تو ممکن ہے کہ اس کے ہاتھ اس کے دل کے برخلاف عمل کریں۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اہلِ کوفہ امام حسینؑ کو شہید کرنے کے بعد روتے اور افسوس کرتے تھے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ امامؑ کو شہید کرکے گویا انہوں نے اپنی عظمت' آزادی اور باعزت زندگی کی واحد آرزو کا خون کیا ہے۔ اس احساس کے باوجود ہم نے مشاہدہ کیا کہ انہوں نے کس طرح امامؑ کو قتل کیا۔

امت کی شکست خوردہ ذہنیت اور احساسِ کمتری کو ایک جدید ذہنیت میں بدلنے کے لئے امام حسینؑ کو اپنی تحریک کے سب سے پیچیدہ مرحلے سے گزرنا پڑا۔ کیونکہ امت کے اندر جدید احساس و ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ آپؑ کی یہ کوشش بھی رہی کہ ان کے اس رسمی مزاج اور عادات سے بھی صاف چشم پوشی نہ کی جائے جن سے نفسیاتی و اخلاقی شکست کے نتیجے میں ان کو واسطہ پڑا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امامؑ امت کے ضمیر کو اس وقت تک جھنجھوڑ نہیں سکتے تھے جب تک کہ آپؑ اپنی روش اور منصوبہ بندی میں امت کی نفسیات اور ذہنیت کو مدِ نظر نہ رکھتے یا اسے اہمیت نہ دیتے۔ اسی طرح سے آپؑ ان مسلمانوں کی نظر میں اپنے منصوبے کی شرعی حیثیت کو برقرار رکھ سکتے تھے جن کا اخلاقی دیوالیہ نکل چکا تھا اور جن کے اسلامی اقدار بدل چکے تھے۔ خلاصہ یہ کہ

مذکورہ حقیقتوں کے مدِ نظر امام حسینؑ نے معرکہ آرائی کا پکا عزم کرلیا خواہ جس قدر قربانی دینی پڑے اور اسلام کے مستقبل کو اس انحراف سے بچانے کے لئے آپؑ کو اپنے خون کا آخری قطرہ بھی کیوں نہ بہانا پڑے۔

امام حسینؑ کا انقلاب کسی دیگر فکر کا نتیجہ نہ تھا بلکہ آپؑ نے خود ایسے حالات پیدا کرنے کے لئے منصوبہ بندی کی جن کے پیشِ نظر اور ان سے حاصل شدہ ردِّ عمل کے سہارے آپؑ قیام کرتے۔ خلاصہ یہ کہ امامؑ اپنے گزشتہ موقف پر ڈٹے رہے۔

یہاں مسئلہ امامؑ کو ارادۂ جنگ ترک کرنے پر راضی کرنے کا نہ تھا۔ اس لئے کہ آپؑ اہلِ کوفہ کے عوامی حلقوں کی دعوت کے ردِّ عمل کے نتیجے میں گھر سے نہ نکلے تھے۔ آپؑ کو دورانِ سفر ہی ان کے کرتوتوں، خیانت کاریوں اور ان کے ہاتھوں آپؑ کے معتمد عزیز اور سفیر مسلم بن عقیلؓ کے قتل کا علم ہو چکا تھا۔ ان تمام حقائق سے باخبر ہونے کے باوجود امامؑ نے اپنا سفر جاری رکھا کیونکہ جو مشن لے کر آپؑ اٹھے تھے وہ ایک طرف سے امتِ مسلمہ کی اس ذہنیت کے لئے قابلِ قبول تھا جس پر وہ کاربند تھے۔ یعنی اس زمانہ میں وہ وعدے کی وفا کو بہت اہمیت دیتے تھے حتیٰ وعدہ کی وفا ان کے آرام طلب اور عیش پسند افراد کے نزدیک بھی قابلِ احترام تھی اور اہلِ کوفہ نے خطوط اور اپنے نمائندوں کے ذریعہ امامؑ کی نصرت کا وعدہ کیا تھا۔

مطلوبہ ذہنیت اور اخلاقی کیفیت کے احیاء کے لئے امامؑ نے جو طریقے اختیار فرمائے ان میں سے ایک آنے والے معرکے کے لئے تمام مطلوبہ وسائل و اسباب کو جمع کرنا تھا۔ آپؑ نے فقط اپنی جان نثار کرنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ اپنی

اولاد اور اپنے گھرانے کا نذرانہ بھی پیش کیا تاکہ شکست خوردہ ذہنیت کے اوپر بہانوں کے دروازے بند کردیں۔

کیونکہ شکست خوردہ ذہنیت ایک ایسی جنگ کے لئے جس میں ناکامی کا قوی امکان تھا امامؑ کے اقدام کی حقانیت کو مشکوک بنانے کی خواہ کتنی ہی کوشش کرتی لیکن وہ آلِ رسولؐ کے خلاف لشکرِ بنی امیہ کے وحشیانہ اور رذیل سلوک کے ناحق ہونے میں کسی طرح بھی شکوک پیدا نہیں کرسکتی تھی۔ اسی مقصد کے تحت امام حسینؑ فقط اپنا خون دینے کے لئے نہیں بلکہ اپنی اولاد اور اپنے اصحابؓ کا خون بھی پیش کرنے کے لئے میدانِ کارزار میں آئے۔ آپؑ نے اس معرکے میں ہر قسم کے تاریخی اور انسانی ضمیر کو جھنجھوڑنے والے عوامل کو شامل کیا یہاں تک کہ آپؑ نے اپنے جد رسول اللہؐ کے عمامے اور آنحضرتؐ کی تلوار کو بھی اپنی حکمتِ عملی کے تحت اس جنگ میں استعمال کیا تاکہ شکست خوردہ ذہنیت رکھنے والوں کے لئے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینے کا کوئی بہانہ نہ رہے۔

نتیجہ منصوبے کے مطابق نکلا۔ امامؑ اپنی حیرت انگیز اور تیر بہ ہدف تدبیر کی بدولت احساسِ شکست سے مغلوب امت کو اس کا عزم و حوصلہ دوبارہ عطا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ آپؑ نے یہ واضح کردیا کہ امت کی فاسد ذہنیت اور خصلتوں کے معالجے کا عمل اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ براہِ راست اور تحریک آمیز انداز میں اس کا سامنا کیا جائے۔ کیونکہ فاسد ذہنیت کا کھل کر سامنا کرنا امت سے جدائی اور امت کے حق میں ہر قسم کے جائز اقدام سے کنارہ کشی کے مترادف تھا۔

یہ تھا حسین ابنِ علیؑ کا کارنامہ جب مسلمان بتدریج ایک نئی حالت اور

کیفیت میں داخل ہو رہے تھے جو شکست خوردہ ذہنیت سے مختلف تھی۔ آپؑ کی یہ قربانی اس وقت سے لے کر آج تک انسانی ضمیر کی بیداری کا باعث بنتی چلی آئی ہے۔

حسینیؑ انقلاب کے آثار و نتائج

اب جب ہم انقلاب اور اس کے اسباب کو جان چکے تو یہ سوال پیش آتا ہے کہ:۔ کیا انقلاب ثمر بخش ثابت ہوا؟۔ اور کیا اس سے کوئی عملی تبدیلی آئی؟ کوئی فتح حاصل ہوئی؟ یا دشمن کی سرکوبی ہوئی؟

بہت سے تاریخ دانوں نے اس انقلاب کو ناکام قرار دیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اس قیام کی بدولت وقتی طور پر کوئی ایسی سیاسی فتح حاصل نہ ہوئی جس سے عالمِ اسلام کی حالت میں پہلے کی بہ نسبت بہتری آئی ہو۔۳۶۔

حسینیؑ انقلاب کو سمجھنے کے لئے ہمیں وقتی اور عارضی فتح سے قطع نظر کر کے اس کے اسباب اور نتائج کا جائزہ لینا ہوگا، اقتدار کی کرسی پر قبضے ہی کو معیار قرار نہ دینا ہوگا۔ نیز اس کے نتائج کو دیگر انقلابات کے عام نتائج کے تناظر میں دیکھنا بھی صحیح نہ ہوگا۔ بلکہ ہمیں درجِ ذیل میدانوں میں اس کے نتائج کو تلاش کرنا ہوگا۔۳۷۔

(۱) بنی امیہ کی دینی حیثیت کا خاتمہ

ان خود ساختہ دینی حدود کو ختم کرنے کے لحاظ سے جن پر بنی امیہ اور ان کے حامیوں کی حکومت کا انحصار تھا اور اس لادینی روح کو رسوا کرنے کے حوالے سے جو حکومتِ وقت کا منشور تھی۔

معاشرے کے تمام طبقوں میں اس لادینی نظریے کے پھیلنے اور بغیر کسی مخالفت کے لوگوں کے اذہان میں مستحکم ہونے کے بعد کوئی ایسا نہ تھا جو اس کی خود ساختگی اور دین سے دوری کو بَرملا کرتا۔ صرف حسینؑ ہی وہ واحد فرد تھے جنہیں تمام مسلمانوں کے دلوں میں محبت و عزت کا بہت بڑا مقام حاصل تھا اور آپؑ ہی حکمرانوں کو رسوا کرنے نیز ان کی حقیقت اور اسلامی تعلیمات سے ان کی دوری کو فاش کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

(۲) احساسِ جرم

امام حسینؑ کی دردناک شہادت نے ہر اس شخص کے ضمیر میں احساسِ جرم و گناہ کی زبردست لہر دوڑا دی جس نے آپؑ کے ساتھ عہد و پیمان باندھنے کے بعد استطاعت کے باوجود آپؑ کی مدد نہ کی۔ اس احساسِ جرم کے دو پہلو ہیں۔

ایک طرف سے تو یہ احساس گناہ گار کو گناہ کا کفارہ ادا کرنے پر آمادہ کرنے کا باعث بنتا ہے۔

اور دوسری طرف سے اس کے دل میں ان لوگوں کے خلاف نفرت و عداوت پیدا ہوتی ہے جنہوں نے اس کو اس گناہ پر آمادہ کیا۔

یہی وجہ ہے کہ شہادتِ حسینؑ کئی اور بغاوتوں کا باعث بنی جن کا مقصد آپؑ کی مدد نہ کرنے کا کفارہ ادا کرنا نیز امویوں سے انتقام لینا تھا۔ احساسِ گناہ کی آگ تاریخ میں ہمیشہ شعلہ ور اور انقلابات کا محرک بنتی رہی۔ اسی لئے موقع ملتے ہی امویوں کے خلاف بغاوتیں ہوئیں۔ احساسِ جرم کی آگ کبھی بجھنے اور ٹھنڈہ ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ بلکہ یہ احساس ہمیشہ خونی خراج ادا کرنے پر اکساتا رہا اور

اس کی واحد راہ ظالموں کے خلاف بغاوت تھی۔

(۳) جدید اخلاق و خصائل

حسینؑ انقلاب کے لئے ضروری تھا کہ لوگوں کو ایسے اخلاقی نمونوں کی طرف دعوت دیتا جو معاشرے میں رائج اخلاقی حالت سے بلند و بالا ہوں۔ اس کے علاوہ انسانوں کا (اپنے اور دوسروں کی زندگی کے بارے میں) نقطہ نظر بدلنے کی بھی ضرورت تھی تاکہ معاشرتی اصلاح کی راہ ہموار ہو۔

حسینؑ، آپؑ کے اہلِ بیتؑ اور اصحابؓ نے بنی امیہ کے خلاف اپنی تحریک میں خالص ترین اور پاکیزہ ترین اسلامی اخلاق کا بلند ترین نمونہ پیش کیا۔

انہوں نے اس اخلاق کی فقط زبانی تبلیغ نہیں کی بلکہ اپنی جانوں اور اپنے خون سے اسلامی اخلاق کا یہ صفحہ رقم کیا۔

اس دور میں عام آدمی کے لئے معمول کی بات تھی کہ وہ اپنے قبیلے کے سردار یا دینی رہنما کو مال کے بدلے ضمیر کا سودا کرتے دیکھے۔ وہ مشاہدہ کرتا تھا کہ ٹیکس جمع کرنے والے ایک حقیر ظالم کے آگے ذلت و حقارت کے ساتھ فقط اس لئے جھکتے ہیں کیونکہ وہ ان کے وظائف میں کمی پر قادر ہے۔ یہ تو حال تھا ان روساء اور بزرگوں کا جو لوگوں میں معروف تھے۔ ان کے اعمال کا مشاہدہ اب عام لوگوں کے لئے معمول بن چکا تھا۔ یہاں تک کہ یہ باتیں اب لوگوں کے لئے معمول کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں۔

مسلمانوں کی ساری توجہ انفرادی مفادات پر تھی جن کی حفاظت کے لئے وہ محنت کرتے اور مشقت اٹھاتے تھے۔ ان کو کسی اور چیز کی کوئی فکر نہ تھی۔

معاشرے کے آلام و مسائل سے عام آدمی کو کوئی سروکار نہ تھا۔ ان کو فکر تھی تو بس اپنے وظائف کی۔ وہ اسی کو بچانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ لوگ اپنے روساء کے اشاروں پر چلتے اور ان کے مظالم پر خاموشی اختیار کرتے تھے تاکہ کہیں وہ ان کے وظائف بند نہ کردیں۔۳۸۔ نیز وہ اپنے خاندانی اوصاف پر فخر کرتے اور دوسروں کی عیب جوئی کیا کرتے تھے۔

لیکن دوسری جانب امام حسینؑ کے اصحاب کی شان ہی کچھ اور تھی۔ یہ لوگ معمول کی زندگی گزارنے والے تھے۔ ہر کوئی گھربار اور بیوی بچوں والا تھا۔ لوگوں سے ان کی دوستیاں بھی تھیں۔ بیت المال سے اپنے وظیفے بھی لیتے تھے۔ نیز زندگی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی استطاعت بھی رکھتے تھے لیکن ان باتوں کے باوجود وہ دنیوی زندگی سے دست بردار ہوگئے اور حسین علیہ السلام کے ساتھ مرنے کے ارادے سے ظالم حکام کے مقابلے پر اُتر آئے۔

اس دور کے مسلمانوں کے لئے ایک ایسے انسان کا مشاہدہ نہایت تعجب خیز تھا جو ایک پُر تعیش زندگی (جس میں مال و دولت اور جاہ و مقام کے ساتھ ظالموں کی اطاعت اور ان کے ساتھ خیانت کاری کی سودے بازی بھی ہو) کے مقابلے میں موت کو اختیار کرے۔ ان مسلمانوں کے لئے ایسے عظیم اور بلند و بالا نمونوں کا مشاہدہ بھی بہت حیرت انگیز تھا جن کی عظمت کو دیکھ کر وہ بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ "یہ تو انسانوں سے مافوق ہیں!!۔"

اخلاق و کردار کا جو مظاہرہ امامؑ اور آپؑ کے ساتھیوں نے کیا' اس نے مسلمانوں کے ضمیر کو جھنجھوڑا کہ وہ اپنی اصلاح پر اُتر آئیں۔ نیز ان کو خوابِ گراں سے بیدار کیا تاکہ اسلامی معاشرہ زندگی کے اس صحیح راستے پر لگ جائے

جس سے وہ (حسینی انقلاب سے بہت پہلے) ہٹ چکا تھا۔

واقعۂ کربلا کے بعد سے اسلامی معاشرہ ظالم حکمرانوں کے خلاف عام لوگوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً بغاوتوں اور انقلابات کا شاہد رہا۔ ان باغیوں اور انقلابیوں میں سے اکثر کی رگوں میں انقلابِ کربلا کا جذبہ موجزن تھا۔ یہی جذبہ ان کو راہِ حق میں موت کی تمنا کرنے پر آمادہ کرتا تھا۔

(۴) جذبۂ مقاومت

حسینی انقلاب نے مسلمانوں کے اندر مجاہدانہ ذہنیت کو دوبارہ زندہ کیا۔ وہ ایک طویل عرصے تک ظالم حکمرانوں کے آگے خاموشی اور اطاعت کا دور گزار چکے تھے۔ یوں اس انقلاب نے انقلاب کی راہ میں حائل تمام نفسیاتی اور اجتماعی رکاوٹوں کو دور کیا۔ اس دور میں مسلمانوں کا مطمع نظر یہ ہوا کرتا تھا کہ ظالموں کے آگے سرِ تسلیم خم ہوں۔ ان سے سودے بازی کریں اور آرام کی زندگی گزاریں۔ گویا وہ اپنے تئیں یہ کہتے تھے کہ "اپنی ذات اور اپنی آمدنی کی حفاظت کرو۔ اپنی معاشرتی حیثیت کو بچاؤ۔" لیکن اسی اثناء میں حسینی انقلاب مردِ مسلم کے لئے ایک نئی روحانی کیفیت کا تحفہ لے کر آیا، جس کا پیغام یہ تھا کہ۔

"سر نہ جھکاؤ، انسانیت کا سودا نہ کرو، حتیٰ المقدور باطل قوتوں کا مقابلہ کرو اور اپنے اصولوں پر ہر چیز کو قربان کردو۔"

اپنی حالتِ زار پر خاموشی کی عادت مسلمانوں کو بغاوت سے روک رہی تھی۔ اور انہیں ترکِ مبارزہ کی دعوت دے رہی تھی۔ لیکن امام حسینؑ کا انقلاب بہت سے لوگوں کے اندر جرم اور ملامت کا احساس چھوڑ گیا، اپنی قوتِ

فکر سے کام لینے کا شدید اشتیاق پیدا کرگیا۔ امام حسینؑ کے قیام کا مقصد لوگوں کو مکمل طور پر ایک انقلاب کے لئے تیار کرنا تھا۔

جذبۂ مقاومت و مبارزہ قوموں اور ان کے حکمرانوں کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ چنانچہ جب جذبۂ مقاومت سرد پڑ جائے اور قوم کے افراد حکمرانوں کے بے دام غلام بن جائیں تو حکمران طبقہ جری ہو جاتا ہے اور کسی کو خاطر میں لائے بغیر من مانی کرنے لگتا ہے۔

یہ تو تھا حکمرانوں کے حوالے سے۔ رہا رعایا کے حوالے سے، تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کسی قوم میں جذبۂ مبارزہ جس قدر زیادہ عرصے تک سرد رہے اسی قدر اس کے اوپر ظالموں کا تسلط آسان تر ہو جاتا ہے اور نتیجہ کے طور پر قوم کی اصلاح اور ترقی کا کام بہت مشکل بن جاتا ہے۔

اسلامی معاشرے میں مبارزے و مقاومت کی روح پھونکنے میں حسینی انقلاب کے کردار کو واضح طور پر سمجھنے کے لئے اس بات کو مدِّ نظر رکھنا مناسب ہے کہ یہ معاشرہ امام علیؑ کی شہادت کے وقت سے لے کر قیامِ حسینی تک پُرسکون رہا تھا۔ امویوں اور ان کے حامیوں کی طرف سے ہونے والی قتل و غارت گری کے بر خلاف عوامی سطح پر کسی قسم کا احتجاج یا انقلاب دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ بلکہ لوگ بیس سال تک (۴۰ ہجری سے ۶۰ ہجری) بنی امیہ کے فرمانبردار رہے تھے۔

لیکن حسینی انقلاب کے بعد امت کے اندر جذبۂ مقاومت بیدار ہوا اور لوگ قیادت کے لئے ایک رہبر کی آرزو کرنے لگے۔ یوں جب بھی کوئی رہبر میسّر آیا امویوں کے خلاف بغاوتیں ہوتی رہیں۔ یہ انقلابی روح ہر اس تحریک میں جلوہ گر نظر آتی ہے جو خونِ حسینؑ کے نام پر اور آپؑ کے انقلاب کی آوازِ

بازگشت کے طور پر وجود میں آئی۔ ہم یہاں ان تحریکوں کا اجمالی تذکرہ کریں گے۔

توابین کا قیام

اس کی ابتداء کوفے سے ہوئی۔ یہ بغاوت شہادتِ حسینی کا براہِ راست ردِّ عمل تھی اور امام حسینؑ کو خطوط کے ذریعے کوفہ بلانے کے بعد آپؑ کی مدد نہ کرنے پر احساسِ ندامت کا نتیجہ تھی۔ توابین کی آرزو یہ تھی کہ ذلت و عار کے اس داغ کو امام حسینؑ کے قاتلوں سے انتقام لے کر دھوڈالیں۔ یہ قیام ۶۵ ہجری میں وقوع پذیر ہوا۔۳۹

اہلِ مدینہ کا قیام

اس قیام کے اسباب توابین کے قیام کے اسباب سے مختلف تھے۔ اس قیام کا مقصد انتقامِ خونِ حسینؑ نہ تھا۔ بلکہ بنی امیہ کی ظالم حکومت کا خاتمہ تھا۔ اہلِ مدینہ امویوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان انقلابیوں نے مدینہ میں یزید کے والی اور اس کے حامیوں کو نکال باہر کیا۔ ان انقلابیوں کی تعداد ایک ہزار تھی۔ آخر کار شامی لشکر نے نہایت بے دردی اور وحشیانہ انداز میں اس بغاوت کو کچل دیا۔۴۰

مختار ثقفی کا انقلاب

مختار بن ابو عبیدہ ثقفی نے ۶۶ ہجری میں قتلِ حسینؑ کا انتقام لینے کے لئے کوفہ میں قیام کیا اور امام حسینؑ اور آپؑ کی آل کے قاتلوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کیا۔ مختار نے ایک ہی دن میں دو سو اسی افراد کو قتل کیا۔۴۱

مطرف بن مغیرہ کا قیام

۷۷ ہجری میں مطرف بن مغیرہ بن شعبہ نے حجاج بن یوسف کے خلاف بغاوت کی اور عبدالملک بن مروان کی اطاعت سے خارج ہوا۔ ۴۲

ابنِ اشعث کی بغاوت

۸۱ ہجری میں عبدالرحمان بن محمد بن اشعث نے حجاج کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور عبدالملک بن مروان کی نافرمانی کا اعلان کیا۔ اس کی یہ تحریک ۸۳ ہجری تک جاری رہی اور جنگی کامیابیاں بھی حاصل کیں لیکن آخر کار حجاج نے شامی فوجوں کے ذریعے اس کا قلع قمع کیا۔ ۴۳

زید بن علی ابنِ حسین کا قیام

۱۲۲ ہجری میں زید نے کوفہ میں قیام کیا۔ لیکن عراق میں متعین شامی فوج نے جلد ہی اس قیام پر قابو پالیا۔ ۴۴

مذکورہ نمونے ان انقلابات میں سے چند ایک تھے جو واضح طور پر انقلابِ حسینؑ کی اس روح سے متاثر تھے جسے آپؑ نے امتِ مسلمہ کو عطا کیا تھا۔ یہ سلسلہ بنی امیہ کے آخری ایام تک جاری رہا یہاں تک کہ عباسیوں کی تحریک نے بنی امیہ کا خاتمہ کردیا۔ علاوہ ازایں خود عباسیوں کی تحریک بھی ہرگز کامیاب نہ ہوتی اگر وہ قیامِ حسینی کے اثرات کا سہارا نہ لیتے اور "الرضا من آل البیت" کا نعرہ نہ لگاتے۔ جس کے باعث ان کو زبردست عوامی حمایت حاصل ہوئی۔

انقلابات کا سلسلہ نئے منحرفین کے لئے چیلنج کی صورت میں جاری رہا اور قطع ہونے نہ پایا بلکہ ہر دور کے مسلمانوں نے اپنی تحریکوں کے ذریعے اس سلسلے کو قائم رکھا اور اسی وسیلے سے اپنی انسانیت کا ثبوت دیتے رہے جسے ظالم حکمرانوں نے دبا کر رکھا تھا اور ہمیشہ غلط رنگ میں پیش کیا تھا۔۴۵۔

یہ سب اس جذبے کی بدولت تھا جو میدانِ کربلا میں حسینی کارنامے کے نتیجے میں حاصل ہوا تھا۔ انقلابات کی تاریخ میں آپؑ کے قیام کو سرچشمۂ انقلاب قرار دیا جا سکتا ہے۔

آپؑ کے انقلاب نے لوگوں کو جان کی بازی لگانے پر آمادہ کیا اور ان کو طویل و خونچکاں راستے یعنی مبارزے کی راہ پر ڈال دیا جب کہ لوگ عزمِ مقاومت سے محروم ہونے والے تھے۔۴۶۔

مصادر و ماخذ

۱۔ تاریخِ اسلام از حسن ابراہیم۔ ج۱۔ ص۲۷۸ تا ۲۷۹

۲۔ رسالہ فی معاویہ والامویین از جاحظ تحقیق از عزۃ العطار ۱۶

۳۔ نثر اللالی علی نظم الاداری۔ از آلوسی

۴۔ کامل ابنِ اثیر۔ ج۳۔ ص۲۶۴

۵۔ شیخ علی کورانی در مقدمہ کتاب ھکذا تکلم الحسینؑ از محمد عقیقی۔ ص۸

۶۔ یہ فرزدق شاعر کا قول ہے ملاحظہ ہو تاریخِ طبری۔ ج۴۔ ص۲۹۰ نیز تاریخِ کامل ابنِ اثیر۔ ج۳۔ ص۲۸۶

۷۔ ثورۃ الحسینؑ فی الواقع التاریخی والوجدان الشعبی۔ ص۱۲۱ از محمد مہدی شمس الدین

۸۔ الیمین والیسار فی الاسلام۔ ص ۱۶۲

۹۔ ثورۃ الحسینؑ فی الواقع التاریخی۔ ص ۲۱

۱۰۔ ثورۃ الحسینؑ فی الواقع التاریخی۔ ص ۲۰

۱۱۔ مقتل الحسینؑ از عبدالرزاق المقرم۔ ص ۱۴۹

۱۲۔ مقتل الحسینؑ از عبدالرزاق المقرم۔ ص ۵۵

۱۳۔ ابوالشہداء از عقاد۔ ص ۶۳

۱۴۔ مقتل الحسین از عبدالرزاق المقرم۔ ص ۱۶۰

۱۵۔ مقتل الحسینؑ۔ ص ۱۶۰ نیز طبری۔ ج ۴۔ ص ۲۸۷ نیز الکامل ج ۳۔ ص ۲۷۰

۱۶۔ مقتل الحسینؑ ص ۵۴، طبری ج ۴۔ ص ۲۸۹ تا ۲۹۶، الکامل ج ۳۔ ص ۲۷۵ تا ص ۲۸۶، الاخبار الطوال۔ ص ۲۲۳

۱۷۔ اعلام الوریٰ باعلام الہدیٰ از طبرسی۔ ص ۲۳۲

۱۸۔ طبری ج ۴۔ ص ۳۰۰ تا ۳۰۱۔ الکامل ج ۳۔ ص ۲۷۸

۱۹۔ مقتلِ حسینؑ المقرم

۲۰۔ ثورۃ الحسینؑ ظروفہا از محمد مہدی شمس الدین۔ ص ۱۶۴

۲۱۔ حرکات السریہ فی الاسلام از محمود اسماعیل۔ ص ۹۳، مغنی از قاضی عبدالجبار ج ۸۔ ص ۴

۲۲۔ الیمین والیسار فی الاسلام۔ ص ۱۸۵

۲۳۔ مقالات الاسلامین از اشعری۔ ص ۱۴۱

۲۴۔ تہذیب التہذیب از ابن حجر عسقلانی۔ ص ۴۶ تا ۴۷

۲۵۔ حرکات الشیعہ المتصرفین فی العصر العباسی از جابر عبدالعال۔ ص ۱۷۵ اور ۱۷۶

۲۶۔ حرکات الشیعہ المتصرفین فی العصر العباسی از جابر عبدالعال۔ ص ۱۷۵ اور ۱۷۶

۲۷۔ جولد تسہیر۔ ص ۷۶

۲۸۔ النظم الاسلامیہ از صبحی الصالح۔ ص ۱۴۴

۲۹۔ التبصیر فی الدین از اسفرائنی۔ ص ۹۰

۳۰۔ ثورۃ الحسینؑ ظروفہا از محمد مہدی شمس الدین۔ ص ۵۳

۳۱۔ الدولۃ العربیۃ وسقوطہا از جولیس ولھوزن۔ ص ۱۵۸

۳۲۔ مزید معلومات کے لئے رجوع ہو ثورۃ الحسینؑ ظروفہا۔ ص ۶۳

۳۳۔ ثورۃ الحسینؑ فی الواقع التاریخی از محمد مہدی شمس الدین۔ ص ۱۳

۳۴۔ النظم الاسلامیہ۔ صبحی الصالح۔ ص ۲۶۹

۳۵۔ رسالہ فی معاویہ والامویین از جاحظ۔ تحقیق از عزۃ الیطار۔ ص ۱۶

۳۶۔ ثورۃ الحسینؑ ظروفہا از محمد مہدی شمس الدین۔ ص ۱۵۴

۳۷۔ علامہ شیخ محمد مہدی شمس الدین نے اپنی کتاب ثورۃ الحسین (ص ۱۶۲-۲۲۸) میں جو نتائج اخذ کئے ہیں ہم نے انہی سے استفادہ کیا ہے۔ مزید تفصیلات کے لئے مذکورہ کتاب کی طرف رجوع کیجئے۔

۳۸۔ تاریخِ طبری۔ ج ۴۔ ص ۳۳۴

۳۹۔ تاریخ طبری، ثورۃ التوابین۔ ج ۴۔ ص ۴۲۶-۴۳۶

۴۰۔ تاریخِ طبری، ثورۃ المدینہ۔ ج ۴۔ ص ۳۶۶-۳۸۱

۴۱۔ تاریخِ طبری، ثورۃ المدینہ۔ ج ۴۔ ص ۴۲۴

۴۲۔ تاریخِ طبری، ثورۃ مطرف

۴۳۔ تاریخِ طبری، ثورۃ مطرف نیز الدولۃ العربیہ از ہاوزن۔ ص ۱۸۹-۲۰۳

۴۴۔ مقاتل الطالبین۔ ص ۱۳۹

۴۵۔ محاضرات فی التاریخ الاسلامی از عواد الاعظمی۔ ص ۳-۲۲

۴۶۔ ثورۃ الحسینؑ ظروفہا از محمد مہدی شمس الدین۔ ص ۲۲۳

امام علی ابنِ حسین علیہ السلام

امام سجاد علیہ السلام کو باقی ائمہؑ کی بہ نسبت زیادہ سخت دور کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ وفاتِ رسولؐ کے بعد شروع ہونے والا انحراف اس زمانے میں اپنے دورِ عروج میں داخل ہو رہا تھا۔ یہاں ہم یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ امام سجادؑ کے دور میں اس انحراف نے واضح صورت اختیار کرنی شروع کر دی تھی اور وہ بھی فقط باطنی کیفیت کی حد تک نہیں بلکہ ان نعروں اور الفاظ کی سطح پر بھی جو حکام کی طرف سے پیش کئے جاتے تھے۔

شہادتِ امام حسینؑ کے بعد حکمرانوں کی حقیقت تمام مسلمان طبقوں کے سامنے فکری اور عملی لحاظ سے کھل چکی تھی۔ اب امت کے سامنے اموی حکومت کی کوئی بات ڈھکی چھپی نہ رہی تھی کیونکہ امت نے بنی امیہ کی مذموم اور کریہہ حقیقت کو آزما کر دیکھ لیا تھا۔

امام سجادؑ نے اپنی زندگی میں اپنے جد امیرالمومنینؑ کے دور کی مشکلات کا مشاہدہ کیا۔ آپؑ امیرالمومنینؑ کی شہادت سے تین سال قبل متولد ہوئے جب کہ امیرالمومنینؑ جنگِ جمل میں مشغول تھے۔ اس کے بعد آپؑ مختلف مشکلات میں امام حسنؑ کے ساتھ ساتھ رہے۔ پھر اپنے پدرِ بزرگوار امام حسینؑ کے المناک

مصائب میں شریک رہے اور آخرکار براہِ راست آپؑ کو مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ آپؑ کی مصیبتوں میں اضافہ تب ہوا جب آپؑ نے بنی امیہ کے سپاہیوں کو مسجدِ رسولؐ میں گھوڑے باندھتے دیکھا۔ یہ وہی مسجد تھی جو تمام دنیا میں اسلام اور اس کے پیغام کو پھیلانے کا باعث بن سکتی تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ امام سجادؑ کے دور میں اموی فوجوں کے ہاتھوں اس مسجد کی زبردست بے حرمتی ہوئی۔ ان گمراہوں نے شہرِ مدینہ اور مسجدِ نبیؐ کی حرمت کی پامالی کو حلال قرار دیا۔

یہ حضرتِ سجادؑ کی زندگی کا سب سے سخت دور تھا۔ اس دور میں آہستہ آہستہ انحراف کی گہرائی کا صحیح اندازہ ہونے لگا تھا۔ یہ وقت دیگر اماموں کی بہ نسبت امام سجادؑ کے لئے زیادہ سخت آزمائش و ابتلاء کا زمانہ تھا۔

اس معرکۂ گیرودار میں لوگوں کا قتل سب سے رائج کام تھا۔ لاشوں سے انتقام لینا، درختوں پر سولی چڑھانا، ہاتھ پاؤں کاٹنا اور دیگر جسمانی اذیتیں دینا روز مرّہ کا معمول بن چکے تھے۔

لوگوں کے اندر جرم و ندامت کا احساس بیدار کرنے اور بنی امیہ کے خلاف نفرت و عداوت کا جذبہ پیدا کرنے میں آپؑ کے پدرِ بزرگوار امام حسینؑ کے انقلاب اور اس کے المناک انجام کا نمایاں حصہ تھا۔ ہم واقعۂ کربلا اور شہادتِ حسینؑ کے بعد لوگوں کے اندر مذکورہ امر کا روشن مشاہدہ کرتے ہیں۔ چنانچہ احساسِ جرم و ندامت نے کئی ایک مسلم گروہوں اور جماعتوں کے اندر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا عزم پیدا کیا اور ان کے دلوں میں بنی امیہ کے خلاف بغض و عداوت کی آگ کو تیز کیا۔ اگر غور کریں تو گناہوں کی تلافی کی شدید خواہش اور ظالم کے خلاف بغض و عداوت کا دوسرا نام انقلاب ہی تو ہے۔ لیکن

امویوں کے خلاف ہونے والی اکثر بغاوتیں جذباتیت کی بنیاد پر تھیں تعقل کی بنا پر نہیں۔ یعنی یہ بغاوتیں اس تفکر کا نتیجہ نہ تھیں کہ بنی امیہ دین سے دور تھے۔ ۱

امام سجادؑ احساسِ جرم و ندامت کو بڑھاتے ہیں

امام سجادؑ نے لوگوں کے احساسِ جرم و گناہ کے بارے میں ایک معقول اور مثبت پالیسی اپنائی۔ آپؑ نے مذکورہ احساس اور نفسیاتی حربے کو ظالم حکمرانوں کے خلاف جذبۂ مقاومت میں اضافے کا ذریعہ بنایا۔ امام علی بن حسین زین العابدینؑ نے احساسِ جرم و ندامت کی آگ کو تیز تر کرنے کی جدوجہد فرمائی۔ آپؑ نے کوفیوں کے ایک عظیم اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"لوگو میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تمہیں یاد نہیں کہ تم لوگوں نے میرے باپ کو خطوط لکھنے کے بعد ان کو دھوکہ دیا؟ ان کے ساتھ اپنی جانیں قربان کرنے کا عہد و پیمان باندھنے اور انکی بیعت کرنے کے بعد ان سے جنگ پر اُتر آئے؟ ہلاکت ہو تمہارے لئے ان اعمال کی بناء پر جو تم آخرت کی طرف روانہ کر چکے ہو۔ تمہاری رائے کتنی بُری ہے۔ تم اس وقت کس طرح رسول اللہؐ سے آنکھیں چار کرو گے جب وہ تم سے سوال کریں گے کہ تم لوگوں نے میری آل کو قتل کیا، میری حرمت کو پامال کیا، پس تم میری امت سے نہیں ہو۔" ۲

جرم و گناہ کے احساس کی یہ آگ ہمیشہ شعلہ ور رہی اور لوگوں کو بغاوت و انتقام کی دعوت دیتی رہی۔ یوں ہر مناسب موقع پر بنی امیہ کے خلاف بغاوتیں اور انقلابات رونما ہوتے رہے اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ ۳

بغاوتوں اور انقلابات کی کثرت سے پیدا ہونے والے پُر آشوب حالات بنی امیہ کی طرف سے امام سجادؑ کی سرگرمیوں پر پابندیوں میں اضافے کا باعث بنے۔ آپؑ پر جبری نگرانی مسلط کی گئی۔ بنی امیہ آپؑ کی ہر حرکت کو اپنی حکومت کے خلاف ایک نئے انقلاب کی کوشش قرار دیتے تھے۔

اس گھٹن اور پُر خطر دور میں امام سجادؑ کو ایک ایسا طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت تھی جس کے تحت آپؑ اس قسم کے سنگین ماحول کا سامنا کرسکیں۔ اس کے علاوہ اسلامی شریعت کے محافظ اور ذمہ دار کی حیثیت سے آپؑ کے لئے ضروری تھا کہ منحرف حکام کی سازشوں اور ان کی طرف سے ہونے والی شدید نگرانی کے خطرات کو پیشِ نظر رکھیں اور اس بات کو بھی ملحوظ رکھیں کہ وہ انتقام لینے کے لئے بہانے کی تلاش میں ہیں۔

انہی باتوں کی بناء پر امامؑ نے دعاؤں کی روش اپنائی اور کثرت سے اس روش سے استفادہ کیا۔ آپؑ کی دعائیں دعوتِ فکر پر مبنی ہیں۔ ان دعاؤں میں اس دور کے واقعات کی تصویر کشی ہوتی ہے۔ یہ دعائیں اسلام کے عظیم مشن اور امت کی تعمیرِ نو کے بارے میں لطیف نکات سے لبریز ہیں۔ اگرچہ آپؑ نے دعاؤں کے الفاظ اور مطالب کی ادائیگی میں انقلاب و تحریک اور تشدد کے ذکر سے گریز فرمایا، لیکن یہ روش درحقیقت انقلاب اور پُر تشدد تحریک سے بھی زیادہ کارگر اور سخت تھی۔ آپؑ دیکھ رہے تھے کہ اگر افکار و نظریات کے اظہار میں واضح اور براہِ راست ترغیب کی راہ اپنائی گئی تو حکومت کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بنابرایں آپؑ نے اپنا مدعا بیان کرنے کے لئے بارگاہِ الٰہی میں دعا اور شکایت کی راہ اپنائی۔ یوں لوگوں کو ترغیب دی اور انقلاب

کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہتے تھے اس کو ان دعاؤں کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا ہے۔

امام سجادؑ کا کردار امت کے حوالے سے

امام سجادؑ نے امتِ مسلمہ خاص کر اپنے پیروکاروں کے حوالے سے درجِ ذیل دو کام انجام دیئے۔

☆ مسلمانوں کے انقلابی جذبے کو بیدار کرنا اور ان کے اندر ارتکابِ جرم پر احساسِ ندامت نیز اس کی تلافی کی ضرورت کا جذبہ پیدا کرنا :

آپؑ کا مقصد یہ تھا کہ ظالم حکمرانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے ضمیر اور بلند عزائم کو مکمل نابودی سے محفوظ رکھا جائے۔ اس کے علاوہ اسلام کے تشخص و احترام کو بھی برقرار رکھا جائے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ مذکورہ کیفیت تمام مسلمانوں کے اندر پیدا کی جائے لیکن اس کا راستہ یہ تھا کہ امامؑ ان میں سے مخلص افراد کی رہنمائی فرماتے ہوئے ان کے ذریعے یہ کام انجام دیتے۔

اسی لئے ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ امام سجادؑ اپنے بیانات میں ظالم حکمرانوں کے خلاف انقلابی جدوجہد کرنے والوں کو زبردست الفاظ میں سراہتے ہیں۔ چنانچہ جب محمد حنفیہ مختار ثقفی کے نمائندہ کو لے کر قیامِ مختار کے بارے میں امامؑ سے گفتگو کرنے کے لئے آئے تو آپؑ نے ان کو ایک ایسا عمومی جواب دیا جو فقط مختار سے مختص نہ تھا بلکہ ہر اس مسلمان کے لئے تھا جو بنی امیہ اور ان کی منحرف حکومت کے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔

☆ امت کی فکری، روحانی اور نظریاتی بیداری کے لئے منصوبہ بندی:

واضح ہو کہ امام سجادؑ اسلامی مدرسے کے دوسرے بانی شمار کئے جاتے ہیں۔

آپؑ کے گھر اور مسجد کو مدرسے کی حیثیت حاصل تھی۔ جہاں آپؑ کے گرد شاگردوں کا ازدحام ہوتا تھا۔ بعد میں آپؑ کے یہی شاگرد اسلامی تہذیب کے معمار نیز اسلامی افکار، تعلیمات اور ادب کے علمبردار بن گئے۔۵۔

آپؑ نے علماء و فضلاء نیز مختلف علوم و فنون میں احادیث روایت کرنے والوں کی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ ان لوگوں نے آپؑ سے صحیفہ سجادیہ جیسی کتاب نقل کی۔ یہ کتاب زبورِ آلِ محمدؐ کے نام سے معروف ہے۔ یہ ایک علمی و فکری خزانہ ہے جو اخلاق و توحید اور ان جیسے دیگر علوم کے اصول و قواعد کے بیان کی بناء پر ممتاز ہے۔

اسلام کے حقیقی پاسبان کی حیثیت سے امام سجادؑ کو ایسی فکری و نظریاتی مشکلات و مسائل کا سامنا کرنا پڑا جن سے اسلامی حکومت کے وقار کو خطرہ تھا اور خود ساختہ و منحرف حکمران ان مسائل کو حل کرنے سے عاجز تھے۔ ان مشکلات میں سے ایک کا مشاہدہ بادشاہِ روم کی طرف سے عبدالملک بن مروان کے نام لکھے گئے خط کے مسئلے میں ہوتا ہے۔ کیونکہ عبدالملک اس خط کا خاطر خواہ اور شایانِ شان جواب دینے سے عاجز تھا۔ اس وقت امام علی بن حسینؑ نے اس مشکل کو حل کیا۔ اور اس خط کا جواب اس طرح سے دیا جس سے امتِ مسلمہ کا وقار باقی رہا اور ان کی ہیبت بھی برقرار رہی۔۶۔

امامؑ کا مقصد اسلامی معاشرے کو لاحق مشکلات اور مسلمانوں کی حکومت کو درپیش بحرانوں میں اسلام کے وسیع تر مفادات کا تحفظ تھا۔ کافروں نیز اسلام کے دشمنوں کی طرف سے مسلمانوں کو لاحق ہونے والے مادی و نظریاتی خطرات کے مقابلے کے لئے مسلمان حکومتوں کی مزاحمت کے معاملہ میں ائمہؑ کا موقف

نہایت محتاط اور موثر انداز میں ان مسلمان حکومتوں کی حمایت کرنا تھا۔ تاکہ یہ مسلمان حکمران انحراف کا شکار نہ ہوں نیز ان تائیدات کو اپنی انحرافی روش کے لئے شرعی جواز کے طور پر استعمال نہ کریں۔

مذکورہ حقائق کی بناء پر امامؑ کی سرگرمیاں آپؑ پر گزرنے والے حالات کی مناسبت سے کبھی وسیع اور کبھی خفیہ ہوجاتی تھیں۔ کیونکہ حکومتِ وقت کی طرف سے دباؤ میں شدت اور کمی کے تناسب سے امامؑ اپنی سرگرمیوں کی منصوبہ بندی فرماتے تھے۔

امام سجادؑ کے بارے میں غلط تصورات

افسوس کا مقام ہے کہ بعض مورخین میں یہ غلط تصور پایا جاتا ہے کہ واقعہ کربلا کے بعد شیعوں کے اماموں نے سیاسی گوشہ نشینی اختیار کرتے ہوئے وعظ و عبادت اور ترکِ دنیا کی راہ اپنائی ہے۔۷ اس کے علاوہ بہت سے لوگوں میں ایک اور غلط نظریہ بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ نظریہ رکھنے والے لوگ ائمہؑ کے بارے میں یہ سوچنے کے عادی ہیں کہ وہ تو بس مظلوم لوگ تھے جن سے قیادت چھینی گئی تھی۔ اور امت بھی قیادت سے ان کی دوری پر خاموش تھی۔ اسی بناء پر ان کو گوناگوں محرومیوں اور مظالم کا مزہ چکھنا پڑا۔۸

وہ اس نظریے کی تائید میں امام سجادؑ کی تاریخِ زندگی، عام اسلامی معاشرے سے آپؑ کی دوری اور سیاسی نقطہ نظر سے بظاہر آپؑ کی قیادت سے لاتعلقی وغیرہ کو بطورِ دلیل پیش کرتے ہیں۔

ان غلط تصورات کا سبب کچھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان مورخین نے ایک

طرف سے تو یہ دیکھا کہ ائمہؑ نے حالات کے خلاف مسلح قیام نہیں کیا اور دوسری طرف سے انہوں نے قیادت کے سیاسی مفہوم کو محدود کرتے ہوئے اسے مسلح کارروائی ہی سے عبارت سمجھا۔

امام سجادؑ کا نظریہ یہ تھا کہ فقط حکومت کا حصول اسلامی انقلاب اور اصلاح کے لئے کافی نہیں۔ بلکہ اس امر کے لئے ایسی عوامی قوت کی ضرورت ہے جو اس حکومت کے اہداف سے آگاہ ہو، اس کے نظریات پر ایمان رکھتی ہو، اس کی حمایت کرتی ہو۔ عوام الناس کے درمیان اس حکومت کی پالیسیوں کی وضاحت کے لئے عملی اقدام کرنے والی اور زمانے کی مشکلات کے مقابلے میں سینہ سپر ہونے والی ہو۔۹

امام سجادؑ اس بات کی کمی محسوس کرتے تھے۔ اور آپؑ کو اس کی شکایت تھی۔ کیونکہ آپؑ کی مدد کے لئے مطلوبہ بیدار اور مخلص عوامی طاقت موجود نہ تھی۔ امامؑ ایک لطیف اور دلچسپ پیرائے میں اس حقیقت کا تجزیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔

"اے خدا! میں نے مشکلات و مصائب کے مقابلے میں اپنی بے بسی کا مشاہدہ کیا۔ اور دیکھا کہ جنگ کے ذریعہ اعداء پر غالب آنے سے قاصر ہوں۔ اور دشمنوں کی کثیر تعداد کے درمیان تنہا ہوں"۔۱۰

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ امامؑ نے دشمن کے بارے میں خوب جاننے کے بعد اپنی پالیسی کا تعین کیا ہے نیز ان پر غلبہ پانے کے عوامل بیان فرمائے ہیں۔ کیونکہ امامؑ کی نظر میں فتح و کامیابی کا انحصار مددگاروں اور بیدار طبقے کی تربیت اور تیاری پر ہے جو امامؑ کی تنہائی اور بے بسی کو منظم اثر و نفوذ کی حامل ایسی طاقت میں بدل

دیں جو اسلام کے نفاذ پر قادر ہو۔ یعنی یہ کام آگاہ و بیدار عوامی حلقوں میں نفوذ اور قیادت کی عملی طاقت کے بل بوتے پر ممکن تھا۔

امامؑ نے اس طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا کہ۔

"ووحدتی فی کثیر عدد۔۔۔۔۔"

"میں نے خود کو کثرت کے درمیان تنہا پایا۔"

بنا برایں کامیابی کی شرط یہ ٹھہری کہ جذباتی لوگوں کا یہ طبقہ کمیت کے ساتھ ساتھ کیفیت کے لحاظ سے بھی ایک بیدار و آگاہ گروہ میں بدل جائے۔ خاص کر ان حالات میں جب کہ منحرف حکومت کے زیرِ اثر خود باختہ نسلیں پروان چڑھ چکی تھیں۔

بنابرایں حصولِ حکومت کے لئے ایک شیعی تحریک کی قیادت سنبھال کر کسی بڑے مقصد تک رسائی حاصل نہیں کی جاسکتی تھی۔ بلکہ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری تھا کہ پہلے ایک نظریاتی لشکر کی تیاری عمل میں آتی، جسے امامؑ کے اہداف پر یقین ہوتا، جو حکومت کے حوالے سے آپؑ کی پالیسیوں کو تقویت پہنچاتا اور یوں امت کے لئے حاصل شدہ ثمرات و نتائج کی حفاظت کرنے والا ہوتا۔

رہا یہ کہنا کہ "امام حسینؑ کی نسل سے جو امامؑ آئے انہوں نے سیاست چھوڑ دی اور دنیا سے کنارہ کشی اختیار کی۔" تو اس نظریہ کی تکذیب خود ائمہؑ کی زندگیوں کے مشاہدے سے ہوتی ہے۔ جو اس قسم کے دلائل و شواہد سے مالامال ہیں جن سے سیاسی و اجتماعی امور میں ان کی مثبت فعالیت کا ثبوت ملتا ہے۔ ان شواہد میں سے ایک امتِ مسلمہ اور اس کے چیدہ چیدہ عمائدین سے آپؑ کا

رابطہ ہے۔

کیونکہ یہ قیادت آپؑ کو نہ اتفاقاً حاصل ہوئی تھی اور نہ فقط رسول اللہؐ سے قرابت و نسبت کی بناء پر۔ (وگرنہ رسولؐ سے نسبت رکھنے والے اور بھی تھے) بلکہ یہ امامؑ کی قربانیوں کی بدولت اور آپؑ کے اس مثبت کردار کی وجہ سے تھی جو آپؑ نے امتِ مسلمہ کے حوالے سے انجام دیا۔ باوجود یہ کہ آپؑ کو حقِ حکومت سے محروم کیا گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ عام طور پر کوئی قوم بغیر کسی وجہ کے کسی کو اپنا رہبر نہیں مانتی۔ اور نہ ہی کوئی شخص قوم کو کسی قسم کا غیر معمولی فائدہ (جس کا قوم زندگی کے مختلف میدانوں میں مشاہدہ کرے اور جس سے اپنی مشکلات کے حل اور اپنے مشن کی حفاظت کے لئے استفادہ کرے) پہنچائے بغیر ان کی قیادت یا ان کے دلوں پر قبضہ کر سکتا ہے۔ امامؑ کی انہی ذاتی صفات کی بناء پر فرزدق نے آپؑ کی شان میں ایک مشہور و معروف قصیدہ کہا تھا جس کا مطلع یہ ہے کہ۔

هذا الذی تعرف البطحاء و طاته

والبیت یعرفه والحل و الحرم

"یہ (امام سجادؑ) وہ ہستی ہیں جن کے قدموں کی چاپ سے مکہ کی سرزمین آشنا ہے۔ خدا کا گھر اس کو پہچانتا ہے۔ اور حل و حرم اس کو جانتے ہیں۔"

اس مقام پر ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ سلطنت و اقتدار کی ہیبت کے باوجود خلیفہ ہشام کو ایامِ حج میں حجرِ اسود تک جانے کے لئے لوگوں کے جمِ غفیر کے درمیان سے راستہ نہ مل سکا۔ جب کہ اس کے برخلاف امام زین العابدینؑ پل بھر

میں لوگوں کی توجہ اپنی طرف جذب کر لیتے ہیں۔ لوگ آپؑ کی تشریف آوری سے آگاہ ہوتے ہی حجرِ اسود تک پہنچنے کے لئے آپؑ کو از خود راستہ دیتے ہیں۔۱۱

عوامی قیادت کے یہ سارے مظاہر جن کا تمام ہی ائمہؑ کی زندگی میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ ائمہؑ کا رویّہ اجتماعی معاملات سے گریز پر مبنی نہ تھا۔ بلکہ مثبت فعالیت پر مبنی تھا۔ امت کو بھی اسلام کی حمایت میں آپؑ کے قائدانہ کردار کا احساس تھا۔ لیکن دوسری جانب ہم یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ امام سجادؑ ظالم حکمرانوں کے خلاف براہِ راست مسلح جدوجہد کا کام امت کے ان انقلابی افراد پر چھوڑتے ہیں جو مسلمانوں کے ضمیر اور عزم و ارادے کو زوال کی گھاٹی میں گرنے سے محفوظ رکھنے کے لئے قیام کرتے ہیں۔

امام سجادؑ کی طرف سے کھل کر انقلابی لوگوں کی زبردست تعریف کرنے کی وجہ یہی تھی۔ امامؑ کے وہ خطاب سارے مسلمانوں کے لئے تھے جن میں آپؑ نے ان کو بنی امیہ کے خلاف اپنی انقلابی ذمہ داریاں نبھانے کا شوق دلایا تاکہ امتِ مسلمہ ظالم حکمرانوں کے آگے اپنے تشخص اور وقار کے دفاع سے دست بردار نہ ہو۔

امامؑ کا بنفسِ نفیس انقلابی اور مسلحانہ کارروائیوں سے احتراز اور ایسا کرنے والوں کی تائید و تعریف پر اکتفا کرنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ آپؑ نے قیادت کے سیاسی پہلو کو خیرباد کہہ دیا ہو اور فقط عبادت میں مگن ہوگئے ہوں۔ ہاں امامؑ اپنے طریقۂ کار میں تبدیلی لائے تھے۔ یاد رہے کہ طریقۂ کار کا تعین ہر امامؑ کے دور کے مخصوص حالات کی روشنی میں ہوتا ہے۔۱۲

خلاصہ یہ کہ بعض مورخین اس قسم کے جو غلط تصورات و نظریات پھیلاتے

ہیں وہ غلط اور بے بنیاد ہونے کے علاوہ عملی لحاظ سے بھی خطرناک ہیں۔ کیونکہ ان باتوں سے انسان کے اندر اجتماعی مسائل سے گریز نیز امت و قیادت کو درپیش مسائل و مشکلات کے مقابلے میں کنارہ کشی اور لاتعلقی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ۱۳۔

بعض مورخین نے مذکورہ بالا بے بنیاد تصور کی بناء پر سیاست سے ائمہؑ کی کنارہ کشی کا نظریہ قائم کیا۔ ادھر بعض مفکرین نے بھی علماء دین اور دین دار لوگوں کو دعوت دی کہ وہ ائمہؑ کی سیرت پر چلتے ہوئے سیاسی مسائل سے کنارہ کش ہوجائیں۔ کیونکہ سیاسی مسائل میں پھنسنا ان کی نظر میں اسلام کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ ۱۴

درحقیقت ائمہؑ کے بارے میں یہ نظریہ اس وقت قائم ہوا جب فکری (اعتقادی) تشیع کو سیاسی تشیع سے جدا کرنے کا نظریہ پیدا ہوا۔ شیعوں کے ذہن میں یہ نظریہ تب قائم ہوا جب وہ حالات کے اسیر ہوئے۔ نیز امت کی تعمیر اور رسول اللہؐ کے عظیم انقلابی و اصلاحی پروگرام کی تکمیل کے لئے ضروری اسلامی قیادت کی بقاء کے معینہ راستے کی حیثیت سے تشیع کا جذبہ ان کے دلوں سے محو ہوکر ایک خالی عقیدے کی شکل اختیار کرگیا جس سے انہوں نے دل لگایا اور اسی سے آس باندھے رہے۔ ۱۵۔

حقیقت میں تشیع ایک معین اصول کا نام ہے جس کا مقصد اسلامی قیادت کی حفاظت اور بقاء ہے۔ اسلامی قیادت رسولِ کریمؐ کے شروع کردہ انقلابی و اصلاحی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے سے عبارت ہے۔ تاکہ اسلام کی بنیاد پر امت کی عمارت مکمل کی جائے۔ بنابرایں ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ائمہؑ نے

سیاسی میدان چھوڑ دیا ہو۔ ہاں یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ (نعوذ باللہ) وہ اسلام کی حمایت سے ہی دستبردار ہو جاتے۔۱۶

دائرۂ حکومت سے ائمہؑ کو دور رکھنے کے لئے ہونے والی سازشوں کے باوجود ائمہؑ مکتبِ اسلام کی حفاظت نیز اسلامی اقدار اور اصولوں میں مکمل انحراف کو روکنے کے لئے پیہم اپنی ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔ جب بھی انحراف شدید ہوتا اور زوال کی گھاٹی میں پھسلنے کا مرحلہ قریب آتا تو ائمہؑ اس سے بچاؤ کے لئے ضروری اقدام فرماتے تھے۔

جب بھی اسلامی نظامِ حیات کو مشکلات کا سامنا ہوتا اور منحرف حکمران اپنی نااہلی کی بناء پر ان کو حل کرنے سے عاجز ہو جاتے تو ائمہؑ ان کو حل کرنے اور امت کو خطرات کے بھنور سے نکالنے کے لئے فوری اقدام فرماتے تھے۔

مصادر و ماخذ

۱۔ ثورۃ الحسینؑ از محمد مہدی شمس الدین
۲۔ اعیان الشیعہ۔ ص۳۲۱۔۳۲۳
۳۔ ثورۃ الحسینؑ از محمد مہدی شمس الدین
۴۔ زین العابدینؑ از سید الاهل
۵۔ الموسوعہ۔ ص۲۶۰
۶۔ دور الائمہؑ از شہید صدر
۷۔ بحث فی حول الولایہ از شہید صدر
۸۔ دور الائمہؑ

۹۔ دورالائمہ

۱۰۔ صحیفہ سجادیہ

۱۱۔ دورالائمہ از شہید صدر

۱۲۔ بحث فی حول الولایہ از شہید صدر

۱۳۔ دورالائمہ از شہید صدر

۱۴۔ اشارہ ہے ڈاکٹر صادق مہدی سعید کے لیکچر کی طرف جو انہوں نے نجف میں دیا۔

۱۵۔ بحث فی حول الولایہ از شہید صدر

۱۶۔ بحث فی حول الولایہ از شہید صدر

تیسرا حصہ

دوسرا مرحلہ

اس مرحلے میں ائمہؑ کی کوششوں کا رخ مکتبِ تشیع کی تفصیلی حد بندی، تعین اور اس امر کے اظہار کی طرف رہا۔ کیونکہ اس طبقے کو اسلام کے حقیقی نظریات کا پاسبان اور مومن جماعت ہونے کی حیثیت حاصل تھی۔ مکتبِ تشیع کے تفصیلی خدوخال اور اس کی ماہیت، مرحلۂ اوّل کے ائمہؑ کے دور میں ہر شخص کے لئے مکمل طور پر واضح نہ تھی۔ کیونکہ عملاً ان معصومینؑ کی بنیادی توجہ انحراف سے پیدا ہونے والے بحران سے نمٹنے، اسلام کو تحریفات سے پاک شریعت کے طور پر باقی رکھنے، اس کی حمایت و حفاظت کرنے اور اس جذبۂ مقاومت کو جو وفاتِ رسولؐ کے بعد والے انحرافی برسوں میں امت نے کھودیا تھا لوٹانے کی کوششوں کی طرف مبذول رہی۔ لیکن دوسرے مرحلے میں ائمہؑ کے پاس شیعہ مکتب کی امتیازی خصوصیات اور خدوخال کو معین کرنے کے لئے زیادہ زرین مواقع تھے۔

بعض مورخین نے شیعی سوچ کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ انہوں نے اسے اسلامی تاریخ کے حوادث کی پیداوار قرار دیا ہے اور اپنے قول کی تائید میں اس بات سے استناد کیا ہے کہ۔

"شیعہ مذہب نے تاریخِ اسلام کے معاشرتی حوادث کے نتیجے میں بتدریج ظاہر ہونا شروع کیا اور اس مرحلے میں پہنچ کر واضح شکل و صورت اختیار کرگیا۔"

لیکن درحقیقت مکتبِ تشیع اسلام کے خاکے میں پیغمبرِ اسلامؐ کے منصوبے کی عملی تعبیر کی حیثیت سے موجود تھا۔ یہ وہ منصوبہ تھا جسے اسلام کا مستقبل محفوظ کرنے کے لئے خدا کے حکم سے رسول اللہؐ نے وضع کیا۔ پس شیعہ مکتبِ فکر تاریخی حوادث کے اتفاقی نتیجے میں نہیں بلکہ اسلام اور اس کے بنیادی تقاضوں کی فطری ضرورت کے طور پر وجود میں آیا۔ بالفاظ دیگر اسلام کے بطن سے تشیع کا پیدا ہونا فطری اور ضروری تھا۔ یا یوں کہیں کہ اسلام کے اولین قائد کے لئے ضروری تھا کہ اپنے منصوبے کو آگے بڑھانے کے لئے اپنے جانشین قائد کو تیار کرتے۔ تاکہ اس (دوسرے قائد) اور اس کے اوصیاء کے ہاتھوں اسلام کے انقلاب آفرین ارتقاء کا سلسلہ جاری رہے۔ (بحث فی حول الولایہ)

پس ائمہؑ کی پالیسیاں ترکیب، تکوین اور جوانب کے لحاظ سے مختلف تھیں۔ اس اختلاف و تنوع کی وجہ ہر مرحلے میں حالات کے مطابق اسلام کے تقاضوں اور لوازمات کا اختلاف تھی۔

۔ خلاصہ یہ کہ دوسرے مرحلے کے ائمہؑ (امام محمد باقرؑ، امام جعفر صادقؑ و امام موسیٰ کاظمؑ) نے پیچیدہ معاشرتی حالات میں بہترین منصوبہ بندی کے ساتھ مکتبِ تشیع کے تفصیلی خدوخال کو واضح کرنے کی طرف پوری توجہ دی۔

امام محمد باقر علیہ السلام

ائمہؑ کی کارکردگی کے مختلف مراحل (جن کو ہم نے اپنی گفتگو میں مدِ نظر رکھا ہے) میں سے دوسرے مرحلے کی ابتداء غالباً امام محمد باقر علیہ السلام سے ہوئی۔

جب مرحلہ اول کے ائمہؑ اسلام کو انحراف کے بحران سے بچانے اور اسے ایک شریعت یا قانونِ زندگی کی حیثیت سے محفوظ رکھنے کا کارنامہ انجام دے چکے تو دوسرے مرحلے کے اماموں کی کوششوں کا آغاز امام محمد باقر علیہ السلام کی جدوجہد سے ہوا۔ آپؑ کی کوششوں کا خصوصی محور یہ رہا کہ آپؑ حقیقی اسلامی تعلیمات کے محافظ اور مومن گروہ ہونے کی حیثیت سے مکتبِ تشیع کے ماننے والوں کی خصوصیات اور حدود کو معین فرمادیں۔

ان دونوں مرحلوں کا تفاوت یہ ہے کہ پہلے مرحلے کے اماموں نے محدود پیمانے پر تشیع کا تعارف کرایا۔ کیونکہ یہ ائمہؑ ایک اہم مسئلے کی چارہ جوئی میں مصروف تھے۔ (یعنی انحراف کے بحران سے اسلام کو محفوظ رکھنے میں)۔ لیکن دوسرے مرحلے کے ائمہؑ خاص کر امام محمد باقر علیہ السلام کی بنیادی کوشش یہ رہی کہ وسیع پیمانے پر شیعہ مذہب کے ڈھانچے کی واضح و جامع تفصیلات کو بیان کریں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پہلے مرحلے کے ائمہؑ نے شیعہ مکتبِ فکر کو واضح

کرنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اس مسئلے کی طرف ان کی توجہ ثانوی درجے کی حامل اور ایک خاص حد تک تھی۔ چنانچہ امام علیؑ نے بھی اپنے شیعوں کے ایک خاص طبقے مثلاً سلمان فارسیؓ' ابوذر غفاریؓ' عمار یاسرؓ اور مالک اشترؓ وغیرہ کی سطح پر یہ کام انجام دیا تھا۔

امام محمد باقر علیہ السلام امت کی نظر میں

امام محمد باقر علیہ السلام کی آمد امت کے سلسلہ میں اہم اصلاحی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا پیش خیمہ تھی۔ کیونکہ امت آپؑ کو ان لوگوں میں سے ایک فرد کی حیثیت سے پہچانتی تھی' جنہوں نے اپنی جانوں اور اپنے خون سے انحراف کی لہروں کو (جو اسلام کی بیخ کنی کررہی تھیں) روکنے کے لئے قربانی دی تھی۔ وہ اپنی قربانی اور جہاد کے ذریعے مسلمانوں کو اس بات سے آگاہ کرنا چاہتے تھے کہ اسلام کے نام پر ان کے اوپر حکومت کرنے والے (اموی) حکام' اسلام سے کوسوں دور ہیں یہاں تک کہ کتاب و سنت اور ان منحرف حکمرانوں کا طرزِ عمل ایک دوسرے کے بالکل متضاد ہے۔

منحرف حکام کی حقیقت اور اسلام سے ان کی دوری کو لوگوں پر واضح کرنا مرحلۂ اول کے اماموں کی ذمہ داری تھی۔ وہ اپنی کوششوں اور قربانیوں کے نتیجے میں اس مقصد میں کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد امام محمد باقر علیہ السلام تشریف لائے تاکہ ان مقاصد اور کوششوں کو ثمر بخش بنائیں۔ نیز مسلمانوں کو اچھی طرح سمجھائیں کہ یہ عظیم جدوجہد اور قربانیاں ہرگز اسلام کی نصرت کے لئے غیرتِ دینی کے جوش میں کسی فرد کی جانب سے کی گئی ذاتی اور جذباتی کوششیں نہ

تھیں۔ بلکہ صحیح پہچان کے مطابق اسلام پر ایمان رکھنے والے مومن گروہ کی تشکیل کے لئے ہونے والی سلسلہ وار سرگرمیوں کا ایک حصہ تھیں۔ اور یہ کہ یہ مومن گروہ اپنی مخصوص نشانیوں، علامات اور شرائط کا حامل ہے نیز اسلامی نظامِ زندگی کے ہر شعبے میں اس کا اپنا الگ نقطۂ نظر موجود ہے۔

بنابرایں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ امام محمد باقر علیہ السلام کی جدوجہد آپؑ کے گزشتہ معصوم آباء واجداد کے کارناموں کو باقی رکھنے اور ترقی دینے کے لئے انہی کے نہج پر سلسلہ وار کام کرنے سے عبارت تھی۔

پس مرحلۂ اول کے ائمہؑ کی قربانیوں سے پیدا ہونے والے حالات کی بناء پر امام محمد باقر علیہ السلام کو امتِ مسلمہ کے درمیان ایک بلند مقام حاصل ہوا۔ اس مقام و منزلت کی پہچان تاریخ کی متعدد نصوص سے ہوتی ہے۔ چنانچہ جب اموی خلیفہ "ہشام" نے امامؑ کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ کون ہے؟ تو اسے جواب دیا گیا کہ "یہ وہ شخص ہے جس کے اہلِ عراق فریفتہ ہیں۔ یہ عراقیوں کا امام ہے۔"

چنانچہ حبابہ الوالبیہ نے روایت کی ہے کہ۔

"میں نے مکہ میں ایک شخص کو "باب" اور "حجر" کے درمیان ایک بلند مقام پر دیکھا۔ لوگ اس سے پیچیدہ مسائل پوچھ رہے تھے اور مشکلات کا حل دریافت کررہے تھے۔ وہ اس وقت تک وہاں سے نہ اٹھے جب تک ہزار سوالوں کے جواب نہ دے چکے۔ جب آپؑ اٹھ کر اپنی قیام گاہ کی جانب روانہ ہوئے تو ایک منادی بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ "لوگو! یہ ہے نورِ روشن ----" ادھر کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ یہ کون ہے؟ تو

بعض لوگوں نے جواب دیا یہ محمد بن علی باقرؑ ہیں۔ جو علوم کی موشگافی کرنے والے اور معرفت کے ساتھ گفتگو کرنے والے ہیں۔ یہ ہیں علی ابنِ حسین ابنِ علی ابنِ ابی طالب کے بیٹے محمدؑ۔"

ابرشی کلبی نے ہشام کے بارے میں روایت کی ہے کہ جب اس نے امام محمد باقر علیہ السلام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ جس کے گرد اہلِ عراق کا ہجوم ہے اور اس سے سوال کر رہے ہیں؟ تو اسے جواب دیا گیا کہ۔

"یہ کوفیوں کا نبی ہے جو خود کو رسولؐ کا فرزند، علم کی موشگافی کرنے والا اور قرآن کا مفسر سمجھتا ہے پس اس سے کوئی ایسا سوال کرو جس کا جواب اس کے پاس نہ ہو۔"

حج کے ایام میں عراق، خراسان اور دیگر مقامات کے ہزاروں مسلمان آپؑ سے شرعی مسائل کا حل پوچھتے اور آپؑ سے اسلامی تعلیمات کے ہر شعبے سے متعلق سوالات کرتے تھے۔ یہ ساری باتیں عوام کے ساتھ آپؑ کے رابطے اور مسلمانوں کے دلوں میں آپؑ کے گہرے اثر و نفوذ اور آپؑ کے ساتھ لوگوں کے لگاؤ کی دلیل ہیں۔

مختلف مکاتبِ فکر کے بڑے بڑے فقہاء کی طرف سے آپؑ کو چیلنج دینے، سخت سوالات اٹھا کر آپؑ سے ان کا جواب مانگنے اور لوگوں کے سامنے آپؑ کو شکست دینے کی بکثرت ناکام کوششیں ہوئیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو ان میں سے کوئی ایک شہر سے دوسرے شہر اس غرض سے سفر کرتا تھا تاکہ آپؑ کے سامنے کوئی لاینحل سوال اٹھا سکے۔ یہ حقائق امامؑ کی باریک منصوبہ بندی، امتِ مسلمہ کے ساتھ آپؑ کے گہرے لگاؤ اور امت کے اندر آپؑ کے اس اثر و نفوذ کی طرف

اشارہ کرتے ہیں جس کے باعث مختلف علاقوں میں مختلف قسم کے ردِ عمل دیکھنے میں آئے۔

بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کی عوامی قیادت عالمِ اسلام میں موجود حد بندیوں، گروہ بندیوں اور قبائلی تقسیم بندیوں سے ماوراء تھی۔ آپؑ کسی ایک قوم یا جماعت کے رہبر نہ تھے بلکہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والے نئے گروہ یا قبائل بھی آپؑ کی رہبری کا اعتراف کرتے تھے اور روحانی طور پر آپؑ سے منسلک ہوتے تھے۔ حالانکہ بنی امیہ کی خلافت کے دوران "مضریوں" اور "حمیریوں" کے درمیان زبردست چپقلش اور محاذ آرائی پائی جاتی تھی لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں قبیلوں کے افراد امامؑ کے صفِ اول کے اصحاب میں شامل ہیں۔ یہاں تک کہ شیعوں کے دو مسلمہ اور معروف شاعروں کا تعلق ان دونوں قبیلوں سے تھا۔ چنانچہ فرزدق کے تمیمی، مغیری ہونے اور کمیت اسدی کے حمیری ہونے کے باوجود دونوں ہی امامؑ اور اہلِ بیتؑ کی محبت میں متفق نظر آتے ہیں۔

عوام کے ساتھ باہمی لگاؤ اور ان کے درمیان وسیع اثر و نفوذ کا یہ مقام امام محمد باقر علیہ السلام کو ان کوششوں اور قربانیوں کے نتیجے میں ملا جن کا مظاہرہ مرحلۂ اول کے ائمہؑ نے کیا۔ انہی کوششوں اور قربانیوں کے باعث دوسرے مرحلے کے ائمہؑ کو مکتبِ تشیع کے خدوخال مفصل اور واضح صورت میں پیش کرنے کا موقع ملا۔

امام محمد باقر علیہ السلام تشیع کا تعارف کراتے ہیں

ہم نے ذکر کیا کہ اس دوسرے مرحلے میں امامؑ کی بنیادی ذمہ داری کا رخ

شیعہ مکتبِ فکر کے تفصیلی اور امتیازی خدوخال کو واضح کرنے، اس سلسلے میں محدود پیمانے پر بعض افراد کی بجائے وسیع پیمانے پر کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے شیعی جماعت کو پروان چڑھانے کے لئے جدوجہد کرنے، تشیع کو حقیقی اسلام کا نمونہ بنا کر پیش کرنے اور زندگی کے تمام شعبوں کی اصلاح کی طرف تھا۔ اس سلسلے میں امامؑ کے سامنے اپنے عظیم اور تاریخی اہداف تک پہنچنے کے لئے جدوجہد کے دو راستے تھے۔

پہلا راستہ

اپنے مدرسے کے ذریعے وسیع پیمانے پر لوگوں کی فکری و عملی تربیت :

آپؑ نے اسی غرض کے پیشِ نظر نیز علماء و طلاب کو اسلامی علوم، فنون اور آداب سے مزیّن کرنے کے لئے ہی اس مدرسے کی بنیاد رکھی تھی۔ کیونکہ درحقیقت امام محمد باقر علیہ السلام اپنے زمانے میں علومِ اسلامی کے حوالے سے عالمِ اسلام کے واحد ملجاء و ماویٰ تھے۔ آپؑ کے دور کے علماء آپؑ کی علمی عظمت (جس تک کوئی رسائی حاصل نہ کرسکتا تھا) کے اعتراف کے طور پر آپؑ کے آگے اظہارِ عاجزی کرتے تھے۔[۱]

آپؑ کا مدرسہ ہزاروں علماء و محدثین کی تربیت گاہ تھا۔ جابر جعفی کہتا ہے کہ۔

"ابو جعفرؑ (باقرؑ) نے میرے لئے ستّر ہزار احادیث بیان کیں۔"

محمد بن مسلم کا کہنا ہے کہ۔

"جب بھی کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا تو میں امام محمد باقر علیہ السلام سے

سوال کرتا۔ یہاں تک کہ تیس ہزار حدیثیں آپؑ سے پوچھیں۔"

ابنِ شہر آشوب نے امامؑ سے حدیث نقل کرنے والوں میں باقی ماندہ اصحابِ رسولؐ بڑے بڑے تابعین اور چیدہ چیدہ مسلم فقہا کا نام لیا ہے۔ مثلاً صحابہ میں سے جابر بن عبداللہ انصاریؓ۔ تابعین میں سے جابر بن یزید جعفی اور کیسان سختیانی۔ فقہا میں سے ابنِ مبارک زہری، اوزاعی، امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، زیاد بن منذر اور مصنفین میں سے طبری، بلاذری، سلامی اور خطیب جیسے مورخین وغیرہ۔

دوسرا راستہ

امت کے سامنے مکتبِ تشیع کے تشخص کو منظرِ عام پر لانا :

یہ کام ائمہؑ کی تاریخ میں تقریباً پہلی بار ہو رہا تھا۔ امامؑ شیعیت کے مفہوم کو (ایک ایسی بیدار جماعت کے عقیدے کے طور پر جو اسلام کے بارے میں اپنی مخصوص تعبیر و تفسیر رکھتی ہے اور جس کی تشہیر اسلامی معاشرے میں ضروری بھی ہے) واضح اور جامع و مانع انداز میں لوگوں کے ذہنوں میں راسخ کرنا چاہتے تھے۔

امامؑ اپنے شیعوں کی تعریف ان الفاظ میں کیا کرتے تھے کہ۔

"ہمارے شیعہ فقط وہ لوگ ہیں جو ہماری ولایت میں ایک دوسرے کے لئے قربانی دیتے ہیں۔ ہماری محبت میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ احیاء دین کے لئے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ غصے کے وقت ظلم پر نہیں اترتے۔ خوشی کے وقت حد سے نہیں گزرتے۔ ہمسایوں

کے لئے باعثِ برکت اور مخالفین کے ساتھ صلح جو اور امن خواہ ہیں۔"

نیز فرمایا کہ۔

"ہمارے شیعہ وہ ہیں جو خدا کی اطاعت کریں۔"

لیکن بعض اوقات امامؑ کے مخالفین جو ان کے مقابلہ پر اتر آتے تھے اور اکثر و بیشتر لوگوں کے ذہنوں میں ان چیزوں کے بارے میں شکوک و شبہات کو ابھارتے تھے جن کے لئے امامؑ کوشاں تھے اور لوگ جن پر اعتقاد رکھتے تھے۔ اسی لئے امامؑ امت کی سطح پر اپنے مخصوص نقطہ نظر اور امتیازی خیالات کا کھل کر اظہار فرماتے تھے۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہم السلام نے ایک ساتھ حج کیا۔ جب امامؑ اپنے فرزند امام جعفر صادقؑ کے ساتھ مسجدِ حرام پہنچے تو وہاں ہشام بن عبدالملک کی موجودگی میں لوگوں کا جمِ غفیر جمع تھا۔ اس موقع پر امام جعفر صادقؑ نے اپنے والدِ بزرگوار کی موجودگی میں کھڑے ہو کر لوگوں کے لئے اس بات کی تشریح فرمائی کہ "اہلِ بیت کے شیعہ" ہونے کا مطلب کیا ہے۔ آپؑ نے واضح الفاظ میں فرمایا کہ اہلِ بیتؑ کے شیعوں کو کن صفات و خصوصیات کا حامل ہونا چاہئے۔ اور یہ کہ وہ اجتماعی اور روحانی طور پر معاشرے کی نگہبانی کرنے والے ہیں نیز وہی آپؑ کے حقیقی وارث ہیں۔

اس قدر وسیع عوامی سطح پر خاص کر ہشام بن عبدالملک کی موجودگی میں امامؑ کا یہ واضح اعلان ایسا قدم نہ تھا جو آپؑ نے اندھا دھند اور بغیر سوچے سمجھے اٹھایا ہو۔ بلکہ آپؑ کا یہ اقدام اس دور کے تقاضوں کے پیشِ نظر نپی تلی منصوبہ بندی

اور حکمتِ عملی کے مطابق تھا۔ اس مرحلے میں ائمہؑ کے لئے عوام کو یہ سمجھانے کی ضرورت تھی کہ بنیادی مسئلہ فقط امام حسینؑ (جو راہِ اسلام میں مخلصانہ جنگ لڑتے ہوئے شہید ہوئے) کے انتقام کا نہیں بلکہ اس سادہ تصور سے کہیں بلند و بالا ہے۔ نیز یہ کہ مسئلہ اصولِ قیادت اور واضح دینی حکمتِ عملی کا ہے۔ قیادت کا یہی مسئلہ امام حسینؑ کے لئے پیش آیا تھا اور اب دوبارہ سامنے آرہا تھا بلکہ اس مسئلے نے آئندہ بھی ہر دور میں سر اٹھاتے رہنا تھا۔

یہاں یہ ضروری تھا کہ مذکورہ امر سے امت کو تفصیلی طور پر اور مکمل طریقے سے آگاہ کیا جائے اور امت کو بیدار کرنے کی اتنی کوشش کی جائے جس کے نتیجے میں حالات بدل جائیں۔

اس حقیقت کی اس سے واضح دلیل اور کیا ہوگی کہ ایک دفعہ امام محمد باقر علیہ السلام اموی خلیفہ کے پاس تشریف لائے۔ خلیفہ نے آپؑ کا مذاق اڑانے کی غرض سے پوچھا۔

"کیا فرزندِ ابو تراب ہو؟"

پھر اس نے آپؑ کی بے احترامی شروع کی۔ لیکن امامؑ اس کی ان حرکتوں سے مرعوب نہ ہوئے۔ بلکہ آپؑ نے اس کے بعد اس کی مجلس میں اہلِ بیتؑ کی قیادت اور ان کے حقِ حکومت کی تشریح کے لئے خطبہ دیا۔ یوں امامؑ نے دعوتِ عام دے کر اور برملا اعلان فرما کر مذکورہ وسیع لائحہ عمل کے تحت ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ اور اس طرح اپنے واضح اہداف کے ساتھ امت کے سامنے آگئے۔

امامؑ کے منصوبے اور راستے کی رکاوٹیں

ان ایام میں عام مسلمانوں کی زندگی میں ایک نیا اصول جنم لے رہا تھا جو ان

اصولوں کے بَرخلاف تھا جن کی امامؑ دعوت دے رہے تھے۔ امام محمد باقر علیہ السلام کے ابتدائی دور کی یہ کیفیت (ایک نظریاتی اصول کی صورت میں) ایک جدید سیاسی انحراف کی ابتداء تھی۔ درحقیقت یہ اس سیاسی انحراف کی ایک کڑی تھی جس کا ذکر ہم نے مرحلۂ اول کے ائمہؑ کے تذکرے میں کیا۔

مختصر یہ کہ وہ سیاسی انحراف جس کا سامنا دورِ اول کے ائمہؑ نے کیا اس مرحلے (جو اسّی (۸۰) سال پر محیط تھا) میں پہنچ کر ایک جدید اسلوب و اصول کی شکل میں ڈھلنے لگا تھا جو امامؑ کے اسلوب و اصول کے برعکس تھا۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

☆ اس اسلوب کی ابتداء اصحاب و تابعین کی قیادت میں ہوئی۔ ان قیادت کرنے والوں کو بخوبی علم تھا کہ رسول اللہؐ نے سیاسی و فکری قیادت کے لئے بحکمِ خدا امام علیؑ کو چنا تھا۔ اس بناء پر کہ آپؑ ہی وہ ہستی ہیں جو تبلیغِ رسالت کی راہ میں خود کو فنا کرنے کی بناء پر اس عہدے کے حقدار بنے تھے۔ نیز وہ یہ بھی جانتے تھے کہ خلافت آپؑ کے بعد آپؑ کے اوصیاء کا حق ہے۔ لیکن وفاتِ رسولؐ کے بعد سقیفہ کی میٹنگ کے نتیجے میں براہِ راست آپؑ کی سیاسی قیادت چھین لی گئی تھی۔

☆ رہی فکری قیادت تو اسے ایک باقاعدہ قیادت کی حیثیت نہ مل سکی اور اس لحاظ سے متروک و معطل رہی۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے کوئی قابلِ ذکر منصوبہ بندی نہیں ہوئی۔ یہ خلفاء ثلاثہ کے دور کی بات ہے۔ تینوں خلفاء کو لاینحل مشکلات و مسائل میں طوعاً و کرہاً امام علیؑ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔۲۰

عصرِ صحابہ کے بعد تابعین کا دور آیا پھر آہستہ آہستہ تبع تابعین کا دور شروع ہونے لگا۔ اس دور میں اسلامی حکومت اور مسلمان معاشرے کے لئے مذکورہ فکری و سیاسی خلاء کا پُر کرنا نہایت مشکل محسوس ہونے لگا۔ اس احساس کے درجِ ذیل اسباب تھے۔

(الف) تبع تابعین کے دور میں لوگ فکری طور پر کتاب و سنت جیسے اسلامی مصادر سے دور ہو چکے تھے۔ زمانے کے لحاظ سے بھی ان کا دور عصرِ پیغمبرؐ سے کافی فاصلے پر تھا۔ چنانچہ وہ لوگ کتاب و سنت سے مختص ماحول، مناسبات اور الفاظ سے دور ہو گئے تھے۔ اس فاصلۂ زمانی کی بناء پر قرآن کے معانی و مفاہیم مبہم ہو چکے تھے۔

(ب) ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ رسول اللہؐ نے کسی شخص کو نظریاتی اور فکری طور پر اس طرح تربیت نہیں دی تھی کہ وہ بعد میں فکری و سیاسی قیادت سنبھالنے کا اہل ہو۔ ان کی نظر میں رسول اللہؐ نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا تھا کہ دینی قیادت کو امت (جس میں تمام مہاجرین و انصار شامل تھے) پر چھوڑ دیا تاکہ وہ خود ہی قیادت کے مسئلے کو حل کریں۔

(ج) جب اسلامی معاشرے میں وسعت آئی اور فوجی فتوحات کے ذریعے مختلف اقوام اور حکومتیں اس میں شامل ہو گئیں تو نتیجہ کے طور پر کثیر تعداد میں ایسے نت نئے مسائل، مشکلات اور پیچیدہ امور کا سامنا ہوا جن کا تصور بھی محال تھا۔

اسلامی حکومت کے سامنے مختلف قسم کے جدید مسائل نمودار ہوئے جن کے لئے اس کے پاس کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ کیونکہ رسول اللہؐ سے نقل ہونے والے شرعی نصوص ضائع ہو گئے تھے۔ جس کے نتیجہ میں اسلامی معاشرہ قرآن و

سنت کے علاوہ دیگر منابع مثلاً قیاس و استحسان وغیرہ کی طرح کے اجتہادات سے کام لینے لگا جن میں مجتہد کا ذاتی ذوق جلوہ گر ہوتا تھا۔ یوں ہوتے ہوتے انسانی پسند، ذوق اور خیالات اسلامی قانون سازی میں داخل ہو گئے۔۳

یہ وہ تین اسباب ہیں جن کی وجہ سے مسلمانوں میں یہ احساس و شعور بیدار ہوا کہ بہت سے ایسے مسائل جن کے بارے میں کوئی نص نہیں پائی جاتی کے بارے میں کسی ایک فکری روش اور اصول پر غور و فکر ضروری ہے جو مذکورہ جدید حالات و مسائل کا مکمل طور پر احاطہ کرے۔ اس بارے میں ادیان و مذاہب کا معروف تاریخ نویس "شہرستانی" کہتا ہے کہ۔

"ہم قطعی طور پر یہ جانتے ہیں کہ عبادات و معاملات کے میدان میں پیدا ہونے والے نئے مسائل بے شمار ہیں اور ان کی حد بندی ممکن نہیں۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ ہر مسئلے کے بارے میں نص (صریح حکم) بیان نہیں ہوئی اور اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پس جب ایک جانب سے نصوص کی تعداد محدود ہو اور دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ محدود چیز غیر محدود چیز کا احاطہ نہیں کر سکتی تو نتیجہ کے طور پر یہ معلوم ہوا کہ اجتہاد اور قیاس کو ماننے بغیر چارہ نہیں۔ تاکہ ہر نئے واقع اور مسئلے کے بارے میں فتویٰ دینا ممکن ہو"۔۴

اس قسم کے حالات میں ان لوگوں (حکامِ وقت) کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ مذکورہ فکری قیادت کو اہلِ بیتؑ کا حق قرار دیتے اور اسے ان کی طرف منسوب کرتے۔ کیونکہ فکری قیادت ہی سیاسی قیادت ہوتی ہے۔ پس اگر وہ فکری قیادت اہلِ بیتؑ کے سپرد کرتے تو یہ سیاسی قیادت تک آسانی سے رسائی کے لئے سب

سے کارگر ہتھیار ان کے حوالے کرنے کے مترادف ہوتا۔ اسی بناء پر ہم اس دور میں ایسے مکاتبِ فکر کو فعال ہوتے اور پروان چڑھتے دیکھتے ہیں جو ایک طرف سے ذاتی رائے اور دوسری طرف سے قیاس و استحسان، مصالح مرسلہ اور عرف کا سہارا لئے ہوئے تھے۔ یہ سرگرمیاں اپنی پیدائش کے لحاظ ہی سے نظریہ، قیادتِ اہلِ بیتؑ سے متصادم افکار کی لہریں تھیں جو اس وقت کے اسلامی معاشرہ میں بھرپور انداز میں پھل پھول رہی تھیں اور جڑ پکڑ رہی تھیں۔

ان حالات میں اہلِ بیتؑ نے ان بے بنیاد نظریات کو باطل ثابت کرنے، جھٹلانے اور اپنے محکم و مضبوط مذہب کی خصوصیات کو ثابت کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

ابنِ جمع کہتا ہے۔ "میں ابنِ ابی لیلیٰ اور ابو حنیفہ کے ساتھ جعفر بن محمدؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؑ نے ابنِ ابی لیلیٰ سے فرمایا۔ یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ اس نے جواب دیا "یہ شخص دینی امور میں بصیرت اور مہارت رکھتا ہے۔" فرمایا : شاید یہ شخص امورِ دین میں اپنی رائے کے مطابق قیاس کرتا ہے۔ اس کے بعد امامؑ نے ابو حنیفہ سے فرمایا : اے نعمان میرے باپ نے میرے جد سے میرے لئے یہ حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔

"سب سے پہلے امورِ دین میں اپنی رائے سے قیاس کرنے والا شیطان تھا۔" کیونکہ جب خداوندِ عالم نے فرمایا "آدم کے آگے سجدہ کر تو شیطان نے جواب دیا۔ میں آدم سے بہتر ہوں کیونکہ تو نے مجھے آگ سے خلق کیا اور اسے مٹی سے۔" پس جو اپنی مرضی سے امورِ دین میں قیاس کرے، قیامت کے دن خداوندِ عالم اس کو شیطان کے ساتھ رکھے گا کیونکہ اس نے قیاس کر کے ابلیس کی متابعت کی۔

اس کے بعد آپؑ نے سوال کیا (جیسا کہ ابن شبرمہ کی روایت میں ہے)
"بتاؤ قتل بڑا گناہ ہے یا زنا؟" ابو حنیفہ نے کہا : قتل۔
فرمایا "بتحقیق خداوندِ عالم نے قتل کے ثبوت کے لئے دو گواہوں کو کافی قرار دیا ہے جب کہ زنا میں چار سے کم گواہوں کو کافی نہیں سمجھا۔"
پھر فرمایا نماز زیادہ اہم ہے یا روزہ؟
کہا : نماز۔
فرمایا تو پھر کیوں حائضہ عورت پر روزے کی قضا واجب ہے نماز کی نہیں۔
وائے ہو تم پر خوفِ خدا کرو اور اپنی رائے سے دین میں قیاس نہ کرو"۔۵

اہلِ بیتؑ کی جدوجہد اور فکری نبرد کے نتیجے میں "اہل الرائے" کی تندیٔ رفتار میں کمی آئی۔ اور مکتبِ رائے کے مخالف مکاتبِ فکر کے لئے راستہ ہموار ہوگیا۔ مثال کے طور پر مکتبِ اہلِ حدیث (جو احادیث، سنت اور صحابہ و تابعین کے فتاویٰ کی حفاظت میں بہت انتہا پسند تھے) نے اپنی طرف دعوت دینی شروع کی اور ساتھ ساتھ اہل الرائے کی مخالفت بھی جاری رکھی۔ یہ مکتبِ فکر مکتبِ رائے کا ردِ عمل تھا۔ کیونکہ اہل الرائے احادیث سے روگردانی اور ذاتی رائے کو ترجیح دینے میں انتہا پسندی سے کام لیتے تھے۔۶

اہلِ بیتؑ نے اپنے معروف اصول "ان دین اللّٰہ لا یصاب بالعقول" (ناقص انسانی عقل کے وضع کردہ احکام سے دین تک رسائی نہیں ہو سکتی) کے ساتھ مکتبِ رائے کا مقابلہ کیا۔ کیونکہ یہ مکتبِ فکر شریعتِ اسلامی کی دھجیاں بکھیر رہا تھا اور اس طرح اسلامی تعلیمات کی خاصیت، صلابت اور

اصالت جو شریعتِ اسلامی کا خاصہ ہیں کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ ادھر اہلِ حدیث شریعتِ محمدیہ کو جمود کی طرف لے جا رہے تھے کیونکہ وہ الفاظ کے ظاہری مفہوم سے وابستہ اور چمٹے رہنے کے حامی تھے۔ نیز وہ شریعتِ محمدیؐ کی لچک اور مختلف سماجی حالات کے مطابق چلنے کی صلاحیت کو اس سے جدا کر رہے تھے۔۷

مصادر و ماخذ

۱۔ مرآۃ الجنان۔ ج۱۔ ص۲۴۸
۲۔ بحث فی حول الولایہ از شہید صدر
۳۔ بحث فی حول الولایہ از شہید صدر
۴۔ سلم الوصول۔ ص۲۹۵
۵۔ الاصول العامہ للفقہ المقارن۔ ص۳۲۹ نقل از حلیۃ الاولیاء۔ ج۳۔ ص۱۹۷
۶۔ الاجتہاد والتقلید از مقدمہ محمد مہدی آصفی۔ ص۱۷۔۱۸
۷۔ ایضاً

امام جعفر صادق علیہ السلام

امام جعفر صادقؑ کے منصوبوں کی راہ میں حائل مشکلات کے بالواسطہ اور بلا واسطہ اسباب' نیز آپؑ کے طریقہ دعوت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم آپؑ کے دور میں امتِ مسلمہ کو درپیش عمومی حالات و مسائل اور حکامِ وقت کی حقیقت سے صحیح آشنائی حاصل کریں۔ اگرچہ یہ آشنائی اجمالی طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے علاوہ خاص طور پر امامؑ کی پوزیشن اور مذکورہ حالات میں آپؑ کے اختیار کردہ موقف کو جاننے کی بھی ضرورت ہے۔ تاکہ آپؑ کی سرگرمیوں کی حدود و ابعاد واضح ہوں۔ جس کے نتیجہ میں آپؑ کی تاریخِ زندگی سے مکمل آگاہی حاصل ہو۔ اور اس راز یا حکمت سے بھی آشنائی ہو کہ آپؑ نے دیگر اسالیب کو چھوڑ کر اپنا الگ اسلوب کیونکر اپنایا؟

امتِ مسلمہ امام جعفر صادقؑ کے دور میں

امتِ مسلمہ خرابیوں اور بُرائیوں میں لتھڑ چکی تھی اور اسلامی نظریات و افکار سے محرومی کا شکار تھی۔ امامؑ سیاسی' سماجی' اخلاقی اور زندگی کے دیگر شعبوں میں اسلامی نظام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے کمربستہ تھے۔ فکری اور عملی

حوالے سے دیکھیں تو لوگوں کے افکار و اعمال میں عقائد کے عام خدو خال بھی واضح نہ تھے۔ یہ بنی عباس کی ان تازہ کوششوں کا ثمر تھا جن کا مقصد جعلی احادیث گھڑنے، ذاتی رائے سے فتویٰ دینے، اسلامی احکام کے منابع و مصادر میں قیاس و استحسان اور مصالح مرسلہ جیسی بدعتوں کو داخل کرنے نیز اس کے علاوہ دیگر امور (جو شریعتِ اسلامیہ کی اصالت و خاصیت کے زائل ہونے کا سبب بنے تھے) کے ذریعے اسلام اور احکامِ اسلام کو مسخ کرنا تھا۔

حکمرانوں کی طرف سے غالیوں اور صوفیوں کی حوصلہ افزائی کی کوششیں نت نئی سرگرمیوں اور فاسد عقائد و نظریات کے ظہور کا باعث بنیں۔ اور ان کے لئے حالات اتنے سازگار ہوگئے کہ امامؑ کے دور میں انہوں نے کافی پیشرفت کی۔ یہاں تک کہ اسلامی عقائد اور احکام کے لئے باعثِ خطر بن گئے۔

علاوہ ازایں امتِ مسلمہ کے اندر شدید سیاسی اور مذہبی تصادم پیدا کرنے کی کوششوں کا بھی سہارا لیا گیا اور یوں امت کو اسلام کی حقیقت سمجھنے اور اس کے مطابق جینے کی فرصت ہی نصیب نہیں ہوئی۔

ان حالات میں امام جعفر صادقؑ کے لئے ضروری تھا کہ ان متضاد نظریات و عقائد اور انحراف کی لہروں کے سامنے ڈٹ جاتے جن کا عملی و فکری لحاظ سے امتِ مسلمہ کو سامنا تھا اور جن سے اسلام کو شدید خطرہ لاحق تھا۔

امامؑ کو انحراف کی دو مختلف صورتوں کا سامنا تھا۔ ایک تو سیاسی انحراف کا جس کے مظہر وقت کے حکام تھے۔ اور دوسری صورت جس کا آپؑ کو سامنا تھا نظریات و عقائد کا انحراف اور اسلام کی حقیقت سے لوگوں کی ناواقفیت تھی۔

یہاں یہ سوال پیش آتا ہے کہ امامؑ نے ان انتہائی پیچیدہ حالات و مسائل کی

چارہ جوئی کے لئے کیا منصوبہ بندی کی۔ جب کہ آپؑ کو حکامِ وقت کی جانب سے شدید مخالفت اور زبردست دباؤ کا بھی سامنا تھا۔

انتخابِ راہ اور منصوبہ بندی

جب امامؑ امت کی فکری و عملی حالت اور اس وقت کی سیاسی صورتِ حال کا جائزہ لے چکے اور اس کا موازنہ اپنے پاس موجود ان وسائل و امکانات سے (جو سیاسی مقابلے میں کامیابی کے لئے ضروری تھے) کر چکے تو آپؑ اس نتیجے پر پہنچے کہ ان حالات میں اور ان محدود وسائل کے ہمراہ حکومت کے ساتھ سیاسی ٹکراؤ اور مقابلے کے بارے میں سوچنا معقول نہیں۔

بنابرایں امامؑ کے خیال میں مسلح قیام اور عارضی فوجی فتح اسلامی احکام کے نفاذ کے لئے کافی نہ تھے۔ کیونکہ احکامِ اسلام کے نفاذ اور اسکی تقویت کا دار و مدار فقط مسلحانہ قیام پر نہ تھا۔ بلکہ اس سے پہلے ایک نظریاتی فوج تیار کرنے کی ضرورت تھی جسے امامؑ اور آپؑ کی عصمت پر مکمل ایمان ہو، جسے امامؑ کے عظیم اہداف سے آگاہی حاصل ہو۔ اور جو حکومت کے مسئلے میں امامؑ کے منصوبوں کو تقویت پہنچانے والی ہو۔ اور اس طرح امت کے لئے حاصل شدہ ثمرات کی محافظ ہو۔

اپنے اصحابؓ میں سے ایک کے ساتھ امامؑ کی گفتگو سے ہماری مذکورہ بالا بات کی وضاحت ہوتی ہے۔

سدیر صیرفی سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ میں امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔

"خدا کی قسم آپؑ کے لئے یونہی بیٹھے رہنا مناسب نہیں۔"

فرمایا۔ "کیوں اے سدیر؟"

میں نے عرض کیا۔ "اس لئے کہ آپؑ کے شیعوں اور مددگاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔"

فرمایا۔ "تمہارا کیا خیال ہے وہ کتنے ہوں گے؟"

میں نے عرض کیا۔ "ایک لاکھ ہوں گے۔"

فرمایا۔ "کیا واقعی ایک لاکھ ہوں گے؟"

میں نے عرض کیا۔ "جی ہاں! بلکہ دو لاکھ ہوں گے۔"

فرمایا۔ "کیا دو لاکھ؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں! بلکہ دنیا کے آدھے لوگ۔"

سدیر کہتا ہے۔ "یہ سن کر امامؑ نے کوئی جواب نہ دیا۔"

اس کے بعد سدیر اور امامؑ دونوں چلے۔ یہاں تک کہ ایک چشمے کے پاس پہنچے تو امامؑ نے بھیڑ بکریوں کے ایک ریوڑ کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ اے سدیر! خدا کی قسم اگر میرے شیعوں کی تعداد ان بکریوں کی تعداد کے برابر بھی ہوتی تو میرے لئے قیام نہ کرنے کی گنجائش نہ ہوتی۔[۲]

اس صریح بیان سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ امامؑ کو یقین تھا کہ صرف حکومت کا حصول کافی نہیں اور حقیقی اسلامی انقلاب یا اصلاحی تحریک کا خواب اس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک اسلامی حکومت کی پشت پناہی کے لئے ایسی بیدار عوامی طاقت موجود نہ ہو جو اس حکومت کے اہداف سے آگاہ ہو، اس کے نظریۂ حکومت پر ایمان رکھتی ہو، اس کی حمایت نیز اس کی پالیسیوں

کی وضاحت کے لئے آمادۂ عمل ہو اور زمانے کے آگے سینہ سپر ہونے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر فوری طور پر ایک ایسی منصوبہ بندی کی ضرورت تھی جس کے مندرجہ ذیل دو اہداف ہوں۔

پہلا ہدف

مذکورہ عوامی قوت کی تیاری، تربیت، سرپرستی اور انحرافات کا مقابلہ کرنے کے لئے اس کو معینہ لائحہ عمل دینا۔ نیز اسے ایک ایسی منظم جماعت کی شکل دینا جس کے اپنے خاص تنظیمی اسالیب ہوں۔

بنابرایں امامؑ اور آپؑ کی تحریک کے لئے حکومت سنبھالنے کی راہ اس وقت ہموار ہو سکتی تھی جب اس ٹھوس عوامی قوت کی تیاری کا کام مکمل ہو۔

دوسرا ہدف

امتِ مسلمہ کے ضمیر اور عزم و ارادے کو بیدار کرنا اور انکی اس قدر سختی و ہوشیاری سے حفاظت کرنا جو امت کو منحرف حکام کے آگے مکمل طور پر اپنے تشخص اور وقار سے دستبردار ہونے سے محفوظ رکھے۔ اس بارے میں ہم آئندہ صفحات میں بحث کریں گے۔

منحرف حکمرانوں کے خلاف براہِ راست مسلحانہ اقدام سے امامؑ کی پہلو تہی سیاسی طریقہ کار میں تبدیلی کی وجہ سے تھی۔ اس قسم کی تبدیلی حالات کے تقاضوں نیز انقلابی و اصلاحی عمل اور اس کے حصول کے مختلف طریقوں کے گہرے ادراک کے نتیجے میں پیش آتی ہے ۳۔

ہم نے سدیر صیرفی اور امام جعفر صادقؑ کی گفتگو میں ملاحظہ کیا کہ امامؑ ہمیشہ مسلحانہ قیام کے لئے تیار رہتے تھے۔ بشرطیکہ آپؑ کو اس سے پہلے اسلامی اہداف کے حصول کے لئے درکار طاقت اور مددگاروں کی اطمینان بخش حمایت حاصل ہو۔ لیکن اس دور کے حالات آپؑ کو حاکموں کی سیاست کے مقابلے میں کھلی کارروائی کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ اس قسم کی کارروائی کے نتیجے میں اگر ناکامی کا یقین نہ تھا تو کامیابی کی بھی کوئی ضمانت نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ امامؑ نے ظالم حکومت کی سرنگونی کے لئے مسلحانہ کارروائی کی تمام تجاویز کو مسترد فرمایا۔ ہم اس مسئلہ پر آئندہ سطور میں تفصیلی اظہارِ خیال کریں گے۔

خلاصہ کلام یہ کہ امامؑ نے براہِ راست سیاسی معرکہ آرائی سے کنارہ کش رہنے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ پہلے امت کی داخلی اصلاح کا کام انجام دیں اور ایک ایسی بیدار عوامی قوت وجود میں لائیں جو آپؑ کے افکار و نظریات کی ترویج کا وسیلہ بنے۔

آپؑ ایک فکری طاقت اور باایمان ہراول دستے کو وجود میں لانا چاہتے تھے جو زمین پر قانونِ الٰہی کو نافذ کرے یا کم از کم امت کے درمیان اسلامی حکومت کی نظریاتی بنیادوں کو مستحکم رکھ سکے۔

امامؑ کو اس بات کی زیادہ فکر نہ تھی کہ آپؑ کی ان کوششوں کا نتیجہ آپؑ کی زندگی میں حاصل ہوتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ آپؑ سے پہلے آپؑ کے آباء طاہرین بھی اسی پیمانے پر کام کرتے رہے تھے اور امت کو یہ خوشخبری دیتے رہے تھے کہ ان کی حکومت ایک نہ ایک دن ضرور آئے گی۔ بشرطیکہ اس کی نظریاتی بنیادیں امت کے اندر موجود ہوں۔

تعمیرِ امت کے لئے اپنی منصوبہ بندی میں امامؑ کو درجِ ذیل دو بنیادی مشکلات کا سامنا تھا، جن کی اہمیت کو آپؑ نے مدِّ نظر رکھنا تھا۔

☆ پہلی مشکل ابتر سیاسی حالات اور زوال کی طرف رواں دواں ناگفتہ بہ اجتماعی و اخلاقی صورتِ حال تھی، جس سے اسلام کی بنیادوں اور تعلیمات کو شدید خطرہ لاحق تھا۔ چنانچہ فکری و نظریاتی تحریکوں کی صورت میں ہر قسم کے تباہ کن عناصر کی سرگرمیاں تیز تر ہوگئی تھیں۔ مثال کے طور پر زندیقوں کی تحریک کو لے لیجئے۔ عباسیوں نے زندیقوں کو اپنے گرد جمع کیا اور طویل عرصے تک اپنے ساتھ رکھا۔۴۔ اس کے علاوہ دیگر الحادی نظریات (مثلاً مانوی، مزدکی، خرمی اور زردشتی افکار) کو پروان چڑھنے کا موقع دیا گیا۔۵۔

☆ شدید نگرانی نیز آپؑ کے اصحاب اور آپؑ کی تحریک سے وابستہ افراد کے خلاف دہشت گردی، ظلم و ستم اور ان کو اپنے دیار سے نکال باہر کرنے کی کارروائیاں۔ چنانچہ ابوالفرج اصفہانی نے ایک پوری کتاب لکھی ہے جس میں ان لوگوں پر ہونے والی ناقابلِ بیان سختیوں اور مظالم کا تذکرہ کیا ہے۔۶۔ ان مظالم کا مقصد امامؑ کے اصحاب کو پراکندہ کرنا اور آپؑ کی تحریک پر قابو پانا تھا۔

مخالفین کی ان کوششوں کا ثمر شیعوں کے درمیان اختلافات کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یوں امام صادقؑ کے لئے شیعوں کی صفوں میں اتحاد برقرار کرنے اور ان کے درمیان پیدا شدہ مذہبی اختلافات کو مٹانے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ کیونکہ ایک طرف تو ان کے ساتھ رابطہ برقرار کرنا مشکل تھا اور دوسری

جانب سے حکومت شیعوں پر تشدد کرنے اور ان کو سخت ترین سزائیں دینے میں حد سے گزر رہی تھی۔۷۔

تحریک کی کامیابی کے اسباب

امامؑ کی عملی روش پر بحث کرنے سے پہلے ہم اس وقت کے حالات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے آپؑ کی تحریک کی کامیابی کے اسباب سے آشنا ہونا چاہتے ہیں۔ آپؑ کی تحریک منصوبہ بندی اور حکمتِ عملی کے لحاظ سے درجِ ذیل دو حقیقتوں پر استوار تھی۔

(الف) عوام کے درمیان اپنے حامی حلقوں کو وجود میں لانا۔ ان کی اندرونی ساخت کو مضبوط بنانا۔ نیز اپنے اور اپنے شیعوں کے درمیان خصوصی رابطے کی حد تک ان کی نظارت کرنا۔ تاکہ ان کو ایسی مرکزی قوت کی حیثیت دی جاسکے جن کے ذریعے امت کی مختلف صفوں تک رسائی حاصل ہو، لوگوں سے گہرا رابطہ برقرار ہو اور عوام کے فکری و عملی ذرائع پر اثر انداز ہوں۔ تاکہ اس عظیم تر ہدف تک پہنچا جاسکے جس کے لئے آپؑ تگ و دو فرمارہے تھے۔۸۔

(ب) اپنی تحریک کے لئے امت کا اعتماد حاصل کرنا۔ کیونکہ کوئی بھی تحریک اگر عوامی امنگوں اور مقاصد کی ترجمانی نہ کرے تو لازمی طور پر ناکامی سے ہمکنار ہوتی ہے۔ دوسری طرف کوئی تحریک خواہ اس کے اہداف کتنے ہی بلند کیوں نہ ہوں اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک اسے عوام کی پشت پناہی حاصل نہ ہو۔ اسی لئے عباسیوں کی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی کیونکہ انہوں نے میکاویلی طرز کی سیاست اپناتے ہوئے "الرضا من اھل البیت" کے

نعرے کا سہارا لیا تھا۔۹۔

بنابرایں امامؑ کی تحریک کے لئے خاطر خواہ حمایت حاصل کرنے، اس تحریک کو دشمن کے چنگل سے دور رکھنے اور اسے عباسی حکومت کے مفادات کی بھینٹ چڑھنے سے محفوظ رکھنے کے لئے عوامی حلقوں کی تشکیل اور امت کے اعتماد کے حصول کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ ان دونوں حقیقتوں کے پیشِ نظر امامؑ نے دو قسم کے عملی طریقے اپنائے۔

پہلا طریقہ - تحریکی عمل

اس سے ہماری مراد ظاہری سطح پر عوامی قوتوں کے ساتھ باہمی روابط کا عمل ہے۔ یہ عمل دو باتوں پر مبنی تھا۔

(الف) امت کے جذبات کا رخ اہلِ بیتؑ کے منصوبوں کی طرف پھیرنا۔

(ب) امت کو روحانی اور فکری قوتوں سے مسلح کرنے کی کوشش کرنا۔ تاکہ امت بیداری و آگاہی کے ساتھ اسلامی اہداف کے حصول کے لئے آگے بڑھے۔

دوسرا طریقہ - بنیادی عمل

یہ اقدامات آپؑ کے وفادار اور ایسے قریبی عوامی حلقوں کے حوالہ سے تھے جو دین و دنیا کے امور سے آگاہ اور اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے والے تھے نیز نظارت، منظم سرگرمیوں اور عملی کاموں میں آپؑ کے ساتھ مربوط تھے۔

ان باتوں کے پیشِ نظر امامؑ کے ان فرمودات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جن کا مقصد اس خاص گروہ کو (جس کی آپؑ سرپرستی فرما رہے تھے) اسالیبِ عمل سے

روشناس کرنا تھا۔ یہ اسالیب شیعوں پر گزرنے والے مختلف حالات اور خارجی حقائق کے تحت پیش آنے والی سیاسی صورتِ حال کے تناسب سے ادلتے بدلتے رہتے تھے۔۱۰؎ بنا برایں عوام کی سطح پر امامؑ کی تحریکی سرگرمیوں کو آپؑ کی ان بنیادی سرگرمیوں سے جدا نہیں کیا جاسکتا جنہیں آپؑ نے اپنے وفادار طبقے کے درمیان انجام دیا۔

امام جعفر صادقؑ کے منصوبوں کا جائزہ

امامؑ نے اپنے اصلاحی عمل کو عملی جامہ پہنانے کے لئے (مذکورہ) دو طریقے اختیار کئے۔ ایک تحریکی اقدامات یعنی ایسے اقدامات جو اعلانیہ اور ظاہری نوعیت کے ہوتے تھے اور دوسرے بنیادی اقدامات جن کی نوعیت (تقیہ کے اصول کے مطابق) خفیہ تھی۔

تحریکی اقدامات

یہ اقدامات امامؑ کے وفادار حلقوں کے ساتھ باہمی تعاون اور روابط پر مشتمل تھے۔ امامؑ کی تحریکی سرگرمیوں کی خاص بات یہ تھی کہ وہ اعلانیہ طور پر انجام پاتی تھیں۔ کیونکہ اموی حکومت کے زوال اور انتقالِ اقتدار کے وقفے میں امامؑ حکام کی گرفت اور شدید نگرانی سے بچے ہوئے تھے۔ اسی طرح لوگوں کو بھی علماء و فقہاء کی طرف رجوع کرنے میں آزادی نصیب ہوئی تھی۔ اور یوں امت کو ان کے ذریعے شریعتِ محمدیؐ کو سیکھنے اور اس کی روشنی میں اپنی انفرادی و اجتماعی مشکلات کو حل کرنے کے لئے کھلی فضا نصیب ہوئی تھی۔ ان اسباب و عوامل کے باعث امامؑ کو اپنی سرگرمیاں کھل کر انجام دینے کا موقع ملا۔

لیکن آپؑ نے اپنی سرگرمیوں کو اعلانیہ سیاسی عمل سے جدا رکھا۔ آپؑ نے امت کی صفوں میں اپنی تحریک کی داغ بیل عظیم علمی جدوجہد اور بلند پایہ فکری مدرسے کے ذریعہ ڈالی۔ آپؑ کے مدرسے سے بڑے بڑے فقہاء و مفکرین فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ اس طرح امامؑ اپنے بعد امت کے لئے اپنے نظریاتی شاگردوں (مثلاً ہشام ابنِ حکم، مومنِ طاق، محمد ابنِ مسلم اور زرارہ ابنِ اعین وغیرہ) کی صورت میں ایک عظیم علمی سرمایہ چھوڑ گئے۔ چنانچہ آپؑ کی علمی و تہذیبی تحریک کو زبردست وسعت ملی اور تمام مسلمان علاقوں پر چھا گئی۔ ۱۱۔ لوگوں نے آپؑ سے کثیر مقدار میں علوم نقل کئے اور ان کو ہر جگہ پہنچایا اور اس طرح آپؑ کی شہرت تمام خطوں میں پھیل گئی۔ ۱۲۔

جاحظ امامؑ کے بارے میں کہتا ہے۔

"امام صادقؑ نے دنیا میں علم و حکمت کے چشمے بہا دیئے۔ لوگوں کے لئے علوم کے ایسے دروازے کھولے جن سے اس سے قبل وہ واقف بھی نہ تھے۔ آپؑ نے دنیا کو اپنے علم سے لبریز کر دیا"۔ ۱۳۔

اپنی اعلانیہ پالیسی اور کھلم کھلا علمی و فکری سرگرمیوں کے پسِ پردہ امامؑ کا ہدف اسلامی نظریات اور نظام کے بارے میں لوگوں کی جہالت کو دور کرنا، الحادی نظریات کا مقابلہ کرنا، ان کے گمراہ کن اعتراضات کا جواب دینا اور انحراف کے نتیجے میں پیدا شدہ مشکلات کو حل کرنا تھا۔ اپنی اعلانیہ تحریکی جدوجہد میں امامؑ نے درجِ ذیل دو اسلوب اپنائے۔

(ا) اعلانیہ ٹکراؤ کا اسلوب

اس کا عملی اظہار اس وقت ہوا جب آپؑ مفاد پرستوں کی طرف سے سیاسی

اغراض کے تحت امت کی حقیقی اسلامی روح کو نابود کرنے کے لئے دینی عقائد و نظریات پر ہونے والے خود ساختہ اشکالات و اعتراضات کا مقابلہ کرنے کے لئے سختی سے ڈٹ گئے۔ غلط نظریات کو تباہ کرنے کی پالیسی کے تحت آپؑ نے درجِ ذیل اقدامات کئے۔

آپؑ نے اموی اور عباسی دور میں جنم لینے والے باطل نظریات کی جدید لہروں نیز قومی، مذہبی اور قبائلی جھگڑوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کام کیا۔ یہ خرابیاں یونانی، فارسی اور ہندی کتب کے ترجموں کی صورت میں اجنبی نظریات کی آمد کے ساتھ پیدا ہوئیں۔ نتیجہ کے طور پر اسلام کے مقابلے میں خطرناک جماعتوں کے ظہور کے لئے فضا سازگار ہوگئی۔ جن میں سے کچھ غالیوں کی جماعت، زندیقوں کی جماعت، جعلی احادیث گھڑنے والے، اہل الرائے اور اہلِ تصوف وغیرہ ہیں۔

امام صادقؑ نے ان کا مقابلہ کیا اور علمی میدان میں سب کو پچھاڑا اور ان کے خطرات کو امت کے سامنے برملا کیا۔ ۱۴

(۲) تعمیری اسلوب

یہ اسلوب اسلامی نظریات کو پھیلانے اور اس کے اصول و احکام کی ترویج کے لئے کی جانے والی مسلسل علمی و فکری جدوجہد کی صورت میں سامنے آیا۔ اس حوالے سے امامؑ کی کارکردگی کا خلاصہ یہ ہے۔

☆ امامؑ نے اسلامی عقائد کے مفاہیم اور شریعت کے احکام کی خوب ترویج کی۔ علمی شعور پیدا کیا اور علماء کی کثیر تعداد کو تربیت دے کر تیار

کیا تاکہ وہ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے کام کریں۔ آپؑ نے اپنے دور کے سب سے بڑے علمی اداروں میں سے ایک کا آغاز کیا۔ اور دارِ ہجرت اور مقامِ نزولِ وحی مدینہ منورہ کو اپنا علمی مرکز قرار دیا۔

آپؑ نے مسجدِ نبویؐ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا جس میں آپؑ تمام علوم و فنون پر سیر حاصل بحث کرتے تھے ۱۵۔ آپؑ کے شاگردوں میں اسلامی مذاہب کے ائمہ بھی شامل ہیں۔ مثلاً مالک بن انس، سفیان ثوری، ابنِ عینیہ، ابو حنیفہ، محمد بن حسن شیبانی، یحییٰ بن سعید اور ان کے علاوہ دیگر فقہاءؒ علماء اور محدثین مثلاً ایوب بجستانی، شعبہ بن حجاج اور عبدالملک بن جریج وغیرہ ۱۶۔

آپؑ کے شاگردوں کی مجموعی تعداد چار ہزار سے زائد تھی ۱۷۔

☆ آپؑ نے فلسفہ، کلام، ریاضی اور کیمیا جیسے علوم میں تخصص (Specialization) کا دروازہ کھولا۔ آپؑ کے شاگرد مفضل بن عمرو، مومنِ طاق، ھشام بن حکم اور ھشام بن سالم علمِ فلسفہ و کلام کے ماہرینِ فن میں سے تھے۔ جابر بن حیان علمِ ریاضی و کیمیا میں۔ زرارہ، محمد بن مسلم، جمیل بن دراج، حمران بن اعین، ابوبصیر اور عبداللہ بن سنان وغیرہ فقہ، اصول اور تفسیر کے ماہرین میں سے تھے ۱۸۔

☆ آپؑ نے علمِ اصول اور علمِ فقہ کے بنیادی قواعد وضع کئے تاکہ اپنے شاگردوں میں استنباط و اجتہاد کا ملکہ پیدا کریں۔ علمِ اصول میں آپؑ نے "برائت" "تخییر" اور "استصحاب" جیسے قاعدوں سے متعارف کرایا۔ فقہی میدان میں قائدۂ فراغ، قائدۂ تجاوز، قائدۂ ید اور قائدۂ ضمان جیسے قاعدوں کی نشاندہی کی ۱۹۔

اس کام کے پسِ پردہ امامؑ کے تین مقاصد تھے۔

(الف) شریعتِ اسلامی کے لئے ایک مضبوط بنیاد اور اسلامی نظریات و عقائد کے لئے محکم منبع و ماخذ فراہم کرنا۔ نیز مختلف باطل نظریات کے مقابلے میں اسلام کی بقاء کی ضمانت فراہم کرنا۔

(ب) غلط نظریات اور جعلی احادیث کی اصلاح۔

(ج) علمی و فقہی لحاظ سے قیادت کے تصور کو واضح اور اس کی وضاحت کرنا۔ نیز اس زاویے سے اپنی امامت کو یوں منوانا کہ دیگر اسلامی مذاہب کے علماء کو اس کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہ رہے۔ چنانچہ ابو حنیفہ نے ان الفاظ میں اعتراف کیا کہ۔

"میں نے کسی کو جعفر بن محمد سے زیادہ عالم و فقیہ نہ پایا، جب منصور نے آپؑ کو مدینہ سے بلوایا تو میرے پاس کسی کو بھیجا اور کہا : اے ابو حنیفہ لوگ جعفر بن محمدؑ کے گرویدہ ہو رہے ہیں۔ اس سے پوچھنے کے لئے مشکل سوالات جمع کرو۔ پس میں نے چالیس سوالات تیار کئے۔ پھر منصور نے مجھے بلایا تو میں اس کے پاس گیا۔ اس وقت جعفر بن محمدؑ اس کے دائیں طرف بیٹھے تھے۔ جب آپؑ پر میری نظر پڑی تو میرے اوپر ابو جعفر منصور سے زیادہ جعفرؑ کی ہیبت طاری ہو گئی۔ پس میں نے سلام کیا اور منصور کا اشارہ پا کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد منصور نے میری طرف رخ کر کے کہا۔ اے ابو حنیفہ! ابو عبد اللہ (صادقؑ) سے اپنے سوالات پوچھ۔ پس میں آپؑ سے سوال کرتا گیا اور آپؑ جواب دیتے رہے، آپ اس طرح فرماتے تھے۔ "تم لوگ اس مسئلے میں یہ کہتے ہو، اہلِ

مدینہ کا نظریہ یہ ہے اور ہمارا نقطہ نظر یوں ہے۔" پس آپؑ کا فتویٰ کبھی ہمارے موافق ہوتا۔ کبھی اہلِ مدینہ کے اور کبھی سب کے مخالف۔ یوں میں نے چالیس سوال کرڈالے اور آپؑ نے کسی ایک کا جواب بھی ادھورا نہ چھوڑا۔

پھر ابو حنیفہ نے کہا "لوگوں میں سب سے زیادہ عالم وہ شخص ہے جو لوگوں کے مختلف نظریات سے بیشتر آگاہی رکھتا ہو"۔۲۰۔

واضح ہے کہ امام صادقؑ کی علمی جدوجہد اور مذکورہ پیمانے پر آپؑ کی علمی شہرت نہ ہوتی تو آپؑ کی امامت کے بارے میں یہ اعتراف کبھی نہ ہوتا۔۲۱۔

امام صادقؑ اپنے دونوں اسالیب (تباہ کن اور تعمیری) کے ذریعے اپنی جامع اسلامی تحریک کے استحکام کے لئے مناسب فضا پیدا کرکے اسے عمل کے اگلے مراحل تک پہنچنے کے قابل بنا رہے تھے۔ جن میں اسالیب اور شکل کے لحاظ سے تغیرو تبدل کا امکان تھا۔

امامؑ کی تعمیری سرگرمیوں میں اپنی نگرانی میں اپنے وفادار گروہ کے اندر انقلابی و اصلاحی تغیرو تبدل لانا بھی شامل تھا۔ اور یہ بھی کہ منظم و مربوط جدوجہد کے لئے ان کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

اس گروہ کے ساتھ آپؑ کے روابط خفیہ نوعیت کے تھے جنہیں فقہی اصطلاح میں "تقیہ" کہتے ہیں۔

خفیہ سرگرمیوں (تقیہ) کے ذریعے امامؑ دشمنوں کی مخالفت سے اپنی تحریک کو اس وقت تک بچانا چاہتے تھے جب تک کہ اس مرحلے کی بنیادی ضروریات پوری نہ ہوجائیں۔ ساتھ ساتھ آپؑ اس تحریک کی کارکردگی میں مضبوطی اور

فعالیت میں لچک پیدا کرنا چاہتے تھے۔ امامؑ کی نظر میں تقیہ خفیہ طریقے سے جدوجہد جاری رکھنے کا دوسرا نام تھا۔

تعمیری عمل کے مرحلے میں امامؑ نے (اپنے سے وابستہ جماعت ہونے کی بناء پر) شیعوں کی براہِ راست نگرانی، ان کے لئے منصوبہ بندی، ان کی حمایت و حفاظت، ان کے شعور میں اضافے غرض ہر طریقے سے ان کی مدد کو (جو اسلامی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق ان کو ترقی دے) سب سے مقدم رکھا۔۲۲۔

امامؑ کے تعمیری اقدامات درجِ ذیل تنظیمی اسالیب کی صورت میں ظہور پذیر ہوئے۔

★ شیعوں کی براہِ راست سرپرستی، ان کی رہنمائی و حمایت، انکے فکری شعور میں اضافے اور ان کو اسلامی تقاضوں کے مطابق پروان چڑھا کر ایک نظریاتی فوج اور بیدار و آگاہ ہراول دستے کی تشکیل کے لئے منصوبہ بندی۔

آپؑ کی سرپرستی میں شیعوں کے درمیان موجود ذاتی نوعیت کے اختلافات کو حل کرنے اور ان کے واسطے مادی وسائل فراہم کرنے کے لئے مختلف طریقے اور اسالیب وضع کئے جاتے تھے۔ چنانچہ معلیٰ بن خنیس نے ذکر کیا ہے کہ۔

"امامؑ اپنے طرفداروں کے درمیان احکامِ خدا کو نافذ کرتے تھے۔ ان سے مالی واجبات حاصل کرتے اور مختلف امور میں خرچ فرماتے تھے۔"

چنانچہ منصور نے کئی مرتبہ آپؑ کو اس سلسلہ میں متنبہ کیا۔۲۳۔

اس کے علاوہ امامؑ اپنے شیعوں کو ظالم حکومت کی طرف رجوع نہ کرنے، اس کا بائیکاٹ کرنے اور اس سے معاملہ نہ کرنے کا حکم دیتے تھے۔

امام صادقؑ خود اس بارے میں فرماتے ہیں۔

"خبردار ایک دوسرے کے خلاف (معاملات میں) حکامِ جور کی طرف رجوع نہ کرنا۔ جو مومن کسی دوسرے مومن کو باہمی نزاع میں کسی ظالم قاضی یا حاکم کے پاس لے جائے اور وہ خلافِ حکمِ خدا فیصلہ دے تو بتحقیق وہ (مومن) اس جرم اور گناہ میں شریک ہو گا۔"

آپؑ فرماتے ہیں۔

"جس شخص کا اپنے کسی بھائی کے ساتھ کسی حق پر جھگڑا ہو اور وہ اس کو تم میں سے ہی کسی برادرِ ایمانی کے پاس فیصلے کے لئے چلنے کا مشورہ دے لیکن دوسرا انکار کرے اور نزاع کو ان لوگوں (ظالموں) کے پاس لے جانے پر مصر ہو۔ تو ایسا شخص ان لوگوں کی مانند ہو گا جن کے بارے میں ارشادِ باری ہے "الم تر الی الذین یزعمون انہم امنوا بما انزل الیک وما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت و قد امروا ان یکفروا بہ" یعنی "کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کا خیال یہ ہے کہ وہ آپؑ پر اور آپکے پہلے نازل ہونے والی چیزوں پر ایمان لے آئے ہیں اور پھر یہ چاہتے ہیں کہ سرکش لوگوں کے پاس فیصلہ کرائیں جب کہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ طاغوت کا انکار کریں۔" (سورہ نساء ۴۔ آیت ۶۰)۔ ۲۴

امامؑ اپنے وفاداروں کو ظالم و منحرف حکومت سے قطع روابط کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"مسجد کی تعمیر میں بھی ان کی اعانت نہ کرو"۔ ۲۵۔

ظالم حکومت کے بائیکاٹ اور اس سے گریز کے ان احکام کے ساتھ ساتھ امامؑ اپنے حامیوں سے یہ بھی فرماتے تھے کہ۔

"خبردار قضاوت سے پرہیز کرنا کیونکہ بتحقیق قضاوت کا حق پیغمبر یا وصیٔ پیغمبر کی مانند امرِ قضاوت سے آگاہ اور مسلمانوں کے ساتھ انصاف برتنے والے رہبر کا ہے۔"

اس طرح امامؑ اپنا حقِ حکومت جتاتے اور حالات کے بارے میں اپنے نقطہء نظر کی وضاحت فرماتے ہیں۔ اس موقف کے نتیجہ میں امامؑ کو اپنے اصحاب کو حالات کا اسیر ہونے سے بچانے میں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ آپؑ نے ان کو نفسیاتی طور پر حالات کے مقابلے میں ڈٹ جانے کے لئے آمادہ کرر کھا تھا۔ پس ان کے حوالے سے یہ ایک تعمیری پالیسی تھی لیکن حکومت کے حوالے سے مخاصمانہ اور ٹکراؤ پر مبنی رویّہ ۲۶۔

زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے حامیوں کی سرپرستی کرتے ہوئے آپؑ نے ان کے لئے قاضی مقرر کئے۔ اور حکم دیا کہ ان کی طرف رجوع کریں اور انکے فیصلوں کو تسلیم کریں۔ آپؑ نے فرمایا۔

"اپنے درمیان ایسا آدمی ڈھونڈو جو ہمارے احکام کو جانتا ہو اور اسی کو اپنے لئے قاضی قرار دو۔ بے شک میں اسے تمہارے اوپر قاضی قرار دیتا ہوں پس اپنے فیصلوں کے لئے اسی کی طرف رجوع کرو" ۲۷۔

امامؑ اپنے ساتھیوں اور حامیوں کو مخالف قوتوں کی نظروں سے بچنے کے لئے ہوشیار و محتاط رہنے اور اپنے امور خفیہ طریقے سے انجام دینے (یعنی تقیہ کرنے) کی تلقین کرتے تھے۔ فرمایا۔

"ہمارے لئے خاموش داعی اور مبلغ بن جاؤ"۔ ۲۸۔

معلیٰ بن خنیس کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

"اے معلیٰ ہمارے امر کو چھپاؤ اور اس کا بَرملا اظہار نہ کرو"۔ ۲۹۔

عبداللہ بن جندب سے فرمایا۔

"خدا کی رحمت ہو ان لوگوں پر جو روشنی کے چراغ تھے۔ وہ لوگوں کو صالح اعمال اور اپنی جدوجہد کے ذریعے ہماری طرف دعوت دیتے تھے اور بعض لوگوں کی طرح ہمارے اسرار فاش نہ کرتے تھے"۔ ۳۰۔

تحف العقول نامی کتاب میں "محمد بن نعمان احول" کے نام آپؑ کی ایک نصیحت منقول ہے جس میں آپؑ نے اسے خفیہ طریقے پر کام کرنے اور تقیہ کا دامن نہ چھوڑنے کی تلقین فرمائی ہے۔

اگر امامؑ کے بعض اصحاب آپؑ کے اسرار فاش نہ کرتے تو قریب تھا کہ حکومت آپؑ کے ہاتھ آجاتی۔ اس سلسلے میں فرمایا۔

"ہمارے اسرار کو فاش کرنے والا ہمارے خلاف تلوار سونت کر نکلنے والے کی مانند ہے۔ اس بندے پر خدا کی رحمت ہو جس نے ہمارے پوشیدہ علوم کو سنا اور انہیں اپنے قدموں کے نیچے دفن کیا (یعنی پوشیدہ رکھا)۔

اے فرزندِ نعمان! جب میں تم میں سے کسی کے ساتھ کوئی بات کرتا ہوں تو وہ اسے آگے پہنچا دیتا ہے۔ یوں وہ لعنت اور برائت کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

بتحقیق میرے والد فرمایا کرتے تھے کہ اور کون سی چیز تقیہ سے زیادہ

سخت ہے؟

تقیہ مومن کی ڈھال ہے اگر تقیہ نہ ہوتا تو خدا کی اطاعت نہ ہوتی۔

اے فرزندِ نعمان! ہمارے اسرار کو فاش کرنے والا اپنی تلوار سے ہمیں قتل کرنے والے کی طرح ہی نہیں بلکہ اس سے بھی سخت تر گناہگار ہے۔ اس کا گناہ سخت تر ہے۔ اس کا گناہ سخت تر ہے۔

اے فرزندِ نعمان! تم لوگ جلد بازی سے بچتے رہو۔ خدا کی قسم تین بار یہ امر (حکومت) ہمارے ہاتھ آتے آتے رہ گیا کیونکہ تم لوگ راز فاش کرتے رہے۔ یوں خدا نے اسے موخر کردیا۔ خدا کی قسم تمہارے پاس کوئی ایسا راز نہیں جسے تمہارے دشمن تم سے زیادہ نہ جانتے ہوں۔

اے فرزندِ نعمان! انسان اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ تین ہستیوں کے احکام کا پابند نہ ہو یعنی اولاً حکمِ خدا، ثانیاً حکمِ رسولؐ اور ثالثاً حکمِ امامؑ کا۔ ان میں سے حکمِ خدا یہ ہے کہ وہ اسرار کی سختی سے حفاظت کرے۔ ۳۱۔

اہلِ بیتؑ کے تمام افراد نے اس طرزِ عمل کو جاری رکھا اور باوجودیکہ حکومت کو شیعی تحریک کے وجود کا علم تھا۔ لیکن اس کے حدود اور اس کی صحیح اہمیت سے آگاہی نہ تھی۔ اسی بناء پر امامؑ اور آپؑ کے آباء طاہرین کو حکومت کی جانب سے مزاحمت، پابندیوں اور سختیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ منصور نے متعدد بار امامؑ کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن امامؑ اپنی خداداد عقل و حکمت اور حسنِ تدبیر کے باعث اس کے شر سے نجات پاتے رہے۔ ۳۲۔

★ مخلص انقلابی تحریکوں کی حمایت تاکہ امتِ مسلمہ کے سوئے ہوئے

عزم و ارادے اور ضمیر کو دوبارہ جگایا جائے۔ اس کی حفاظت کی جائے اور اس میں اس قدر مضبوطی پیدا کی جائے جو امت کو منحرف حکمرانوں کے مقابلے میں اپنے تشخص اور وقار سے مکمل طور پر دست بردار ہونے سے بچائے رکھے۔

یہ انقلابی کام علویوں نے انجام دیا۔ وہ اپنی قربانیوں کے ذریعے مسلمانوں کے عزم و ارادے اور ضمیر کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ ائمہؑ بھی ان میں سے مخلص افراد کی مدد فرماتے تھے۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ امام جعفر صادقؑ کے پاس آلِ محمدؐ کے کسی فرد کے خروج کا تذکرہ ہوا۔ یہ سن کر آپؑ نے فرمایا۔

"جب تک آلِ محمدؐ کے افراد قیام کرتے رہیں گے میں اور میرے شیعہ بدی کا منہ نہ دیکھیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آلِ محمدؐ میں سے کوئی خروج کرے اور اس کے عیال کا خرچہ میرے ذمہ ہو"۔ ۳۳۔

امام علی بن موسیٰ الرضاؑ نے مامون الرشید سے گفتگو کرتے ہوئے امام زین العابدینؑ کے فرزند زید شہیدؒ کے بارے میں فرمایا کہ۔

"وہ آلِ محمدؐ کے علماء میں سے تھے۔ وہ خدا کی خوشنودی کے لئے (دشمنانِ خدا سے) ناراض تھے۔ انہوں نے دشمنانِ خدا کے ساتھ جہاد کیا اور اسی راہ میں شہید ہوئے۔ بتحقیق مجھے میرے پدر موسیٰ ابنِ جعفرؑ نے بتایا کہ انہوں نے اپنے پدر جعفر بن محمدؑ کو یہ کہتے سنا خدا میرے چچا زید پر رحم کرے۔ انہوں نے لوگوں کو آلِ محمدؐ کے صاحبِ حق کی طرف دعوت دی۔ اگر وہ کامیاب ہوجاتے تو خدا کے ساتھ اپنا وعدہ پورا

کرتے۔ وہ کہتے تھے میں تمہیں الرضا من آلِ محمدؐ (یعنی آلِ محمدؑ کی سب سے افضل اور صاحبِ حق ہستی) کی طرف دعوت دیتا ہوں"۔ ۳۴۔

امام جعفر صادقؑ لوگوں کو اموی اقتدار کے خلاف بغاوت میں حضرت زیدؒ کا ساتھ دینے کی ترغیب دیتے تھے۔ جب آپؑ کو حضرت زید کی شہادت کی خبر ملی تو آپؑ کو شدید دکھ ہوا اور زبردست حزن و اندوہ میں مبتلا ہوئے۔ یہاں تک کہ آثارِ حزن آپؑ سے ظاہر ہوئے اور آپؑ نے زید کی ہمراہی میں جنگ کے دوران قتل ہونے والے افراد کے اہل و عیال میں ہزار دینار تقسیم کئے۔ ۳۵

جب اولادِ حسن کی تحریک ناکام ہوئی تو امامؑ کو اس کا شدید رنج ہوا اور آپؑ روئے۔ نیز آپؑ نے لوگوں کو ان کے بارے میں کوتاہی کا ذمہ دار قرار دیا۔

ابنِ عمر کندی کہتا ہے کہ۔

"میں ابو عبداللہ (امام جعفر صادقؑ) کی خدمت میں حاضر ہوا۔

آپؑ نے پوچھا کیا تمہیں آلِ حسن کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟

(کندی کہتا ہے) ہمیں ان کے بارے میں خبر مل چکی تھی لیکن ہم امامؑ کی خدمت میں یہ خبر سنانے میں پہل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے ہم نے عرض کیا۔ ہم خدا سے ان کی عافیت کی امید رکھتے ہیں۔ یہ سن کر آپؑ نے فرمایا۔ ان کو عافیت کہاں نصیب؟ پھر آپؑ اتنا روئے کہ آپؑ کی آواز بلند ہونے لگی اور ہم بھی روئے"۔ ۳۶۔

خلاصہ یہ کہ مذکورہ تحریکوں کے ذمہ دار افراد کے بارے میں آپؑ کی تعریف و تمجید اور ان پر یوں محزون ہونا یا رونا فقط اس صورت میں شیعہ نظریہ کے موافق ہوسکتا ہے جب یہ ائمہؑ کی سرگرمیوں کا حصہ ہوں اور ان اقدامات کا ائمہؑ کے

ساتھ کسی نہ کسی صورت میں ربط رہا ہو۔ جیسا کہ زید شہید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا مقصد آلِ محمد کے امامِ برحق کی طرف لوگوں کو دعوت دینا تھا۔

اگر یہ حضرات ائمہ معصومینؑ کے مقابلے میں لوگوں کو اپنی طرف دعوت دے رہے ہوتے تو ان کی تعریف اور ان پر رونے کا عمل صحیح نہ ہوتا۔ نیز اس صورت میں ان حضرات کے اور بنی امیہ و بنی عباس جیسے غاصبانِ خلافت کے درمیان کوئی فرق نہ ہوتا ۔۳

مسلحانہ اقدام سے امامؑ کا انکار

اس سے قبل ہم ایک اہم موضوع پر بحث کر چکے ہیں اور وہ یہ تھا کہ امامؑ کو مکمل اور حقیقی فتح تب ہی حاصل ہوتی جب آپؑ ایک ایسی جماعت کی سطح پر اصلاحی اور انقلابی عمل میں کامیاب ہوجاتے جو آپؑ کی بے عیب اور معصوم قیادت سے مربوط ہوتی۔ نیز یہ جماعت آپؑ اور آپؑ کے نظریہ حکومت پر ایمان رکھتی۔ اس کے علاوہ ہم نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا کہ بزورِ اسلحہ اقتدار پر قبضہ کرنے کا نظریہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس کا نتیجہ اگر قطعی ناکامی نہ بھی ہوتا تو کم از کم غیر یقینی ضرور تھا۔ اسی لئے امامؑ نے اس قسم کے عسکری مقابلے میں فریق بن کر سامنے آنے سے انکار فرمایا۔

اس حقیقت کی روشنی میں اس بات کو سمجھنا آسان ہے کہ امامؑ نے کیونکر مسلحانہ قیام اور سیاسی سودے بازیوں کی تجاویز کو مسترد فرمایا جن کا مقصد آپؑ کی جدوجہد کو کنٹرول کرنا اور دوسری طرف (میکاویلی سیاست کے تحت) اس سے غلط استفادہ کرنا تھا۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو کم از کم امامؑ کی تحریک کو عملی مرحلے میں

آپؑ کے ان منصوبوں سے دور کرنا تھا جن کو آپؑ نے امت کی حالت کے پیشِ نظر ترتیب دیا تھا۔

خلاصہ یہ کہ اصلاحی و انقلابی عمل میں ائمہؑ کے اسالیبِ کار کی بنیاد جلد بازی، جذباتیت اور اندھا دھند اقدامات پر مبنی نہ تھی۔ بلکہ ائمہؑ کی تمام تر اصلاحی پالیسیاں واضح علمی اصولوں اور بنیادوں پر استوار تھیں۔

امامؑ کے لئے میسّر محدود وسائل نیز عام فکری و سیاسی صورتِ حال نے آپؑ کو مسلح تصادم یا سیاسی سودے بازی (جس کا مقصد آپؑ کی جدوجہد کو اندر سے کنٹرول کرنا اور آپؑ کی تحریک کو جب چاہیں ناکام بنانا تھا، خاص کر ان حالات میں جب کہ آپؑ کی تحریک ابتدائی مراحل میں تھی) کے لئے دی جانے والی تجاویز کو مسترد کرنے پر مجبور کردیا۔

عباسیوں کی تحریک بنی امیہ کے نظامِ حکومت کو ختم کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہوتی اگر وہ "الرضا من آل البیت" (یعنی اہلِ بیتؑ کی بہترین پسندیدہ اور صاحبِ حق ہستی) کے نام کا نعرہ بلند نہ کرتی۔ یا اہلِ بیتؑ کے لئے لوگوں کے دلوں میں موجود جذبات سے کام نہ لیتے اور میکاویلی سیاست کے مطابق اہلِ بیتؑ کے وفاداروں کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کرنے کی غرض سے مذکورہ نعرے سے بھرپور استفادہ نہ کرتے۔ کیونکہ ایک طرف تو اہلِ بیتؑ کو اموی سیاست کی مخالف سب سے مضبوط جماعت کی حیثیت حاصل تھی۔ اور دوسری طرف وہ اسلامی عدالت کے اصول پر کاربند تھے[۳۸]۔ وہ غاصب امویوں کی حکومت کو سرے سے تسلیم ہی نہ کرتے تھے۔ اہلِ بیتؑ کے ساتھ اپنے اخلاص کے اظہار اور رابطے کی وجہ سے وہ جذبات کا رخ اپنی طرف پھیرنے میں کامیاب ہوئے[۳۹]۔

اسکے علاوہ عباسی داعیوں نے کوشش کی کہ شیعی اور علوی تحریکوں کو اپنے ساتھ ملالیں۔ انہوں نے اپنے پہلے ہدف کا تو اعلانیہ اظہار کیا جو بنی امیہ کی حکومت کا خاتمہ تھا۔ لیکن دوسرے مقصد یعنی خلافت پر قابض ہونے کے ارادے کو مخفی رکھا۔ اور ہر اس امر سے اجتناب کیا جس سے یہ ظاہر ہو کہ انہوں نے علویوں کی جگہ پر خود قابض ہونے کے لئے قیام کیا ہے۔ بلکہ وہ یہ اعلان کرتے تھے کہ ان کے قیام کا مقصد علوی شہیدوں کے خون کا بدلہ لینا ہے۔[۴۰]

یہاں سب سے پہلے اس بات کی طرف اشارہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عباسی گھرانے نے نہ دعوت و تحریک کی بنیاد رکھی اور نہ ہی اس کے بیج بوئے تھے۔ بلکہ فقط حالات کی بدولت پہلے سے موجود ایک ایسی مضبوط اور خفیہ تحریک کی لگام ان کے ہاتھ آگئی تھی جس کے اپنے وسائل، اپنے داعی اور اپنے پیروکار تھے۔ بالفاظ دیگر بنی عباس نے اپنے چچازاد بھائیوں (علویوں) کی محنت کا پھل کھایا، ان کی پیدا کردہ انقلابی لہروں پر سوار ہوئے اور اس مضبوط لیکن خفیہ تنظیم کی بنیادیں محکم کرنے کے لئے سخت قربانیاں دینے والے قائدین سے پرانے رشتے توڑ لئے۔[۴۱]

عباسیوں نے علوی جذبات کی حقیقت کا ادراک کرلیا تھا۔ اسی لئے انہوں نے اس سے خوب استفادہ کرنے کے لئے ایک مکّارانہ نعرے کا سہارا لیا جس کی بدولت وہ علویوں کی مخالفت سے صاف بچ گئے اور خطرہ بھی ٹل گیا۔ عباسیوں نے "الرضا من آل محمد" کا نعرہ پیش کیا اور اسی کی طرف دعوت دی۔ یہ ایک مبہم اور غیر واضح نعرہ تھا جس سے امامت میں ان کے حق کا عندیہ بھی ملتا تھا۔ علاوہ ازایں یہ ان مشکلات سے بچاؤ کا راستہ بھی تھا جو بنی عباس کے نام پر

دعوت دینے یا تحریک چلانے کی صورت میں پیدا ہو سکتی تھیں۔ انہوں نے اندر سے فیصلہ کر لیا تھا لیکن دل کی بات کو ظاہر ہونے نہیں دیتے تھے۔ اور وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ اگر ایسا کرتے تو آلِ علیؑ و فاطمہؑ کے فضائل کے گرویدہ عام لوگوں کے علاوہ علوی خاندان اور ان کے مخلص داعی ان کے خلاف ایکا کر لیتے۔ ۴۲۔

چنانچہ ابو مسلم خراسانی نے امام جعفر صادقؑ کے نام ایک خط میں لکھا۔

"تحقیق میں نے معاملے کو برملا کیا ہے اور لوگوں کو بنی امیہ کی بجائے اہلِ بیتؑ کی پیروی کی دعوت دی ہے اگر آپؑ آمادہ ہوں تو (قیادت کے لئے) آپؑ سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا"۔ ۴۳۔

اب دیکھئے کہ امامؑ اس کے جواب میں کیا لکھتے ہیں۔

آپؑ نے ابو مسلم خراسانی کو جواب لکھا۔

"نہ تم میرے ہو اور نہ زمانہ میرا ہے"۔ ۴۴۔

اس دو ٹوک جواب کے ذریعے امامؑ ہمیں یہ بتا رہے ہیں کہ مذکورہ پیش کش کو ٹھکرانے کی وجہ ایک طرف تو اس کا حقیقت و صداقت پر مبنی نہ ہونا تھی (جیسا کہ فرمایا تم میرے آدمی نہیں ہو) اور دوسری طرف حصولِ حکومت کے لئے مطلوبہ قوت کے فقدان کا علم تھا (جو آپؑ کے اس جملے سے عیاں ہے "نہ زمانہ میرا ہے")۔

جب بنی عباس کو امامؑ کو منوانے کے حیلوں میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو انہوں نے اسی قسم کے خطوط دیگر علوی شخصیتوں کے پاس روانہ کرنے کا منصوبہ بنایا تاکہ ان کے ساتھ مسئلہ حکومت پر سودے بازی کرکے علوی اثر و نفوذ کے

سہارے عوام کے دل موہ لیں۔ چنانچہ انہوں نے امام زین العابدینؑ کے فرزند عمرالاشرف کے نام خط لکھا۔ لیکن عمرالاشرف نے ان کی دعوت کو ٹھکرایا۔ اس کے بعد بنی عباس نے عبداللہ بن حسن کو خط لکھا۔ عبداللہ نے اسے قبول کیا۔ امام جعفر صادقؑ نے اس کو اس کے بُرے نتائج سے متنبہ کیا لیکن وہ نہیں مانا۔

یعقوبی اپنی تاریخ میں ذکر کرتا ہے کہ جب عبداللہ بن حسن کو بنی عباس کی ایک جماعت کا خط موصول ہوا تو انہوں نے کہا۔

"میں عمر رسیدہ شخص ہوں اور میرا بیٹا محمد (صاحبِ نفسِ ذکیہ) اس امر کا زیادہ حقدار ہے اس کی بیعت کرو" ۴۵۔

جھشیاری کہتا ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے عبداللہ بن حسن کو بنی عباس کی دعوت قبول نہ کرنے کی نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

"اے ابو محمد! اہلِ خراسان کب آپ کے حامی تھے؟ کیا آپ نے ابو مسلم کو خراسان بھیجا تھا؟ کیا آپ نے اسے سیاہ لباس پہننے کا حکم دیا تھا؟ اور یہ عراق آنے والے کیا آپ کی وجہ سے آئے ہیں؟ کیا آپ کو ان کے درمیان کوئی خاص حیثیت حاصل تھی؟ کیا ان میں سے کسی ایک کی بھی آپ کو پہچان ہے؟" ۴۶۔

حوادثِ زمانہ کے رخ کو جانچنے اور حالات کی پیچیدگیوں پر عبور رکھنے کے باعث امامؑ نے پہلے ہی جان لیا تھا کہ خلافت عباسیوں کے ہاتھ لگ جائے گی۔ چنانچہ جب عبداللہ بن حسن آپ کے پاس آیا تو اس سے فرمایا "حکومت ان لوگوں (بنی عباس) کو مل جائے گی اور ابو طالب کی اولاد میں سے کسی کو نصیب نہ

ہوگی" ۴۷۔

دوسری کوشش ابو سلمہ خلال کی جانب سے ہوئی (ابو سلمہ عباسی حکومت کے نقیبوں اور عباسی انقلاب کے فعال اراکین میں سے ایک تھا) ابو سلمہ نے ایک شخص کو اپنے خط کے ہمراہ امامؑ کی خدمت میں بھیجا۔ اور اس خط میں یہ لکھا کہ وہ لوگوں کو امامؑ کی طرف دعوت دینے اور بنی عباس سے الگ ہونے کے لئے آمادہ ہے۔ لیکن امامؑ نے جواب دیا کہ۔

"میرا ابو سلمہ سے کیا سروکار۔ ابو سلمہ تو دوسروں کا حامی ہے۔

ابو سلمہ کے فرستادہ شخص نے کہا۔ میں ایک پیام رسان ہوں آپؑ اس خط کو پڑھ کر جواب عنایت فرمادیں۔

یہ سن کر ابو عبداللہ (صادقؑ) نے چراغ مانگا۔ پھر ابو سلمہ کا خط لیا اور اسے چراغ کے اوپر رکھا یہاں تک کہ وہ جل کر راکھ ہوگیا۔ پھر اس شخص سے فرمایا۔ جو کچھ تم نے دیکھا ہے اپنے آقا کو بتادینا" ۴۸۔

ان حقائق کی روشنی میں ہمیں اس نظریے کا بطلان معلوم ہوجاتا ہے کہ۔

"حالات کی سازگاری کے باوجود امامؑ کا حکومت کو ٹھکرانا اپنی سیاسی قیادت سے دست بردار ہونے کے مترادف تھا۔"

حقیقت یہ ہے کہ امامؑ کی طرف سے حکومت کو ٹھکرانے کی پالیسی سیاسی حکمتِ عملی کی ایک صورت تھی جس کا تعین حالات کے مخصوص تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی لئے امامؑ نے مصلحت یہی جانی کہ ذاتی طور پر حکومت سے مکمل بے رغبتی کا اظہار کیا جائے۔ تاکہ آپؑ امت کی سطح پر داخلی امور کو انجام دے سکیں اور ان کو اپنی پسند کی حکومت قائم کرنے کی غرض سے تربیت

دے سکیں۔ کیونکہ قیامِ حکومت سے قبل امت کو اصلاح و تبدیلی کے عمل سے گزارنے، اس کے افکار کو متاثر کرنے، حالات پر اثر انداز ہونے اور سیاسی و معاشرتی مسائل کے باعث پیدا ہونے والے انحرافات کی اصلاح کرنے کی ضرورت تھی۔

مصادر و ماخذ

۱۔ دائرۃ المعارف۔ مقالہ دور الائمہ از شہید صدر

۲۔ الکافی۔ (کلینی)۔ ج۲۔ ص۲۴۲

۳۔ بحث فی حول الولایہ از شہید صدر

۴۔ الدولۃ العربیہ۔ ص۴۸۹

۵۔ الجذور التاریخیہ۔ للشعوبیہ الدوری۔ ص۴۱

۶۔ مقاتل الطالبین

۷۔ عقائدِ زیدیہ نقل از حیاتِ امام موسیٰ کاظم از قرشی

۸۔ مجلّہ النجف، دور الامام الصادقؑ از عدنان البکاء

۹۔ الحرکات السریہ۔ ص۶۱

۱۰۔ دور الائمہ۔ الایمان از شہید صدر

۱۱۔ تاریخ العرب از سید امیر علی۔ ص۱۷۹

۱۲۔ الصواعق المحرقہ از ابنِ حجر۔ ص۱۲۰

۱۳۔ رسائل الجاحظ (سندوبی)۔ ص۱۰۶

۱۴۔ رسالہ النجف۔ امام صادقؑ کا کردار

۱۵۔ حیاۃ الامام موسیٰ کاظمؑ از قرشی۔ ص۷۶

۱۶ـ ، ۱۷ـ الامام الصادقؑ والمذاہب الاربعہ از اسد حیدر ۔ ج۳ ۔ ص۲۷-۲۸ و ص۴۶

۱۸ـ الامام الصادقؑ از مظفر ۔ ج۱ ۔ ص۱۵۷

۱۹ـ فرائد الاصول از شیخ انصاری ۔ نیز قواعد الفقہ از محمد تقی الفقیہ

۲۰ـ الامام الصادقؑ والمذاہب الاربعہ از اسد حیدر ۔ ج۴ ۔ ص۹۲-۹۳

۲۱ـ مجلّہ النجف ۔ البکاء ۔ ص۲۴

۲۲ـ دائرۃ المعارف مقالہ دور الائمہ از شہید صدر

۲۳ـ مجلّہ النجف البکاء ۔ ص۲۲

۲۴ـ من لا یحضر الفقیہ از ابن بابویہ ۔ ج۳ ۔ ص۴

۲۵ـ مکاسبِ محرمہ از خمینی ۔ ج۲ ۔ ص۱۰۲ ۔ (از وسائل) ۔ نیز کتاب التجارہ ۔ ص۴۲

۲۶ـ مجلّہ النجف ۔ البکاء ۔ ص۲۰

۲۷ـ فقہ الامام الصادقؑ از محمد جواد مغنیہ ۔ ص۱۷

۲۸ـ الامام الصادقؑ والمذاہب الاربعہ از اسد حیدر ۔ ج۴ ۔ ص۱۷

۲۹ـ وسائل الشیعہ ۔ ج۱۱ ۔ ص۴۴۵

۳۰ـ تحف العقول (ابنِ شعبہ) ۔ ص۲۲۱

۳۱ـ تحف العقول ۔ (ابنِ شعبہ) ۔ ص۲۲۷-۲۲۹

۳۲ـ مجلّہ النجف ۔ البکاء ۔ ص۲۳

۳۳ـ بحث فی حول الولایہ نقل از سرایر ابن ادریس

۳۴ـ اعیان الشیعہ جزء ۳۳ ۔ ص۴۳

۳۵ـ اعیان الشیعہ ۔ ج۳۳ ۔ ص۱۱۳ ۔ نقل از کتاب الارشاد شیخ مفید

۳۶ـ بحار الانوار ۔ ج۴۷ ۔ ص۳۰۲

۳۷ـ مجلّہ النجف ۔ البکاء ۔ ص۲۱

۳۸ـ الحرکات السریہ ۔ ص۶۷

۳۹ـ محاضرات فی التاریخ الاسلامی ۔ ج۳ ۔ ص۲۲

۴۰ـ محاضرات فی التاریخ الاسلامی

۴۱۔ الحرکات السریہ۔ ص۶۶
۴۲۔ الحرکات السریہ
۴۳۔ الملل والنحل از شہرستانی۔ ج۱۔ ص۲۴۱
۴۴۔ ایضاً
۴۵۔ محاضرات فی التاریخ الاسلامی۔ ص۶۷۔ (الاعظمی)
۴۶۔ محاضرات فی التاریخ نقل از مسعودی و جھشیاری
۴۷۔ الامام الصادق علم و عقیدہ از رمضان لاوند۔ ص۸۹
۴۸۔ مروج الذہب از مسعودی۔ ج۳۔ ص۲۵۴

امام موسیٰ ابنِ جعفر علیہ السلام

امام موسیٰ کاظمؑ نے انہی خطوط پر اپنی جدوجہد اور منصوبہ بندی جاری رکھی، جن کے مطابق امام جعفر صادقؑ نے معاشرے میں اپنا جہاد جاری رکھا ہوا تھا۔ یہ خطوط اور محور درجِ ذیل تھے۔

پہلا محور

فکری منصوبہ بندی کرنا، نظریاتی بیداری پیدا کرنا نیز منحرف عقائد اور قبائلی، قومی و مذہبی اختلافات کی چارہ جوئی کے عمل کو آگے بڑھانا۔ اس دور کے خطرناک اور رائج پروپیگنڈوں میں سے ایک الحادی نظریات کی ترویج تھا۔ اس کے زہریلے اثرات نوجوان مسلمان نسل کے اندر تیزی سے پھیل رہے تھے۔ اس کے خلاف امام موسیٰ کاظمؑ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ آپؑ مستحکم علمی دلائل کے ساتھ ان سے بحث کرنے کے لئے میدان میں آتے اور ان نظریات کی سبکی، حقیقت سے دوری اور غیر منطقی ہونے کو آشکارا کرتے۔ یہاں تک کہ ان نظریات کے حامل لوگوں کی ایک کثیر تعداد نے اپنی غلطی اور گمراہی کا اعتراف کیا۔

اسی وجہ سے امامؑ کی تحریک خوب چمکی اور اس کی علمی حیثیت معروف ہوگئی۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اس میں شامل ہوگئی۔ یہ بات حکمران طبقے پر گراں گزری اور یوں حکام ان کو دبانے اور سخت ترین سزائیں دینے پر اُتر آئے، عقائد کے بارے میں گفتگو کرنے پر پابندی لگادی گئی۔ چنانچہ امامؑ نے اپنے ایک ساتھی ہشام کو پیغام بھیجا کہ وہ لاحق خطرات کے پیشِ نظر گفتگو میں پرہیز سے کام لیں۔ یوں ہشام خلیفہ مہدی کے مرنے تک عقائد کے بارے میں بات کرنے سے پرہیز کرتے رہے۔۱

مدینے میں قیام کے دوران بڑے بڑے علماء و محدثین کی کثیر تعداد (جو آپؑ کے والدِ بزرگوار کے شاگرد تھے) آپؑ کے گرد جمع ہوگئی۔ آپؑ نے زبردست حوصلے اور توانائی کے ساتھ اپنی پختہ اور عمدہ آراء کی بدولت ان لوگوں کو اسلامی فقہ اور تعلیمات سے مالا مال کیا۔ احکامِ اسلامی کے کثیر مجموعے آپؑ ہی سے منسوب ہیں، جو فقہ و حدیث کی بڑی بڑی کتابوں کی صورت میں مدون ہوچکے ہیں۔ علماء اور روایانِ حدیث ہمیشہ آپؑ کے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور آپؑ کی احادیث، علمی بحثوں اور آپؑ کے نظریات کو لکھتے جاتے تھے۔ چنانچہ سید ابنِ طاؤس نے روایت کی ہے کہ امامؑ کے اصحاب اور خواص آپؑ کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے اس حال میں کہ ان کی آستینوں میں آبنوس اور آملے کی تختیاں ہوتی تھیں۔ جب بھی آپؑ کوئی جملہ زبان سے ادا کرتے، یا کسی مسئلے میں فتویٰ دیتے تو وہ اسے فوراً سپردِ قلم کرلیتے تھے۔۲

ان علماء نے آپؑ سے ہر قسم کے علوم نقل کئے ہیں اگرچہ وہ علوم ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان کا دامن نہایت وسیع ہے۔

آپؑ کی علمی خدمات تمام عالمِ اسلام میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جانے لگیں اور آپؑ کا عطا کردہ علمی سرمایہ علماء کے ذریعے نسل در نسل منتقل ہوتا چلا گیا۔

دوسرا محور

اپنے وفاداروں اور حامیوں کی براہِ راست نظارت اور ان کے ساتھ نظم و ہم آہنگی پیدا کرنا۔ تاکہ حکومتِ وقت کو سیاسی طور پر کمزور کرنے، اس کے ساتھ روابط نہ رکھنے اور (اس کے سیاسی وجود کو ختم کرنے کے لئے) سرکاری عدالتوں کی طرف رجوع نہ کرنے کے سلسلے میں مناسب موقف اختیار کیا جاسکے۔

امامؑ کے وفاداروں اور حامیوں میں واضح اضافے نے اس قاطعانہ اقدام میں آپؑ کی حوصلہ افزائی کی۔ ان حامیوں نے منحرف عباسی حکومت کے خلاف آپؑ کی سرگرمیوں اور ان کے ساتھ ہر میدان میں عدم تعاون کی دعوت وغیرہ میں آپؑ کا ساتھ دینا شروع کیا۔ امامؑ کے اس موقف کا اظہار آپؑ کے ایک ساتھی (صفوان جمال) کے ساتھ آپؑ کی گفتگو سے ہوتا ہے۔ آپؑ نے صفوان سے فرمایا۔

"اے صفوان تمہاری ہر صفت پسندیدہ اور اچھی ہے سوائے ایک چیز کے۔

صفوان : قربان جاؤں وہ کونسی صفت ہے؟

امامؑ : تمہارا اپنے اونٹوں کا اس ظالم (ہارون) کو کرائے پر دینا۔

صفوان : خدا کی قسم میں نے غرور و تکبر جتانے یا شکار و لہو و لعب کے

لئے اسے اونٹ کرائے پر نہیں دیئے بلکہ میں نے تو اس سفر (حج) کے واسطے (حیوانوں کو) کرائے پر دیا ہے۔ علاوہ ازایں میں بذاتِ خود ان کے ساتھ نہیں جاتا' بلکہ اپنے آدمیوں کو ان کے ساتھ بھیجتا ہوں۔

امامؑ : اے صفوان کیا کبھی تمہارا کرایہ ان کے ذمے (واجب الاداء) باقی رہتا ہے؟

صفوان : میری جان آپؑ پر فدا ہو۔ ہاں ایسا ہوتا ہے۔

امامؑ : اس صورت میں کیا تمہاری خواہش یہ نہیں ہوتی کہ کرائے کی ادائیگی تک وہ زندہ رہیں؟

صفوان : جی ہاں!

امامؑ : جو کوئی ان کے زندہ رہنے کی تمنا کرے وہ انہی میں سے ہے اور جس کا تعلق ان سے ہو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔"

امامؑ ہارون کی حکومت کے خلاف اپنی ناراضگی و ناپسندیدگی نیز اس کے ساتھ ہر قسم کے تعاون کے حرام ہونے کا مسلسل اظہار فرماتے رہے۔ آپؑ نے اس آیہ قرآنی کے ذریعے ان ظالموں کی طرف میلان رکھنے سے منع فرمایا "ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار" "اور خبردار تم لوگ ظالموں کی طرف جھکاؤ اختیار نہ کرنا کہ جہنم کی آگ تمہیں چھولے گی۔"

(سورہ ہود ۱۱۔ آیت ۱۱۳)

آپؑ نے مسلمانوں کے لئے ان کے ساتھ لگاؤ رکھنے کو حرام اور ان سے روابط قطع کرنے کو ضروری قرار دیا۔ اگرچہ بعض ذاتی مفادات اس کی زد میں کیوں نہ آجائیں۔ امامؑ نے اپنے اصحاب کو ہارونی نظامِ حکومت میں داخل

ہونے اور کسی قسم کا عہدہ یا کام قبول کرنے سے منع کیا۔ چنانچہ آپؑ نے زیاد بن ابی سلمہ سے فرمایا :

"اے زیاد میں کسی بلندی سے گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہونے کو ان ظالموں کے لئے کوئی کام انجام دینے یا ان میں سے کسی کے فرش پر پاؤں رکھنے کی بہ نسبت زیادہ پسند کرتا ہوں"۔ ۳۔

البتہ امامؑ نے علی ابنِ یقطین کو (جو آپؑ کے جلیل القدر اصحاب میں سے ایک تھے) مستثنٰی قرار دیا۔ اور انہیں اجازت دی کہ وہ ہارون کی وزارت قبول کرلیں۔ نیز اس سے قبل خلیفہ مہدی کے دور میں بھی ایک عہدے پر کام کرنے کی اجازت دی۔ ۴۔

جب علی ابن یقطین امام موسیٰ کاظمؑ کی خدمت میں اپنا عہدہ چھوڑنے اور استعفٰی دینے کی اجازت حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوئے تو آپؑ نے منع کیا اور فرمایا۔

"ایسا نہ کرو کیونکہ ہم تم سے مطمئن ہیں۔ تم اپنے بھائیوں کے لئے باعثِ عزت ہو۔ امید ہے کہ خداوندِ عالم عنقریب تمہاری وجہ سے کسی نقصان کی تلافی کرے یا مخالفین کے غضب اور آتشِ انتقام کو اپنے اولیاء سے دور کرے۔ اے علی تمہارے اعمال کا کفارہ یہ ہے کہ تم اپنے بھائیوں کے ساتھ نیکی کرو۔ تم میرے لئے ایک چیز کی ضمانت دو میں تمہارے لئے تین چیزوں کی ضمانت دیتا ہوں۔ تم اس بات کی ضمانت دو کہ ہمارے دوستوں میں سے جس سے ملاقات ہو اس کی حاجت روائی کروگے اور اس سے عزت و تکریم سے پیش آؤ گے۔ اس کے جواب

میں میں تمہیں یہ ضمانت دیتا ہوں کہ تم کبھی زندان کی چھت کے نیچے نہ جاؤ گے۔ نہ کسی تلوار کی دھار تمہیں مس کرے گی اور نہ تمہارے گھر میں فقر و فاقہ داخل ہو گا۔ اے علی جس نے کسی مومن کو خوش کیا اس نے اولاً خدا، ثانیاً رسول اللہؐ اور ثالثاً ہمیں خوش کیا ہے۔ ۵۔

تیسرا محور

آپؑ کا حکام کے مقابلے میں یہ اعلانیہ اور صریح استدلالی موقف اختیار کرنا، کہ آپؑ دوسروں کی بہ نسبت خلافت کے زیادہ حقدار ہیں اور دیگر تمام مسلمانوں سے آپؑ حقِ خلافت میں مقدم ہیں۔

قبرِ رسولؐ کے پاس ایک جم غفیر کے سامنے آپؑ نے ہارون کے روبرو اپنا استدلال پیش کیا۔ اس مجمع میں بڑے بڑے روٗساء، فوج کے اعلیٰ حکام اور حکومت کے امراء موجود تھے۔ وہاں ہارون رسول اللہؐ کی ضریح کی جانب رخ کر کے آگے بڑھا اور آپؐ کو یوں سلام کیا۔

"اے میرے چچا زاد بھائی آپؐ پر درود و سلام ہو۔"

اس طرح ہارون دوسروں کے مقابلے میں نبیؐ سے اپنی قرابت کی بناء پر عزت و افتخار جتانا اور یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اسی قرابت کی بدولت اسے خلافت ملی ہے۔ اس وقت امامؑ بھی موجود تھے۔ آپؑ نے رسول اللہؐ کو یوں سلام کیا۔

"سلام ہو آپؐ پر اے میرے پدرِ بزرگوار۔"

یہ سننا تھا کہ ہارون آپے سے باہر ہو کر سخت طیش میں آگیا۔ کیونکہ امامؑ نے فخر و عظمت میں اپنی سبقت ثابت کر دی تھی۔ چنانچہ مامون نے غیظ و غضب اور

کینہ بھرے لہجے میں کہا۔

آپؑ نے ہم سے زیادہ رسولؐ سے قریب ہونے کا دعویٰ کیوں کیا؟

امامؑ نے دوٹوک اور دندان شکن جواب دیتے ہوئے فرمایا :

اگر رسول اللہؐ زندہ ہوتے اور تم سے تمہاری بیٹی کی خواستگاری کرتے تو کیا تم اسے قبول کرتے؟

ہارون نے جواب دیا : سبحان اللہ! یہ تو عرب و عجم کے سامنے میرے لئے باعثِ افتخار ہوتا۔

امامؑ نے فرمایا : لیکن رسول اللہؐ مجھ سے میری بیٹی نہیں مانگ سکتے اور نہ میں دے سکتا ہوں۔ کیونکہ رسول اللہؐ ہمارے باپ ہیں نہ کہ تمہارے۔ اسی لئے ہم تمہاری نسبت آنحضرتؐ سے زیادہ نزدیک ہیں۔۶۔

ہارون امامؑ کی دلیل کے آگے منہ کی کھا کر کھسیانا ہوگیا اور امامؑ کو گرفتار کرنے کا حکم دیا اور آپؑ کو حوالۂ زندان کیا۔۷۔

ہارون کے مقابلے میں امام موسیٰ کاظمؑ کا موقف واضح اور صاف تھا۔ ایک مرتبہ آپؑ ہارون کے ایک محل میں (جس کی مثال بغداد اور دیگر مقامات پر نہ مل سکتی تھی) اس کے پاس تشریف لے گئے۔ ہارون نے اقتدار و حکومت کے نشے میں چور ہو کر آپؑ سے سوال کیا۔۔۔۔۔۔

"یہ گھر کیسا ہے۔۔۔۔۔؟ امامؑ نے اس کے اقتدار و دبدبے سے لاپرواہی برتتے ہوئے جواب دیا۔ یہ فاسقوں کا گھر ہے۔ خداوندِ عالم نے فرمایا ہے "سا صرف عن ایاتی الذین یتکبرون فی الارض بغیر الحق و ان یروا کل ایۃ لا یومنوا بہا و ان

یروا سبیل الرشد لا یتخذوہ سبیلا و ان یروا سبیل الغی یتخذوہ سبیلا"

"میں عنقریب اپنی آیتوں کی طرف سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا جو روئے زمین پر ناحق اکڑتے پھرتے ہیں اور یہ کسی بھی نشانی کو دیکھ لیں ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ان کا یہ حال ہے کہ ہدایت کا راستہ دیکھیں گے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور گمراہی کا راستہ نظر آئے تو اسے فوراً اپنا لیں گے۔" (سورہ اعراف ۷۔ آیت ۱۴۶)

یہ سن کر ہارون تھرانے لگا اور انتہائی غصہ کے عالم میں اس نے امامؑ سے پوچھا۔ یہ گھر کس کا ہے-----؟

امامؑ : ہمارے شیعہ عارضی مدت کے لئے اس سے محروم ہیں اور دوسروں کے لئے عذاب ہے۔

ہارون : کیا وجہ ہے کہ صاحبِ خانہ اسے اپنے قبضے میں نہیں لیتا؟

امامؑ : تم نے جب اس سے لیا تھا تو یہ آباد تھا اور فقط اسی صورت میں وہ واپس لے گا جب (پہلے کی طرح) آباد ہو۔

ہارون : آپ کے شیعہ کہاں ہیں؟

امامؑ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ "لم یکن الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین منفکین حتی تاتیھم البینۃ" "اہلِ کتاب کے کفار اور دیگر مشرکین اپنے کفر سے الگ ہونے والے نہیں تھے جب تک کہ ان کے پاس کھلی دلیل نہ آجاتی۔" (سورہ بینہ ۹۸۔ آیت ۱)

یہ سنتے ہی ہارون غصے سے پھٹ پڑا اور بولا : کیا ہم کافر ہیں؟

امامؑ نے فرمایا : نہیں، لیکن قولِ خداوندی ہے "الذین بدلوا نعمت اللہ کفرا و احلوا قومھم دار البوار" "جن لوگوں نے اللہ کی نعمت کو کفرانِ نعمت سے تبدیل کردیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کی منزل تک پہنچا دیا۔" (سورہ ابراہیم ۱۴۔ آیت ۲۸)

مختصر یہ کہ امامؑ ہارون کو منصبِ خلافت و حکومت کا غاصب سمجھتے تھے۔ اس امر نے ہارون کو آپؑ کے اوپر غضبناک کیا چنانچہ اس نے آپؑ کے خلاف سخت لہجہ اختیار کیا۔ کیونکہ اس نے امامؑ کے موقف میں کوئی لچک نہ دیکھی ۸۰۔ اور اسے اپنے لئے ایک چیلنج سمجھا۔

ایک دوسرے موقع پر جب ہارون نے فدک کی واپسی کے سلسلے میں آپؑ سے سوال کیا تو آپؑ نے اسے لینے سے انکار فرمایا۔ مگر اس شرط کے ساتھ لینے پر رضامند ہوئے کہ فدک کو اس کی تمام تر حدود کے ساتھ واپس کیا جائے۔ ہارون نے کہا اس کی حدود کیا ہیں؟ فرمایا اگر میں اس کی حدود بیان کروں تو تم کبھی واپس نہ کروگے۔ ہارون نے بہت زور دیا کہ آپؑ ان حدود کو بیان فرما دیں۔ جب امامؑ کے لئے جواب دیئے بغیر کوئی چارہ نہ رہا تو فرمایا۔

"اس کی پہلی حد "عدن" ہے۔ ہارون نے یہ سنا تو اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ امامؑ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے فرمایا دوسری حد "سمرقند" ہے۔ یہ سننا تھا کہ ہارون کا چہرہ خاکستری ہو گیا اور وہ زبردست طیش میں آگیا۔ لیکن امامؑ نے مزید فرمایا تیسری حد "افریقا" ہے۔ یہ سن کر ہارون کا چہرہ سیاہ ہو گیا اور اس نے غضبناک لہجے میں کہا "ایہ"۔

امامؑ نے آخری حد بیان کرتے ہوئے فرمایا اور چوتھی حد جزائر آرمینیا کے اس طرف کا ساحلی علاقہ ہے۔"

یہ سن کر ہارون آپے سے باہر ہوگیا اور کہا : "پھر ہمارے لئے کچھ نہیں بچے گا۔"

امامؑ نے فرمایا : مجھے علم تھا کہ تم اسے واپس نہ کروگے"۔۹

چوتھا محور

امت کے انقلابی جذبے کو بیدار کرنے کے لئے علوی انقلابیوں کی ان بغاوتوں اور تحریکوں کی حوصلہ افزائی جن کا مقصد امتِ مسلمہ کے ضمیر اور اسلامی عزم وارادے کو ظالم ومنحرف حکمرانوں کے آگے سرنگوں ہونے سے بچانا تھا۔ امامؑ مخلص علویوں کی مدد بھی فرماتے تھے۔ جب شہیدِ فخ حسین بن علی ابنِ حسن نے امامؑ کے معتقد شیعوں اور علویوں کی توہین اور ان پر ہونے والے مظالم کے پیشِ نظر فاسد ماحول کے خلاف بغاوت کا عزم کیا تو وہ پہلے امام موسیٰ کاظمؑ کی خدمت میں مشورہ لینے آئے۔ امامؑ نے فرمایا، آپؑ قتل ہو جائیں گے۔ پس اپنی تلوار تیز کرلیجئے۔ کیونکہ لوگ فاسق ہیں۔ وہ اپنے آپؑ کو ایماندار ظاہر کرتے ہیں لیکن اپنے باطنی شرک ونفاق کو چھپاتے ہیں۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون" "میں ان لوگوں سے خدا کی بارگاہ میں آپ کا حساب لوں گا۔"

جب آپ کو حسینؑ کے قتل کی خبر ملی تو آپؑ نے گریہ فرمایا اور ان الفاظ کے ساتھ ان کی توصیف کی۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون" خدا کی قسم وہ صالح، کثرت سے روزہ رکھنے اور نماز پڑھنے والے اور معروف کا حکم دینے اور منکر

سے منع کرنے والے تھے۔ ان کے گھرانے میں ان جیسا کوئی نہ تھا۔۱۰۔

جب خلیفہ موسیٰ الھادی علویوں کی بیخ کنی کر چکا تو وہ باقی ماندہ افراد کو قتل و تشدد کی دھمکی دینے لگا۔ امام موسیٰ کاظمؑ کے بارے میں اس نے کہا "خدا کی قسم حسین نے اس (امامؑ) کے حکم سے اور اس کی محبت میں خروج کیا کیونکہ وہی (امامؑ) اس گھرانے کے سرپرست ہیں" ۔۱۱۔

امامؑ کے اصحاب خوفزدہ ہو کر جلدی سے آپؑ کی خدمت میں پہنچے اور آپؑ کو اس ظالم کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے چھپ جانے کا مشورہ دیا۔ یہ سن کر امامؑ نے مسکراتے ہوئے فرمایا اور اشارتاً کعب ابنِ مالک کا یہ شعر پڑھا۔

زعمت سخینۃ ان ستغلب ربھا - ولیغلبن مغالب الغلاب

"سخینہ نے خیال کیا کہ وہ اپنے رب پر غالب آئے گی حالانکہ وہ بڑے بڑے فاتحین پر غالب آنے والا ہے۔"

امامؑ کی سرگرمیاں اور ان کی حدود

امامؑ دو مختلف میدانوں میں کام کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک خفیہ نوعیت کا تھا اور دوسرا اعلانیہ تھا۔

(۱) آپؑ کی خفیہ سرگرمیاں

حالات کے مقابلے کے لئے امامؑ کی جدوجہد دو طریقوں سے عمل میں آئی۔ پہلا طریقہ (حکومت کے حوالہ سے) گریز اور اجتناب کا تھا۔ جیسا کہ اس سے قبل ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اس کی صورت یہ تھی کہ آپؑ اپنے حامیوں کو حکومت سے قطع رابطہ کرنے اور اس سے کسی قسم کا لین دین نہ رکھنے کا حکم دیتے تھے۔

(جیسا کہ صفوان کے ساتھ آپؑ کی مذکورہ گفتگو سے ظاہر ہے۔)

مقابلے کی یہ روش اگرچہ براہِ راست ٹکراؤ اور بزورِ شمشیر مقابلے کی بجائے بائیکاٹ اور گریز کی مظہر تھی۔ لیکن مسلحانہ اقدام سے اجتناب اپنی جگہ خود اسلام اور اسلامی اقدار کی حفاظت کے لئے ایک عظیم اور مثبت کام تھا۔ کیونکہ منحرف حکمران اسلام کی غلط اور بدنما تصویر پیش کررہے تھے۔ بنابرایں اہلِ بیتؑ سے تعلق رکھنے والی قیادت کے لئے ضروری ہوگیا تھا کہ اسلام کا حقیقی اور تابناک چہرہ سامنے لائے۔ اور عملاً یہ ثابت کرے کہ حکومتِ وقت اور اسلام کے درمیان کوئی ربط نہیں یوں نظریاتی طور پر اسلام انحراف کے گرداب سے صحیح و سالم باہر نکلا اگرچہ تطبیق اور عمل کے مرحلے میں تحریف کا شکار رہا۔ ۱۲۔

بعض شیعی تنظیمیں نہایت منظم طرز پر چل رہی تھیں۔ ائمہؑ کے بعض ساتھیوں کے پاس شیعہ ناموں کی خفیہ فہرستیں موجود تھیں۔ ۱۳۔ اس دور کی حکومتوں نے ان تک رسائی حاصل کرنے کی کوششیں کیں لیکن وہ کامیاب نہ ہوئیں۔ بہرحال ان منظم جماعتوں نے ہی حکومت کی نظروں اور پابندیوں سے دور رہتے ہوئے تمام اسلامی علاقوں میں مکتبِ تشیع کو پھیلانے کے لئے کام کیا۔ یہاں تک کہ یہ مکتب ایک عظیم طاقت کی شکل اختیار کرگیا اور مکتبِ تشیع کے پیروکاروں کو حکومتوں کی خواہشات کے آگے جھکانا ایک مشکل کام ہو کے رہ گیا اور حکامِ وقت ان کے آگے مجبور و عاجز ہوگئے۔ چنانچہ امام رضاؑ کے حالات میں مشاہدہ کریں گے کہ کس طرح مامون امام رضاؑ کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوا اور اس نے آپ کو اپنا ولی عہد بنایا۔ ۱۴۔

خلاصہ یہ کہ اس خفیہ طریقہ کار کے ذریعہ امامؑ نے اپنا حقِ حکومت لوگوں پر

واضح کیا۔ نیز اپنے اصحاب اور حامیوں کو ماحول کی خرابیوں میں ملوث ہونے سے بچانے، ان کی سرپرستی و نظارت کرنے، ان کے لئے طریقِ کار وضع کرنے، ان کی بیداری و آگاہی میں اضافہ کرنے اور ہر قسم کے پائیدار طریقوں سے ان کی امداد کرنے کے علاوہ ان کو اپنے مشن اور دینی ذمہ داریوں سے مکمل آگاہ و بیدار ہر اول دستے کی حیثیت دینے کے لئے اقدام فرمایا۔

امامؑ کے خفیہ طریقہ کار کے دو پہلو تھے۔

(الف) انقلابی تحریکوں کی تائید اور ان کے لئے کام کرنے والے مخلص افراد خصوصاً آلِ رسولؐ کی انقلابی شخصیات کے زیرِ پرچم امر بہ معروف و نہی از منکر کے لئے چلنے والی تحریکوں کی مدد : اس بات کا اندازہ المیہ ”فخ“ کے بارے میں آپؑ کے موقف سے ہوتا ہے۔ جس کی قیادت حسین بن علی بن حسن بن علی ابنِ ابی طالب نے کی تھی۔ ان تحریکوں کو کسی نہ کسی شکل میں امامؑ کی رضامندی اور اجازت حاصل تھی۔ اور یہ ان سے مربوط سرگرمیوں کی ظاہری شکل تھی۔ ان کا مقصد آلِ محمدؐ کی پسندیدہ اور صاحبِ حق ہستی کے لئے حکومت کے حصول کی راہ ہموار کرنا تھا۔

(ب) شیعوں کی قیادت و نظارت : امامؑ اس طریقے سے ان (شیعوں) کو نظریاتی، فکری اور عملی لحاظ سے ایک خاص راہ پر لگانا چاہتے تھے تاکہ وہ آپؑ کی تحریک کے لئے امت کے درمیان ایک مضبوط قوت کی صورت اختیار کرلیں اور پھر امامؑ اس قوت کے ذریعے اپنے اہدافِ عالیہ کے حصول نیز امت کے اندرونی انحرافات کا علاج کرنے کے لئے اقدام کرسکیں۔ اسی لئے امام موسیٰ کاظمؑ اور آپؑ کے آباء طاہرین کو ہمیشہ جنگوں، پابندیوں اور ظلم و تشدد کا سامنا رہا۔

اس تاریک دور میں شیعوں کو درپیش ناقابلِ برداشت تکالیف اور آزمائشوں کے پیشِ نظر وہ اپنے مصائب و آلام نیز اپنی شکایتوں کے بیان کی راہیں مسدود پاتے تھے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض افراد نے دیواروں پر لکھنے کی راہ اختیار کی تاکہ عوام الناس تک اپنی بات پہنچا سکیں ۱۵۔ اور ان کو بتا سکیں کہ شیعوں پر ظلم و ستم کے کیا کیا پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں۔ بعض تحریری نعروں سے علویوں کے اس استدلال کی تصویر کشی ہوتی تھی کہ وہ خلافت و قیادت کے سب سے زیادہ حق دار، نبی کریمؐ کے سب سے زیادہ قریبی رشتے دار اور آنحضرتؐ کے بعد امت کے لئے آپؐ کے جانشین ہیں ۱۶۔

(۲) آپؑ کی اعلانیہ سرگرمیاں

اعلانیہ فعالیت کی بدولت امامؑ کو اسلامی عقائد و احکام کے بارے میں لوگوں کی جہالت کو دور کرنے اور الحادی نظریات و اعتراضات کا براہِ راست جواب دینے کا موقع ملا۔ ان الحادی شبہات کو وہ تحریکیں پھیلا رہی تھیں جو جدید غیر اسلامی نظریات کی اسلامی دنیا میں آمد کے ساتھ وجود میں آئی تھیں ۱۷۔

یہ مسئلہ امامؑ کو درپیش ان عظیم مشکلات میں سے ایک تھا جو امامؑ اور آپؑ کے اہداف کے درمیان ایک خلیج پیدا کر رہی تھیں۔ اسی لئے امامؑ نے ان باطل نظریات کا مقابلہ کرنے اور مخالفِ اسلام نظریات کو باطل ثابت کرنے کے لئے فوری اقدام کیا۔

بعض اوقات امامؑ دیگر اسلامی مذاہب کے قائدین اور ائمہ کے ساتھ اعلانیہ بحث و مناظرہ کرنے کے لئے اقدام فرماتے تھے تاکہ نظریۂ امامت اور اپنی

پالیسیوں کو دلیلوں سے ثابت کرسکیں۔ یہ مناظرے سرِعام برپا ہوتے تھے۔ ان مناظروں میں ہشام بن حکم، ہشام بن سالم اور مومنِ طاق جیسے آپؑ کے اصحاب حصہ لیتے تھے۔ امامؑ اور آپؑ کے ساتھیوں کے مضبوط دلائل اور فیصلہ کن براہین کا نتیجہ مسلمانوں کے درمیان شیعہ نظریات کے پھیلاؤ کی صورت میں نکلا۔ یہ دلائل منطقی اور موضوعی بحثوں کی بنیاد پر استوار تھے۔ چنانچہ "گراڈی فوا" نے ان لوگوں کی تعریف کرتے ہوئے انہیں آزاد فکر لوگوں کی جماعت قرار دیا ہے۔۱۸

اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ ان دونوں میدانوں میں امامؑ کی فعالیت آپؑ کو اپنے اس ہدف سے نزدیک کرتی تھی جو امامت کے علمی مقام، اس کے اصولوں پر آپؑ کو حاصل عبور، آپؑ کی فکری قوت اور آپؑ کی تحریک کے لئے امت کے درمیان موجود سازگار فضا کا تقاضا تھا۔

امامؑ کے خلاف شکایتیں

امامؑ کی سرگرمیوں کے بارے میں بعض رپورٹیں، چغل خوروں کے ذریعے ہارون تک پہنچتی تھیں۔ یہ امر اس کے غیظ و غضب اور کینے میں اضافے کا باعث بنتا تھا۔ ایک بار اس کو خبر ملی کہ امام موسیٰ ابنِ جعفرؑ کے لئے عالمِ اسلام کے مختلف حصوں سے بے تحاشا دولت بطورِ خراج وصول کی جاتی ہے۔ جو مشرق و مغرب سے آپؑ کے پاس لائی جاتی ہے اور آپؑ کے کئی بیت المال ہیں۔۱۹

یہ سن کر ہارون نے امامؑ کو گرفتار کر کے حوالۂ زندان کرنے کا حکم دیا۔۲۰

یحییٰ برمکی نے ہارون کے پاس امامؑ کی شکایت کی اور اس کے دل میں یہ کہہ

کر امامؑ کے خلاف کینہ و دشمنی کی آگ بھڑکائی کہ امامؑ خلافت کے حصول کے لئے سرگرمِ عمل ہیں اور آپؑ نے تمام مسلمان علاقوں میں اپنے حامیوں کو خطوط لکھے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو آپؑ کی طرف دعوت دیں اور حکومت کے خلاف بغاوت پر اکسائیں۔ ہارون نے یہ سن کر اپنی دانست میں شیعوں سے امامؑ کا رابطہ منقطع کرنے کے لئے آپؑ کو زندان میں ڈال دیا۔ امامؑ نے ایک طویل مدت (قریباً سولہ سال) زندانوں میں گزاری اور وہیں اپنے رب سے جا ملے۔

آپؑ نے دورانِ قید تلخ ترین مصائب اور سخت ترین تکالیف کا سامنا کیا۔ یہاں تک کہ آپؑ زندان سے تنگ آگئے اور مدت کی طوالت سے ملول ہوئے۔ حکومت آپؑ کو مختلف زندانوں میں منتقل کرتی رہی۔ اس خوف سے کہ کہیں آپؑ کا رابطہ کسی شیعہ کے ساتھ برقرار نہ ہو سرکاری پولیس اور جاسوس سختی سے آپؑ کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔

امامؑ طویل مدت تک ہارون کی قید میں رہے۔ طویل قید نے آپؑ کی صحت پر بُرا اثر ڈالا اور آپؑ کے بدنِ مبارک کو گُھلا کر رکھ دیا۔ یہاں تک کہ جب آپؑ سجدہ کرتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا زمین پر کوئی کپڑا پڑا ہوا ہو۔ ایک مرتبہ خلیفہ کے ایک نمائندے نے آپؑ سے عرض کیا۔ ”خلیفہ آپ سے معذرت خواہ ہے اور اس نے آپؑ کی آزادی کا حکم دیا ہے، بشرطیکہ آپؑ اس سے ملاقات فرما کر معذرت طلب کریں یا اس کی خوشنودی حاصل کریں۔“

امامؑ نے نہایت بے نیازی کے ساتھ صریح الفاظ میں نفی میں جواب دیا۔ یوں آپؑ نے زہرِ قاتل کا تلخ جام پینا گوارا فرمایا۔ آپؑ کا مقصد صرف یہ تھا کہ آپؑ کو اپنا ہمنوا بنانے کے سلسلے میں گمراہ حکمرانوں کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ

ہو سکے اور انکی گمراہی آشکار ہو۔۲۱۔

امامؑ نے زندان سے ہارون کے نام ایک خط لکھا جس میں آپؑ نے ہارون پر اپنے شدید غصے کا اظہار فرمایا۔ خط کا متن یہ ہے۔

"بتحقیق جتنے ایام میرے مشقت و آلام کے گزریں گے اتنے ہی دن تیرے راحت و آرام کے بھی گزر جائیں گے۔ پھر ایک دن ایسا آئے گا جب ہم سب کا خاتمہ ہو گا۔ اور کبھی ختم نہ ہونے والا دن آن پہنچے گا۔ اس دن بدکار لوگ خسارے میں ہوں گے"۔۲۲۔

ہارون کے زندان میں امامؑ قسم قسم کی اذیتوں کو برداشت کرتے رہے۔ کیونکہ ایک طرف سے آپؑ کو بیڑیوں سے پابہ زنجیر کیا گیا دوسری طرف سے آپ پر زبردست سختیاں اور اذیتیں روا رکھی گئیں۔ ہارون رشید نے ہر قسم کے مصائب ڈھانے کے بعد آخرکار آپؑ کو زہر دے کر شہید کیا۔ یوں آپؑ شہادت و سعادت کی منزل پر فائز ہوئے اور اپنے خالق سے جا ملے۔ آپؑ کی شہادت ۲۵ رجب ۱۸۳ھ کو واقع ہوئی۔۲۳۔

مصادر و ماخذ

۱۔ رجالِ کشی۔ ص ۱۷۲

۲۔ انوار بھیہ۔ ص ۹۱

۳۔ مکاسب شیخ انصاری باب الولایہ من قبل الجائر

۴۔ الجھشیاری

۵۔ مکاسبِ شیخ انصاری
۶۔ اخبار الدول۔ ص ۱۱۳
۷۔ تذکرۃ الخواص۔ ص ۳۵۹
۸۔ المناقب۔ ج ۲۔ ص ۳۸۱
۹۔ المناقب۔ ج ۲۔ ص ۳۸۱
۱۰۔ مقاتل الطالبین۔ ص ۴۵۳
۱۱۔ بحار الانوار۔ ج ۱۱۔ ص ۲۷۸
۱۲۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ۔ مقالہ دور الائمہ از شہید صدر۔ ص ۹۶
۱۳۔ رجالِ نجاشی
۱۴۔ حیاتِ امام موسیٰ کاظمؑ از باقر شریف قرشی۔ ج ۲۔ ص ۱۸۸
۱۵۔ حیاتِ امام موسیٰ کاظمؑ از باقر شریف قرشی۔ ص ۱۹۰
۱۶۔ رجوع ہو بطرف مقاتل الطالبین۔ ص ۴۱۱۔ ۴۱۲ جس میں تفصیل کے ساتھ ان شعار کا تذکرہ ہے۔
۱۷۔ حیاتِ امام موسیٰ کاظمؑ از باقر قرشی۔ ص ۱۳۶
۱۸۔ الحضارۃ الاسلامیہ۔ ج ۱۔ ص ۱۲۷
۱۹۔ عیون اخبار الرضا
۲۰۔ الفصول المہمہ۔ ص ۲۵۲
۲۱۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ۔ مقالہ دور الائمہ از شہید صدر۔ ص ۹۶
۲۲ البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۰۔ ص ۱۸۳ اور تاریخِ بغداد
۲۳۔ ابن خلکان۔ ج ۴۔ ص ۱۷۳ اور تاریخ بغداد

تیسرا مرحلہ

قبل ازایں ہم نے عرض کیا کہ گزشتہ مرحلے میں ائمہؑ کی کوششوں کا رخ منصوبہ بندی اور وفادار شیعہ گروہ کی تربیت و تعمیر کی طرف رہا۔ تاکہ ان کی تربیت، حمایت اور آگاہی میں اضافے کے کام کو عملی جامہ پہنایا جاسکے۔ نیز ان کو ایک مضبوط عوامی قوت بنانے، ان کے دائرے کو وسعت دینے اور اسلامی دنیا میں ان کے فکری و معاشرتی خدوخال کو معین کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو۔

شہیدِ زندان امام موسیٰ کاظمؑ کی رحلت کے ساتھ ہی یہ (دوسرا) مرحلہ اختتام کو پہنچا اور ایک نیا مرحلہ شروع ہوا۔ جس کی ابتداء امام علی رضاؑ نے کی۔ اب شیعہ جماعت اور عوام کے درمیان اس کی جڑیں اتنی مضبوط ہوچکی تھیں کہ وہ حکومت سنبھالنے اور سیاسی عمل شروع کرنے کے قابل ہونے والی تھی۔

چنانچہ اس مرحلے میں ہم ملاحظہ کریں گے کہ شیعوں کی اجتماعی قوت اور اس کی وسعت حکمرانانِ وقت کے لئے سیاسی خطرے کی صورت اختیار کرتی جارہی تھی۔

اس مرحلے کی خاص بات یہ تھی کہ ایک طرف سے ایک رہبر کی حیثیت سے امامؑ اور آپؑ کے حامیوں (جن کو قتل و تشدد اور دربدری سے گوناگوں

مراحل سے گزرنا پڑا) کے درمیان ارتباط میں اضافہ ہوا تو دوسری جانب سے حکامِ وقت نے اپنی حیلہ گری اور سازشوں میں اضافہ کیا۔ ان سازشوں کا مقصد امامؑ کو گوشہ نشین بنانا، انہیں اپنے حامیوں کی حمایت سے محروم کرنا اور لوگوں کو ہر ممکنہ طریقے سے آپؑ سے دور کرنا وغیرہ تھا۔

امام علی ابنِ موسیٰ الرضا علیہ السلام

تمہید

امام رضا علیہ السلام کی زندگی ائمہ معصومینؑ کی تاریخ کے تیسرے مرحلے کی پہلی کڑی ہے۔ یہ مرحلہ اہلِ بیتؑ کے معتقد حلقوں کی وسعت کا مرحلہ تھا۔ مرحلہ دوم کے ائمہؑ کی کوششوں کے نتیجے میں یہ نیا مرحلہ امام رضاؑ کی زندگی میں اپنی عظمت اور وسعت کے لحاظ سے عروج کے نصف النہار کو پہنچا۔ کیونکہ اس مرحلے میں اسلامی دنیا میں امام علیؑ کے مکتبِ فکر کا مرتبہ و مقام بلند ہوا۔ جہاد کی خوگر شیعہ جماعت کا تشخص واضح ہوا اور اس کا لائحہ عمل جو اسلام کا حقیقی آئینہ دار تھا سامنے آگیا۔

یہ سارے ثمرات مرحلہ دوم کے ائمہؑ کی سوچی سمجھی اور ہم آہنگ جدوجہد کا نتیجہ تھے۔ ان اماموں کی جدوجہد کو مختلف عملی صورتوں اور مراحل سے گزرنا پڑا۔ جو یہ ہیں۔

☆ فکری و نظریاتی بیداری کے لئے منصوبہ بندی اور جدوجہد : اس کام کو ائمہ معصومینؑ نے براہِ راست انجام دیا۔ فکری آگاہی اور تعلیم و

تربیت کی ان کوششوں نے شیعہ جماعت کے تشخص کو اجاگر کیا نیز اسے فکری امتیازات، روحانی ثمرات اور اسلام کے تمام پہلوؤں کے بارے میں تعلیمات سے مزیّن کیا۔

☆ یہ دوسری کوشش، پہلی کوشش کے شانہ بشانہ رہی۔ اس سے مراد وہ کوششیں ہیں جنہیں خونِ حسینؑ اور مظلومِ کربلا کی المناک شہادت کے باعث متحرک انقلابی روح مل گئی۔ اس جدوجہد نے انقلاب کی باگ ڈور سنبھالنے اور انحرافی حالات کا سیاسی مقابلہ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

لیکن دوسرے دور کے ائمہؑ کے بس میں یہ بات نہ تھی کہ وہ مسلحانہ اقدام کا سلسلہ جاری رکھتے۔ یا خونِ حسینؑ کے نام پر امتِ مسلمہ کے انقلابی جذبات کو گرمانے کے لئے براہِ راست سرگرمِ عمل ہوتے۔ چنانچہ انہوں نے یہ تہلکہ خیز انقلابی اقدام علوی انقلابیوں پر چھوڑا جنہوں نے اپنی جانفشانیوں اور قربانیوں سے مسلمانوں کے ضمیر کو زندہ اور ان کے عزم و حوصلے کی حفاظت کرنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ تھی کہ مکمل طور پر مسلمانوں کا تشخص اور ان کا وقار ختم نہ کیا جا سکا۔

بنابرایں اہلِ بیتؑ کی رہنمائی اور قیادت میں مخلص افراد کی مدد سے تمام مسلمانوں کے اندر یہ صلاحیتیں پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔

اس قسم کی رہنمائیوں اور مدد کا واضح مشاہدہ ہم تاریخ کی متعدد نصوص میں کرتے ہیں۔ یہ اقدامات موقفِ اہلِ بیتؑ کے مرحلۂ ثانی کی صورت میں انجام پائے۔ ان میں سے بعض اقدامات کا تفصیلی تذکرہ ہم نے امام جعفر صادقؑ کے حالات میں کیا۔ قارئین وہاں رجوع کریں۔ چنانچہ اس قسم کی مدد اور رہنمائیوں

کی مثال امام جعفر صادقؑ کے اس المناک خط میں ملتی ہے جو آپؑ نے اپنے چچازاد بھائی (عبداللہ بن حسن نقب) اور محمد (نفسِ ذکیہ) اور ان کے خویش و اقارب کے نام ارسال فرمایا۔

روایت ہے کہ جب امام صادقؑ نے عبداللہ بن حسن، ابراہیم بن حسن اور ان کے باقی گھرانے کو پابندِ سلاسل دیکھا (جبکہ آپؑ مسجدِ رسول میں تشریف فرما تھے) تو آپؑ کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور آنسو آپؑ کے ریشِ مبارک کو تر کرنے لگے۔ پھر آپؑ میری (راوی کی) طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا : اے ابوعبداللہ! خدا کی قسم اب کے بعد حرمتِ دینِ خدا محفوظ نہ رہے گی۔ خدا کی قسم انصار نے رسول اللہؐ کے ساتھ اپنا وعدہ نہ نبھایا۔ حالانکہ انہوں نے عقبہ میں آپؐ کی بیعت اس بات پر کی تھی کہ وہ آپؐ اور آپؐ کی ذریت کی حمایت اسی طرح کریں گے جس طرح خود اپنی اور اپنے اہل و عیال کی۔[۱]

اسی طرح اپنے چچا زید کے بارے میں امامؑ کے قول سے بھی آپؑ کا موقف واضح ہوتا ہے۔ فرمایا :

> ”خدا! میرے چچا زید پر رحم کرے۔ اگر ان کو فتح نصیب ہوتی تو وہ اپنا حق ادا کرتے۔ انہوں نے آلِ محمد کے ”رضا“ کی طرف لوگوں کو دعوت دی اور وہ ”رضا“ میں ہوں“[۲]۔

تاریخ میں رقم یہ واضح الفاظ اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ امامؑ ان انقلابیوں کے ہمدرد تھے اور ان کی کوششوں کی قدردانی فرماتے تھے۔

آپؑ سے قبل امام سجادؑ کی روش بھی یہی رہی۔ جس کا مشاہدہ اس وقت ہوتا ہے جب محمد بن حنفیہ مختار ثقفی کے نمائندے کے ساتھ آپؑ کی خدمت

میں آئے تاکہ قیامِ مختار کے بارے میں آپؑ سے مشورہ کریں۔ اس وقت امامؑ نے ایک عمومی بیان صادر فرمایا جو فقط مختار کے ساتھ مختص نہ تھا بلکہ آپؑ کی طرف سے ہونے والی تعریف میں ہر وہ مسلمان شامل تھا جو ظالم حکمرانوں اور ان کی ظالمانہ حکومتوں کے خلاف اقدام کرے۔ تاریخ کے یہ الفاظ ہمیں بتاتے ہیں کہ حیاتِ ائمہؑ کے دوسرے مرحلے میں جیساکہ ہم نے پہلے ذکر کیا دو متوازی کام ہوتے رہے۔ ایک تو نظریاتی بیداری اور فکری تربیت کا عمل اور دوسرا امتِ مسلمہ کے انقلابی جذبے کو بیدار کرنے کے لئے شیعوں کو جہاد و مبارزہ کا نمونہ بنانا۔

دوسرے مرحلے میں ان دونوں متوازی کاموں کے جاری رہنے کی وجہ سے امام علیؑ کے مکتبِ فکر اور نظریے کو ایک ایسے عظیم مقام کے حصول کا موقع ملا جس نے عالمِ اسلام کے تمام گوشوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اس بات کی سب سے واضح علامت امتِ مسلمہ کے درمیان رونما ہونے والے وہ فکری، روحانی اور اجتماعی آثار ہیں جن کا مشاہدہ امام رضاؑ کے دور (مرحلۂ سوم کے ابتدائی حصے) میں ہوتا ہے۔

امام رضاؑ کے دور میں مکتبِ علیؑ کے شاگردوں کے ہاتھوں کئی ایک انقلابات اور تحریکوں کا وقوع عمل میں آیا۔ ان تحریکوں نے کوفہ، بصرہ، مکہ اور مدینہ سے لے کر یمن تک اسلامی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور ان تمام علاقوں میں مکتبِ امامت کا نعرہ بلند کیا۔ نیز مختلف علاقوں میں امامؑ کے نام پر حکومت تشکیل کی۔ باوجودیہ کہ بغداد عباسی خلافت کے ماتحت تھا لیکن انقلابی تحریکوں نے اسے بھی اپنی زد میں لیا اور عباسی حکومت کے لئے خطرہ پیدا کردیا۔

امام رضاؑ اور علوی تحریکیں

عباسیوں کے خلاف ہونے والی سب سے زیادہ قابلِ ذکر اور اہم شورش محمد بن ابراہیم الحسین (معروف بہ ابن طباطبا) علوی کی بغاوت ہے۔ اس بغاوت کی باگ ڈور ابوالسرایا سری بن منصور کے ہاتھوں میں تھی۔

ابنِ طباطبا مدینہ سے کوفے کی جانب روانہ ہوا تاکہ وہاں سے عباسیوں کے خلاف بغاوت کی ابتداء کر سکے۔ جب کوفیوں نے ابنِ طباطبا کو اہلِ بیتؑ کی طرف دعوت دیتے اور اس بات کا عہد کرتے دیکھا کہ آئندہ حکومت قرآن و سنتِ نبویؐ اور سیرتِ امام علیؑ کے مطابق ہوگی تو اس کے گرد جمع ہو گئے۔۳

ابنِ طباطبا نے مکتبِ علیؑ کے پیروکاروں کی عوامی طاقت کے بل بوتے پر اعلانِ جہاد کیا۔ اس بات کی حقیقت اسلامی دنیا میں ابوالسرایا کی بغاوت کے خلاف ہونے والے شدید ردِّ عمل سے معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ ابنِ طباطبا کے قیام کا پہلا ردِّ عمل یہ تھا کہ اس کے انقلابی لشکر کے سامنے عباسیوں کی طرف سے بغاوت کو دبانے کے لئے بھیجے گئے تمام لشکر شکست کھا گئے۔ وہی اہلِ کوفہ جنہوں نے امام حسینؑ کے ساتھ خیانت کی اور زید بن علیؑ کو اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں تنہا چھوڑ دیا بے مثل شجاعت کے ساتھ ابنِ طباطبا کی تحریک اور اس کے اہداف کی حمایت کرتے ہوئے مردانہ وار اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ عظیم انقلابی حمایت وفادار عوامی قوتوں کی ترقی اور اسلام کے بارے میں ان کی آگاہی و بیداری میں اضافے کی دلیل ہے۔

ابنِ طباطبا کی بغاوت کا خاتمہ ہونے کے بعد بھی اس کی طرف سے مقرر کئے گئے والی اپنے اپنے زیرِ اثر علاقوں میں حکومت کرتے رہے۔ یمن میں ابراہیم بن

موسیٰ بن جعفر نے علم بغاوت بلند کیا اور مامون کے والی کو نکال باہر کرنے کے بعد حکومت پر قابض ہوگیا۔ مکہ میں حسین بن حسن افطس نے قیام کیا' بصرہ میں زید بن موسیٰ بن جعفر نے تحریک اٹھائی۔ زید نے بصرہ میں عباسیوں اور ان کے حامیوں کے مکانات اس قدر کثیر تعداد میں جلائے کہ "زید النار" کے نام سے معروف ہوگیا۔ جب بھی کوئی سیاہ پوش (عباسی) اس کے ہاتھ لگتا وہ اسے جلا ڈالتا۔ اس نے عباسیوں کے علاوہ دیگر تاجروں کے بے شمار اموال پر بھی قبضہ کرلیا۔ آخرکار علی ابنِ سعید اس کا مقابلہ کرنے گیا۔ زید نے اس سے امان مانگی ؎۴۔ ابنِ سعید نے زید کو امان دے کر گرفتار کرلیا اور حسن ابنِ سہل کے پاس بھیج دیا۔ حسن نے زید کی گردن مارنے کا حکم دیا۔

امامؑ کی ہردلعزیزی

اس بات کے بہت سے تاریخی شواہد ملتے ہیں کہ عوام کے درمیان امامؑ کی حمایت اور ہردل عزیزی میں اضافہ ہوا۔ چنانچہ جب فضل ابنِ سہل نے کسی کو کوفہ بھیجا تاکہ وہ لوگوں سے امامؑ کی ولی عہدی کی بیعت لے تو کوفہ کے عوام نے اس بیعت سے انکار کیا' ان کا موقف یہ تھا کہ وہ امامؑ کی ولی عہدی کی نہیں بلکہ آپؑ کی خلافت کی بیعت کرنا چاہتے ہیں ؎۵۔

خود مامون اپنی حکومت کو پیش آنے والی خطرناک مشکلات میں اکثر و بیشتر امامؑ کی طرف رجوع کرتا تھا۔ علاوہ ازایں مامون نے امامؑ کو بلا کر یہ گزارش بھی کی تھی کہ آپؑ اپنے شیعوں کو حکومت کے بارے میں خاموشی اختیار کرنے کے لئے خط لکھیں۔ کیونکہ شیعہ ہر جگہ اس کی حکومت پر تنقید کرتے تھے ؎۶۔

فضل بن سہل کے قتل کے موقع پر بھی عوام کے درمیان امام رضاؑ کا مقام و مرتبہ واضح ہوا۔ کیونکہ اس کے قتل کے سلسلہ میں اس قسم کی افواہیں پھیلیں کہ یہ قتل مامون کی سازشوں کا شاخسانہ ہے۔۷ عوام یہ اطلاع پاکر جوش میں باہر نکل پڑے اور قصرِ مامونی کی طرف چل دیئے تاکہ اپنے غیظ و غضب اور جذبۂ انتقام کا اظہار کریں۔ اس وقت مامون مجبور ہوا کہ اپنے محل کے عقبی دروازے سے نکل کر قریب ہی واقع امامؑ کے گھر میں داخل ہوکر آپؑ سے مدد طلب کرے۔ اس نے امامؑ سے خواہش ظاہر کی کہ لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کریں۔ امامؑ عوام کے سامنے ظاہر ہوئے اور آپؑ کے ایک ہی اشارے سے غیظ و غضب سے بھرا ہوا مجمع منتشر ہوگیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ امامؑ کو عوام اور معاشرے کے درمیان ایک عظیم مقام حاصل تھا' اس شہر میں بھی جہاں مامون طاقت کے بل پر حکومت کر رہا تھا۔

اعلانیہ سرگرمیوں کی قیادت

مذکورہ تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے میں جس کی قیادت امام رضاؑ کے ہاتھوں میں تھی علمی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے مکتبِ علی کے وفادار عوامی حلقے بڑی حد تک وسعت اور ترقی حاصل کرچکے تھے۔ اس تحوّل اور امت کے درمیان امامؑ کے اثر و نفوذ میں اضافے نیز عظیم عوامی حمایت کے پیشِ نظر آپؑ نے غیر معمولی سرگرمیوں کی قیادت شروع کی۔ یوں آپؑ نے اپنے عہد میں رونما ہونے والی جدید تبدیلیوں سے استفادہ کیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بعض شیعہ گروہوں نے آپؑ پر تقیہ نہ کرنے کا اعتراض کیا۔ انہوں نے ہارون رشید

کے خطرے سے خبردار کرنے کے لئے آپؑ کی خدمت میں ایک وفد بھی بھیجا۔ صفوان بن یحییٰ کہتا ہے کہ جب امام موسیٰ کاظمؑ کی وفات ہوئی اور رضاؑ نے اعلانیہ سرگرمیوں کا آغاز کیا تو ہمیں آپؑ کے بارے میں خطرے کا احساس ہوا۔ ہم نے عرض کیا۔ "آپؑ ایک عظیم امر کو ظاہر فرما رہے ہیں۔ ہمیں اس ظالم سے آپؑ کے لئے خطرہ محسوس ہوتا ہے۔" فرمایا۔ "وہ اپنی کوشش میں لگا رہے گا لیکن میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا" ۸۔

نیز محمد بن سنان کا کہنا ہے کہ "میں نے ابوالحسن الرضاؑ سے ہارون کے ایامِ خلافت میں عرض کیا کہ آپؑ نے اس اقدام کے ذریعے اپنی شہرت عام کردی ہے حالانکہ آپؑ اپنے پدر کی مسند پر بیٹھے ہیں۔ ادھر ہارون کی تلوار سے خون ٹپک رہا ہے" ۹۔

کچھ دیگر افراد بھی آپؑ کے پاس آئے اور یاددہانی کی کہ "اگر آپؑ بھی اپنے آباء و اجداد کی طرح خاموشی اختیار کرتے تو بہتر ہوتا۔" اس کے علاوہ بعض لوگوں نے آپؑ کو تقیہ کی روش اپنانے پر راضی کرنے کی کوشش کی۔ اور کہا "آپؑ نے تقیہ کی مخالفت کی ہے۔ حالانکہ تقیہ آپؑ کے جد صادقؑ کا راستہ ہے۔" اس کے علاوہ آپؑ کو خطرات سے ڈرانے کی اور بھی کوششیں ہوئیں۔ جن سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ امامؑ ایک فعال کردار ادا کر رہے تھے اسی بناء پر یہ لوگ خوفزدہ ہوگئے تھے۔ کیونکہ یہ حضرات امامؑ کے وفاداروں کے اندر آنے والی مثبت تبدیلیوں، ان کی تعداد میں اضافے اور مسلمانوں کے اندر ان کے اثر و نفوذ کے بڑھنے سے بے خبر تھے۔ ان کو اس بات کا بھی علم نہ تھا کہ اب لوگ امامؑ کی اعلانیہ سرگرمیوں میں آپؑ کی بلا جھجک مدد کرنے لگے ہیں۔

متعدد تاریخی حوالوں سے ہمارے مذکورہ دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ جب امام رضاؑ نے اپنے پدرِ بزرگوار کے بعد امت کی امامت و قیادت کا بیڑا اٹھایا تو آپؑ نے دنیائے اسلام کے ایک وسیع دورے کا آغاز فرمایا۔ تاکہ وہاں اپنے حامی عناصر سے براہِ راست ملاقات فرما سکیں اور ہر مسئلے میں ان کے ساتھ گفتگو ممکن ہو۔ اپنے دورے کی ابتداء آپؑ نے مدینہ سے بصرہ کی جانب سفر سے کی۔ آپؑ کا معمول یہ تھا کہ کسی بستی میں پہنچنے سے پہلے وہاں اپنے کسی نمائندے کو بھیجتے تھے تاکہ وہ وہاں کے لوگوں کو آپؑ کی آمد کی خبر سے مطلع کردے۔ پھر جب آپؑ وہاں پہنچتے تو عوام آپؑ کے استقبال کے لئے آمادہ ہوتے تھے۔ یوں آپؑ ان کے ساتھ وسیع پیمانے پر ملاقات فرماتے اور اپنی امامت و قیادت کے بارے میں اتمامِ حجت فرمانے کے بعد لوگوں کو ہر قسم کا سوال پوچھنے کی دعوت دیتے تھے تاکہ آپؑ اسلامی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں انکے سوالات کا شافی جواب دیں۔ اس کے بعد آپؑ علماء کے ساتھ ملاقات کی خواہش فرماتے تھے۔ خواہ وہ علمِ مجادلہ و علمِ کلام کے عالم ہوں یا غیر مسلم علماء۔ تاکہ ان کے ساتھ ہر مسئلے پر کھل کر علمی گفتگو ہو سکے۔

بصرہ سے فارغ ہونے کے بعد آپؑ نے اہلِ کوفہ کو خبر بھیجی کہ آپؑ تین دن کے اندر اندر ان کے ہاں پہنچنے والے ہیں۔ وہاں بھی آپؑ اپنے لوگوں سے ملتے ہیں۔ اس کے بعد علمِ کلام و علمِ مجادلہ کے ماہرین نیز یہود و نصاریٰ کے ساتھ سوال و جواب اور علمی گفتگو کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ یہ لوگ ان دنوں اسلامی دنیا کو ایک نئے فکری "ازم" سے متعارف کرا رہے تھے۔ اسی لئے امامؑ نے ان پر توجہ دیتے ہوئے ان کی سرگرمیوں اور افکار پر نظر رکھی۔ کیونکہ ان کی

سرگرمیوں نے ترجموں اور کلامی مجادلات کے ذریعے اسلامی دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنی شروع کی تھی۔

آپؑ نے اپنے دوروں کے دوران تمام علمی حلقوں اور مکاتبِ فکر کے ساتھ ہر قسم کی کھلی گفتگو کی۔ چنانچہ محمد بن عیسیٰ یقطینی کہتا ہے۔

"میں نے اٹھارہ ہزار مسائل ایسے جمع کئے جن کے بارے میں آپؑ سے سوال ہوا اور آپؑ نے ان کا جواب دیا۔"

ابراہیم بن عباس صوری کا کہنا ہے کہ۔

"میں نے امام رضاؑ کو کبھی اس حالت میں نہیں دیکھا کہ آپؑ کسی سوال کا جواب دینے سے عاجز رہے ہوں"۔ ۱۰ا۔

آپؑ کے آباء طاہرین نے براہِ راست اس قسم کی اعلانیہ سرگرمیوں میں حصہ نہ لیا تھا۔ انہوں نے اپنے حامی عناصر سے کھلم کھلا اور براہِ راست رابطہ قائم کرنے کے لئے دورے نہیں کئے تھے۔ لیکن امام رضاؑ جس مرحلے سے گزر رہے تھے اس میں وفادار طبقے میں اضافے نیز فکری، نفسیاتی اور معاشرتی حوالے سے مسلمانوں (جو اب آگاہی کے ساتھ آپؑ کی سرگرمیوں کی حمایت کرنے لگے تھے) کے اندر مکتبِ علیؑ کے اثر و نفوذ کے پیشِ نظر آپؑ کی یہ اعلانیہ پالیسی ایک قدرتی بات تھی۔

البتہ ایک اور بات ہوئی اور وہ یہ کہ آپؑ کے کچھ اصحاب اس بات میں ناکام رہے کہ وہ ایک طرف سے اپنے آباء و اجداد کی روش پر چلنے والے امامؑ کی روش میں اس تبدیلی اور دوسری طرف سے اس جدید مرحلے کے تقاضوں کے درمیان رابطے کو سمجھ سکتے۔ اسی نہ سمجھی کی بناء پر یہ لوگ امامؑ پر اعتراضات

کرنے لگے۔

امامؑ اور مطالبہ حکومت

اپنے پدرِ گرامی کے بعد امامت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد امام رضاؑ نے عوام کے درمیان اپنے وفادار حلقوں کی توسیع اور انکی ہمہ گیر پیشرفت کے حوالے سے اس مرحلے کی خاص ذمہ داریوں کو عملی جامہ پہنایا۔ لیکن ان حامی عناصر کے ارتقاء اور امامؑ کی طرف ان کے جھکاؤ کا مطلب یہ نہ تھا کہ امامؑ حکومت پر قبضہ کرتے۔

وفادار حلقوں میں خاطر خواہ اضافے کے باوجود امامؑ اور وہ تمام لوگ جو حالات پر نظر رکھتے تھے بخوبی جانتے تھے کہ امامؑ کی تحریک ابھی حکومت سنبھالنے کی سطح کو نہیں پہنچی۔ کیونکہ جس قسم کی حکومت کے امامؑ خواہش مند تھے وہ ان لوگوں کے بل بوتے پر قائم ہونے والی حکومت سے مختلف تھی۔ بالفاظ دیگر اس دور میں عالمِ اسلام میں موجود امامؑ کی حامی قوتوں کے ذریعے آپؑ ایک (عام قسم کی) حکومت تو قائم کرسکتے تھے۔ یعنی اسی پیمانے پر جس پیمانے پر منصور اور مامون وغیرہ کی حکومت تھی یا جیسے دیگر طالبانِ حکومت اقتدار سنبھالتے ہیں۔ اس قسم کی حکومت کا حصول امامؑ کے لئے ممکن تھا۔ کیونکہ آپؑ کو وسیع پیمانے پر عوامی حمایت اور محبوبیت حاصل تھی۔ لیکن اس کے باوجود وفادار حلقوں اور انکی مذکورہ عوامی حمایت کی مقدار اس حد تک نہ تھی جس کے بل بوتے پر امامؑ اپنی مثالی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ امامؑ کے ساتھ ان کا فکری رابطہ جذباتی امنگوں پر مبنی، مبہم اور عام نوعیت کا تھا۔

بنی عباس نے اس جذباتی کیفیت سے استفادہ کیا اور اسی کے سہارے حکومت پر قابض ہوگئے۔ لیکن اس قسم کی ابتدائی عوامی حمایت اس بات کے لئے کافی نہ تھی کہ امامؑ اس کے سہارے حکومت سنبھالتے۔ چنانچہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں اور حضرت علیؑ کے حامیوں کے اکثر انقلابی اقدامات زیادہ تر خود انہی کے درمیان اندرونی اختلافات کا شکار ہو کر تتر بتر ہو جاتے تھے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے اور وہ یہ کہ یہ حامی عناصر اپنے اہداف و نظریات اور حالات کے مخصوص تقاضوں سے نابلد ہوتے تھے۔ بلکہ ان کے یہ انقلابی اقدامات جذباتیت پر مبنی ہوتے تھے۔ یعنی شناخت، بیداری اور آگاہی کی بنیادوں پر استوار نہ ہوتے تھے اور ظاہر ہے کہ فقط جذبات کے بل بوتے پر اسلام کی حقیقی بنیادوں کو مستحکم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اہداف سے مکمل آگاہی کی ضرورت تھی۔

بہرحال امام رضاؑ اس جدید مرحلے میں حکومتِ اسلامی کے قیام کے لئے راہ ہموار کر رہے تھے لیکن اپنی پسند اور اپنے منصوبے کے مطابق نہ کہ مامون کے پسندیدہ پروگرام کی روشنی میں۔ اسی لئے جب مامون نے آپؑ کو ولی عہدی کی پیش کش کی تو آپؑ نے اسے ٹھکرا دیا۔

"کتاب الارشاد" کی روایت ہے کہ مامون نے ولی عہدی کے مسئلے میں آپؑ سے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ خلافت آپ کے حوالے کردوں۔

امامؑ نے فرمایا : اے خلیفہ مجھے اس کام سے معاف رکھ کیونکہ یہ میرے بس کا نہیں۔

مامون نے کہا : تو پھر اپنے بعد آپ کو ولی عہد بناتا ہوں۔

فرمایا : اے خلیفہ مجھے اس امر سے بھی معاف رکھ۔

اس انکار پر مامون نے بطورِ تنبیہ کہا۔ "عمر ابنِ خطاب نے اپنے بعد خلافت کا فیصلہ چھ افراد پر مشتمل کمیٹی کے حوالے کیا۔ جن میں سے ایک آپؑ کے جد امیرالمومنین علی ابنِ ابی طالب تھے اور حکم دیا کہ ان میں سے جو بھی مخالفت کرے اس کی گردن اڑادی جائے۔ آپ کو میری بات قبول کرنی ہوگی۔ میں اسے ناگزیر اور ضروری سمجھتا ہوں"۔۱۱

یہ دھمکی سن کر امامؑ نے اس کا مطالبہ قبول کیا۔

یہ بھی مروی ہے کہ مامون اور امامؑ کے درمیان ایک گفتگو اور بھی ہوئی جس کے دوران مامون نے آپؑ کو خلافت کی پیش کش کی لیکن آپؑ نے انکار فرمایا۔ پھر اس نے ولی عہدی کی پیش کش کی آپؑ نے پھر بھی انکار فرمایا۔ اس وقت مامون نے کہا آپؑ ہمیشہ میرے ساتھ ایسا رویّہ رکھتے ہیں جو مجھے ناپسند ہو۔ گویا آپ میری سطوت سے بے خوف ہوگئے ہیں۔ خدا کی قسم اگر آپؑ اپنی مرضی سے ولی عہدی قبول نہ کریں گے تو میں آپ کو مجبور کروں گا اور اگر پھر بھی قبول نہ کیا تو آپ کی گردن اڑادوں گا۔۱۲

امامؑ کے بارے میں مامون کا موقف

امام رضاؑ کے ساتھ مامون کے رویے اور موقف کی تفسیر مامون کے اندر موجود نفسیاتی، نظریاتی اور اعتقادی عوامل کی روشنی میں کی جاسکتی ہے۔

مامون اس لحاظ سے منفرد حیثیت کا حامل ہے کہ وہ امام علیؑ کے مکتبِ فکر کو

مانتا اور علویوں پر مہربانی کرتا تھا۔ اس نے فدک بھی واپس کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے معاویہ پر سب و شتم کی رسم کو جاری کرنے کی کوشش کی اور اسے عوام کے لئے لازمی قرار دیا۔ اس نے یہ اعلان کرایا تھا کہ جو شخص معاویہ کا ذکر اچھے الفاظ میں کرے اس کو امان حاصل نہ ہوگی۔ اور یہ بھی کہ نبیؐ کے بعد سب سے بہتر ہستی علی ابنِ ابی طالبؑ ہیں۔ ۱۳۔

مامون کا عقیدۂ تشیع کئی ایک عوامل کا نتیجہ ہے جن سے وہ نفسیاتی طور پر ابتدائے طفولیت سے ہی متاثر رہا۔ کیونکہ اس کی تربیت کا ذمہ دار ایک شیعہ فرد تھا۔ علاوہ ازایں وہ بعد میں خراسان کے اطراف میں مقیم رہا جہاں تشیع کا رنگ غالب تھا۔

"ایک دن مامون نے اپنے مصاحبوں سے کہا : "کیا تمہیں معلوم ہے کہ مجھے تشیع کس نے سکھایا؟" جواب ملا "نہیں"۔ مامون نے کہا : ہارون رشید نے مجھے تشیع کی تعلیم دی۔ بولے وہ کس طرح؟ جب کہ ہارون رشید تو ـــــ مامون نے کہا : جب امام موسیٰ بن جعفرؑ مدینہ میں ہارون کے پاس تشریف لائے تو میں نے دیکھا کہ ہارون رشید آپؑ سے انتہائی عاجزی سے پیش آیا اور ان کی غیر معمولی تعظیم کی۔ ہارون کی اس حرکت نے میری توجہ ان کی طرف مبذول کی۔ جب خلوت ہوئی تو میں نے ہارون رشید سے پوچھا اے امیرالمومنین یہ شخص کون ہے جس کا آپ نے اس قدر احترام کیا، جس کے استقبال کے لئے کھڑے ہوگئے، اس کو صدرِ مجلس میں بٹھایا اور خود آپ اس سے نیچی جگہ بیٹھے۔ اور پھر مجھے اس کی رکاب تھامنے کا حکم دیا۔ ہارون نے

جواب دیا یہ لوگوں کا امام اور حجتِ خدا ہے' بندگانِ خدا میں اس کا خلیفہ ہے۔ میں نے پوچھا اے امیرالمومنین کیا یہ ساری صفات آپ سے مختص نہیں؟ کہا میں تو زور و قوت کے بل بوتے پر ان لوگوں کا پیشوا بنا ہوں۔ لیکن موسیٰ بن جعفر امامِ برحق ہیں۔ اے بیٹے خدا کی قسم یہ شخص رسولؐ کی جانشینی کا مجھ سے بلکہ تمام لوگوں سے زیادہ حقدار ہے۔ لیکن اے بیٹے اگر تم بھی اس امرِ حکومت میں میرے ساتھ نزاع کروگے تو تمہارا سر کاٹ لوں گا۔ کیونکہ حکومت بانجھ ہوتی ہے۔" ★

لیکن یاد رہے کہ مامون کے اختیار کردہ مذکورہ موقف (امام کو ولی عہد بنانے) کی وجہ مکتبِ تشیع سے اس کی عقیدت نہ تھی بلکہ مامون کی نظر میں بعض دیگر دنیوی اسباب و عوامل کی اہمیت اس سے زیادہ تھی جو اس کے ذاتی اور سیاسی اغراض کے حصول پر منتج ہوتے تھے۔ ان عوامل کو ہم درجِ ذیل چار اسباب کی صورت میں بیان کرسکتے ہیں۔

(۱) مامون چاہتا تھا کہ اپنی خلافت کو شرعی رنگ دے۔ نیز اسے شورش و بغاوت سے محفوظ رکھے اور استحکام بخشے۔ کیونکہ عباسی خلافت کے حامی عناصر مامون کی خلافت کو شکوک و شبہات کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنے بھائی اور قانونی خلیفہ امین کو قتل کیا اور اس کے ساتھ بدسلوکی کی

★ الملک عقیم (حکومت بانجھ ہے) ایک معروف مقولہ ہے۔ بانجھ اسے کہتے ہیں جس کی اولاد نہ ہوتی ہو۔ حکومت کو بانجھ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ سلطنت میں نسب اور رشتہ داری فائدہ نہیں دیتی۔ کیونکہ حصولِ حکومت کے لئے انسان اپنے باپ' بیٹوں' بھائیوں اور رشتہ داروں کو قتل کردیتا ہے۔ بالفاظ دیگر حکومت کے آگے رشتوں کا پاس و لحاظ نہیں ہوتا۔ (مترجم)

اس کا کٹا ہوا سر بھی مامون کے پاس لایا گیا تھا۔ ان حقائق نے عباسی اقتدار کے حامیوں کی نظر میں مامون کی خلافت کے جواز کو مشکوک بنا دیا۔ اسی بناء پر اس کی مرکزیت و قوت پر اعتماد متزلزل ہوا۔ یوں اس کی خلافت سب کے نزدیک مسلمہ نہ رہی اور مامون نے اس وقت عباسیوں کے درمیان اپنا مقام کھو دیا تھا۔

رہے حضرت علیؑ کے وفادار عوامی حلقے تو وہ عباسیوں کی خلافت کو سرے سے تسلیم ہی نہ کرتے تھے۔ ان کی نظر میں کسی بھی عباسی خلیفہ کی خلافت جائز نہ تھی۔ بنابرایں مامون اس حقیقت کو ماننے پر مجبور ہوا کہ جس خلافت پر اس کا جابرانہ قبضہ ہے اس کو بچانے کے لئے ضروری ہے کہ اسے شرعی رنگ دیا جائے۔

ان باتوں کے پیشِ نظر مامون نے امام رضاؑ سے ولی عہدی قبول کرنے کی درخواست کی۔ جب کہ خلافت امام رضاؑ کا شرعی حق تھی اور اسلامی دنیا کے بہت سارے عوامی حلقے آپؑ کو طبیعی اور شرعی طور پر خلافت کا حقدار سمجھتے تھے۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ امام رضاؑ کے حقِ خلافت و امامت پر لوگوں کا ایمان کسی ایک ہی سبب کی بنا پر نہ تھا بلکہ بعض لوگ آپؑ کی امامت کو خدا اور رسولؐ کی طرف سے منصوص ہونے کی وجہ سے مانتے تھے۔ اور کچھ لوگ اس بناء پر کہ آپؑ امام علیؑ کی اولاد میں سے ہیں یا اس لئے کہ آپؑ تمام مسلمانوں سے بہتر فرد ہیں۔

پس اپنی حکومت کو شرعی حیثیت دینے اور لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے مامون کا منصوبہ یہ تھا کہ ظاہراً خلافت سے دست بردار ہو کر اسے امامؑ

کے حوالے کرتا اور اس کے بعد امامؑ خلافت کو دوبارہ اسے لوٹا دیتے۔ یوں امامؑ کی طرف سے خلافت کا واپس لوٹانا مامون کی خلافت کو شرعی حیثیت دینے کا باعث ہوتا (جیساکہ مامون کی یہی خواہش تھی) اور اس طرح اسے خلافت کے غیر شرعی ہونے کے سوال سے نجات حاصل ہوتی۔

لیکن امامؑ نے مامون کی چال کو بھانپ لیا اور جان لیا کہ وہ آپؑ کی عوامی مقبولیت سے استفادہ کرنا اور آپؑ کے وفادار عوامی حلقوں اور ان کی سیاسی قوت کو نہایت مکّاری سے اپنے مفادات کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ مامون کا لائحہ عمل تین مقاصد پر مشتمل تھا۔

(الف) امامؑ کو اپنے اور دارالحکومت بغداد میں موجود عباسیوں کے درمیان سیاسی سودے بازی کا وسیلہ بنانا۔

(ب) اپنے اور علویوں کے درمیان بھی یہی کام انجام دینا (اور ان سے بھی اسی طرح سودے بازی کرنا)

(ج) نیز اپنے اور شیعیانِ خراسان کے درمیان یہی کھیل کھیلنا۔

جب مامون نے اپنی اس چال کو عملی جامہ پہنانا چاہا تو امام رضاؑ نے اس سے فرمایا۔

"کیا خلافت کا لباس خدا نے تمہیں پہنایا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر تمہیں حق نہیں پہنچتا کہ اسے اتار کر میرے حوالے کرو۔ اور اگر یہ خدا کی عطا کردہ نہیں تو اس صورت میں جو چیز تمہاری ہے ہی نہیں اسے تم کیونکر مجھے دے سکتے ہو؟" [۱۴]

اس کھلم کھلا گفتگو کے ذریعے امامؑ نے اس بات کو واضح کردیا کہ آپؑ

مامون کی خلافت کے شرعی جواز کا اعلان کرنا نہیں چاہتے۔ خلافت قبول کرنے سے آپؑ کے انکار کا یہ مطلب نہیں کہ آپؑ نے خلافت مامون کے حوالے کردی۔ یہی وجہ تھی کہ آپؑ کی مذکورہ بات نے مامون کے دور میں اور اس کے بعد بھی اس کی حکومت کے چہرے سے شرعی نقاب کو اتار دینے میں اہم کردار ادا کیا اور گہرے اثرات چھوڑے۔

(۲) مامون کو امام علیؑ کے مکتبِ فکر اور امام رضاؑ کے حامی عناصر نیز ان کی انقلابی تحریکوں کی طرف سے مشکلات کا سامنا تھا۔ ان کے پاس اتنی طاقت تھی جو مامون کے تخت کے لئے حقیقی خطرے کی شکل اختیار کرچکی تھی۔ یہ حامی عناصر عالمِ اسلام کے ہر خطے میں پھیلے ہوئے تھے۔ مثال کے طور پر ۱۹۸ھ میں خراسان کے اندر اٹھنے والی شیعہ تحریکوں کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہی سال ہے جس میں مامون کی خلافت کو استقلال حاصل ہوا۔ اسی طرح ۱۹۹ھ میں ابنِ طباطبا نے کوفے میں بغاوت کی (جس کا ذکر گزر چکا) ادہر حسین بن ہرش نے خراسان میں قیام کیا۔ یہ دونوں حضرات ابنِ طباطبا اور ابنِ ہرش لوگوں کو "الرضا من آل محمدؐ" کے نام سے دعوت دے رہے تھے۔ نیز زید بن موسیٰ بن جعفر نے بھی علمِ بغاوت بلند کیا۔ ان کے علاوہ دیگر انقلابات اور بغاوتوں کا ظہور عمل میں آیا۔

اس دور کے انقلابی ماحول اور حکومت کے خلاف بغاوتوں کا کسی نہ کسی شکل میں امام رضاؑ کی قیادت سے ربط ضرور تھا۔ ان تحریکوں نے مامون پر خوف و دہشت طاری کررکھی تھی اور اس کی نیندیں حرام ہوچکی تھیں۔ بنابرایں اس نے ان تحریکوں کو دبانے یا حکومت سے راضی کرنے یا اپنے آگے سرِ تسلیم خم

کرانے کے لئے نہایت عیارانہ کوششیں کیں۔ اس مقصد کے لئے اس نے یہ طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کی کہ ان لوگوں کے فکری و نظریاتی رہبر اور عظیم مثالی شخصیت کو اپنی حکومت میں ضم کر لے۔

امام رضاؑ کی ولی عہدی کا اعلان کر کے مامون بیک وقت کئی ایک مقاصد حاصل کرنے کا خواہاں تھا۔ یہ مقاصد درجِ ذیل ہیں۔

(الف) امام رضاؑ کی آزادی کو سلب کرنا، آپؑ کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھنا اور آپؑ کو اپنے وفاداروں سے جدا کرنا۔ یہ سارے مقاصد تب ہی حاصل ہو سکتے تھے جب امامؑ مرو میں (مامون کے پاس) رہتے۔

(ب) اہلِ بیتؑ کی قیادت کو مشکوک بنانا اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا کرنا کہ امامؑ نے نام نہاد تجاویز اور ولی عہدی کو کیوں قبول کیا؟ حالانکہ یہ امور مکتبِ اہلِ بیتؑ کی تعلیمات کے منافی ہیں۔

(ج) لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کر کے تختِ حکومت کو مستحکم بنانا۔ کیونکہ مامون کا خیال تھا کہ اس اقدام (قبولِ ولی عہدی) سے لوگ امامؑ کے ساتھ اپنے لگاؤ کو ترک کردیں گے اور نتیجہ کے طور پر ان کی شورشیں اور بغاوتیں خاموش ہو جائیں گی۔

(د) باغیانہ سرگرمیوں اور علویوں کے جذبات کو قابو کرنا۔

ان اغراض کا حصول تب ہی ممکن تھا جب مامون کا منصوبہ جامہ عمل پہن لیتا۔ وہ اس منصوبے کو تمام نقائص سے پاک رکھنا چاہتا تھا۔ اسی لئے اس نے ایک ایسے شخص کا روپ دھار لیا جو دل کی گہرائیوں سے اپنے بعد حکومت امام رضاؑ کے حوالے کرنے کا خواہشمند ہو۔ چنانچہ اس نے درجِ ذیل اقدامات کئے۔

☆ اپنے بھائی موتمن کو ولی عہدی سے برطرف کیا۔

☆ اپنی بیٹی امّ حبیبہ کا نکاح امام رضاؑ کے ساتھ کردیا۔

☆ عباسیوں کی علامت (سیاہ رنگ) کے بدلے علویوں کی علامت (سبز رنگ) کو اپنایا۔

☆ بنی عباس، اپنی حکومت کے سرکردہ افراد اور فوج کے عمائدین کو امامؑ کی بحیثیت ولی عہد بیعت کرنے کا حکم دیا۔

☆ امام رضاؑ کے نام پر سکّے ڈھالے۔

لیکن امامؑ نے ثابت کردیا کہ آپؑ ان سازشوں کے جال میں پھنسنے والے نہیں۔ امامؑ نے اس سازش کے مقابلے میں جو جوابی اقدامات کئے ان میں سے قابلِ ذکر اور اہم اقدامات کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

(الف) امامؑ نے روزِ اول ہی سے اس کے اس منصوبے کو مسترد کیا اور مامون کے دلی ارادوں کو خود اس کے سامنے فاش کیا۔ آپؑ نے مامون سے فرمایا۔

"تم یہ چاہتے ہو کہ لوگ کہیں کہ علی بن موسیٰ نے دنیا کو نہیں چھوڑا تھا بلکہ دنیا نے اس کو چھوڑ رکھا تھا اسی لئے اس نے (موقع ملتے ہی) دنیا کی طمع اور خلافت کے لالچ میں ولی عہدی کو قبول کیا"۔۱۵۔

امامؑ کا مامون کی حکومت میں شامل ہونے سے انکار اور اس سلسلے میں آپؑ کا واضح اعلان اسی لئے تھا کہ امامؑ مامون کے ارادوں سے واقف تھے۔ چنانچہ جب اس نے آپؑ کو ولی عہدی قبول کرنے کے لئے مجبور کردیا تو آپؑ نے اس کے اجبار کو مخفی نہ رکھا اور اعلان کیا کہ آپؑ نے ولی عہدی اپنی مرضی سے قبول نہیں کی۔ بلکہ جبر و اکراہ اور (موت کی) دھمکی کے نتیجے میں حامی بھری ہے۔

"ہروی" سے منقول ہے کہ۔

"واللہ رضاؑ نے اپنی مرضی سے یہ اقدام نہیں کیا۔ بلکہ آپؑ کو مجبور کر کے کوفہ اور پھر وہاں سے بصرہ کے راستے مرو لے گئے"۔١٦

روایت ہے کہ جب مامون نے امامؑ کو خلافت کی پیش کش کی لیکن آپؑ نے اسے قبول نہ کیا۔ اس کے بعد ولی عہدی پیش کی لیکن آپؑ نے پھر بھی انکار کیا تو مامون نے امامؑ سے کہا :

"آپؑ کا رویّہ میرے ساتھ ہمیشہ ایسا رہا ہے جو مجھے پسند نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ میری قوت و سطوت سے بے خوف ہو گئے ہیں۔ خدا کی قسم اگر آپؑ ولی عہدی کو قبول کر لیں تو بہتر ورنہ اس پر مجبور کروں گا اور اگر پھر بھی قبول نہ کریں گے تو آپ کی گردن اڑا دوں گا"۔١٧

"ابو الفرج" نے بھی قریب قریب یہی بات نقل کی ہے اور کہا ہے۔

"ان دونوں نے آپؑ سے ولی عہدی قبول کرنے کے لئے کہا۔ اور برابر اصرار کرتے رہے لیکن آپؑ انکار فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ ان دونوں میں سے ایک نے کہا : اگر آپؑ خود قبول کریں تو بہتر ورنہ ہم آپؑ کے ساتھ راست اقدام کریں گے۔ اس نے آپؑ کو دھمکی دی۔ اس کے بعد ان دونوں میں سے ایک نے کہا : خدا کی قسم مجھے حکم ہوا ہے کہ بات نہ ماننے کی صورت میں آپ کی گردن اڑا دوں"۔١٨

ادھر امامؑ مدینہ سے نکلتے وقت سے ہی بلکہ ولی عہدی کے اعلان تک صریح الفاظ میں ولی عہدی سے اپنی نارضایتی کا اظہار فرماتے رہے۔ جن صریح بیانات کے ذریعے آپؑ نے یہ اظہار فرمایا، ان سے آپؑ کے اندرونی دکھ اور کرب کی

نشاندہی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ آپؑ کے بعض تاثرات (جو آپؑ کی اندرونی بے چینی کے غماز تھے) سے بھی آپؑ کے موقف کا علم ہوتا ہے۔

"جب امام رضاؑ جمعہ کے دن مسجدِ جامع سے لوٹے تو آپؑ کو پسینہ آرہا تھا اور آپؑ گرد و غبار میں اٹے ہوئے تھے۔ اس حالت میں آپؑ نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے اور یوں دعا مانگی۔

خدایا! اگر اس حالت سے میری نجات کا راستہ موت ہے تو میری موت میں تعجیل فرما۔

چنانچہ آپؑ نے اپنی رحلت تک مسلسل کرب کی حالت میں زندگی گزاری" ۱۹ے۔

واضح ہے کہ لوگ آپؑ کے اس غم و الم اور کرب سے خود نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں۔

(ب) امامؑ نے اپنی تحریر کردہ تاریخی دستاویز کے ذریعے مامون کے ساتھ یہ شرط رکھی کہ۔

"آپؑ کسی قسم کے سرکاری اختیارات استعمال نہ کریں گے، نہ کسی امر کا فیصلہ دیں گے، نہ کسی کو منصوب کریں گے اور نہ کسی کو معزول۔"

مامون بعض اوقات اس شرط کو بھول جاتا اور آپؑ کو بعض امور کی ادائیگی پر مجبور کرنا چاہتا تھا۔ لیکن امامؑ اس کو مذکورہ شرط یاد دلا کر انکار فرمادیتے تھے۔

جب امامؑ ولی عہدی قبول کرنے پر مجبور ہوئے تو مامون سے فرمایا۔

"میں اسے قبول کرتا ہوں بشرطیکہ نہ کسی کو کسی عہدے پر منصوب کروں گا اور نہ کسی کو معزول کروں گا اور نہ کسی رسم کو توڑوں گا۔ بلکہ دور

سے حکومت کا خاموش تماشائی بنا رہوں گا۔"

مامون ان شرائط پر راضی ہوگیا۔۲۰

ایک مرتبہ مامون نے آپؑ کو پھر ذمہ داریوں میں پھنسانے کی کوشش کی اور آپؑ سے ایسے افراد کی نشاندہی کی درخواست کی جن پر آپؑ کو اعتبار ہو۔ تاکہ ان کو بعض ایسے علاقوں میں والی مقرر کرسکے جو مامون کی حکومت کے خلاف ہوگئے تھے۔ امامؑ نے یوں جواب دیا۔

"تم میرے ساتھ اپنا وعدہ پورا کرو۔ میں تمہارے ساتھ اپنا عہد نبھاؤں گا۔ میں نے ولی عہدی کو اس شرط پر قبول کیا ہے کہ میں نہ حکم دوں گا نہ منع کروں گا' نہ کسی کو نصب کروں گا نہ عزل اور نہ کسی کو مجبور کروں گا۔ یہاں تک کہ خدا مجھے تجھ سے قبل بلالے۔"

یہ سن کر مامون نے آپؑ سے عرض کیا: میں اس وعدے کو نبھاؤں گا۔۲۱

پس امامؑ کی طرف سے عدم تعاون کی یہ پالیسی امت کے لئے ایک اشارہ بلکہ صریح دعوت تھی کہ وہ امامؑ کے مشن کو پہچانیں' آپؑ کے گرد جمع ہوں اور اس فاسد و ظالم حکومت کی حمایت ترک کریں جس کی تبدیلی ضروری تھی۔

ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ اس وقت کے سیاسی نظام سے مکمل طور پر ناخوش تھے۔ اسی لئے آپؑ نے اس نظام کے تحت کسی قسم کے سیاسی اختیارات سے کام نہ لیا۔ آپؑ اس فاسد نظام کو گرا کر نئے سرے سے ایک (صالح) نظام کی تعمیر کو ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ آپؑ ابتداء ہی سے مامون کی حکومت اور اس کے شرم آور کاموں سے بیزاری کا اعلان فرماتے رہے اور یہ بھی ظاہر کرتے رہے کہ آپؑ ایک ایسے نظام کے تحت کام نہیں کرسکتے جس کی

بنیادوں کو گرانے کی ضرورت ہو۔

جب مامون کے سارے جتن اکارت گئے تو اس نے فضل بن سہل کو لاکھوں دینار دے کر کوفہ (جہاں امامؑ کے حامیوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی) بھیجا تاکہ لوگوں سے مامون کی بیعت لے کیونکہ ابھی تک پورے عالمِ اسلام میں مامون کی باقاعدہ بیعت نہیں ہوئی تھی۔ یوں دولت کے بل بوتے پر مامون کی خلافت اور امام رضاؑ کی ولی عہدی کے لئے بیعت کی کوشش ہوئی تاکہ دربارِ خلافت کے لئے امامؑ کے وفاداروں کی حمایت حاصل ہوسکے. لیکن امامؑ کے حامیوں نے اس چال کی مخالفت کی اور یہ موقف اختیار کیا کہ وہ امامؑ کی بحیثیت ولی عہد نہیں بلکہ بحیثیت خلیفہ بیعت کریں گے۔ بنابرایں امامؑ کے حامی حلقے بھی ولی عہدی کے مسئلے میں اپنے موقف سے آگاہ تھے۔ اسی لئے بیعت کو رد کیا۔

جب مامون نے دیکھا کہ وہ ان لوگوں کو نہ مال کے ذریعے خرید سکتا ہے اور نہ مکر و حیلہ گری کے ذریعے انہیں رام کرسکتا ہے۔ تو اس نے امامؑ سے درخواست کی کہ اپنے شیعوں کو خاموشی اختیار کرنے کے لئے خطوط لکھیں۔ امامؑ کے سامنے اس کی خواہش کو رد کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ لہٰذا آپؑ نے مامون سے کہا کہ کیا وہ اس تحریری شرط کی پامالی کا خواہاں ہے؟ مامون نے عرض کیا وہ شرط کیا ہے؟ فرمایا میں نے تیرے ساتھ یہ شرط رکھی تھی کہ میں کسی مسئلے میں نہ کچھ لکھوں گا اور نہ مسائل کے حل و عقد کے سلسلہ میں کچھ کروں گا۔ بنابرایں میں خطوط نہیں لکھوں گا۔۲۲

یوں امامؑ نے اپنے حامیوں کو کسی قسم کا خط لکھنے سے صریحاً انکار فرمایا۔

(۳) مامون جانتا تھا کہ حکومت میں شمولیت کے باوجود امام رضاؑ کے لئے

حکومت کی اصلاح اتنی جلدی ممکن نہیں۔ کیونکہ سرکاری مشینری ایک ایسے عظیم انحراف کا شکار تھی جس میں پوری امت مبتلا تھی۔ اور اس انحراف کا علاج ایک دو دن میں ممکن نہ تھا۔

در حقیقت مامون کے نزدیک امامؑ کو حکومت میں شامل کرنے کا مقصد آپؑ کی شہرت کو داغدار کرنا تھا۔ اس کے علاوہ وہ امامؑ کے طرفداروں پر یہ بھی ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ امامؑ مصلح کے روپ میں ایک سوداگر ہیں اور آپؑ کے پاس کوئی ٹھوس لائحہ عمل نہیں۔ یوں مامون آلِ علیؑ کی قیادت کے بارے میں لوگوں کی آرزوں پر پانی پھیرنے کا خواہشمند تھا۔ اس بات کے پیشِ نظر امامؑ نے دفاعی حکمتِ عملی اپناتے ہوئے سرکاری ٹولے کے ساتھ عدم تعاون کا اعلان فرمایا اور مامون کے ساتھ کسی قسم کا تعاون کرنے سے مسلسل انکار فرماتے رہے۔

اس مقام پر بعض متعصب محققین کا نکتہ نظر ملاحظہ کیجئے کہ وہ امامؑ کے موقف کا جائزہ کس قدر سطحی نظر سے اور شیعہ نظریات کے مقابلے میں تعصب و عناد کی عینک پہن کر لیتے ہیں۔ چنانچہ احمد امین کہتا ہے۔

"علوی اماموں کا ہمیشہ یہ دعویٰ ہے کہ اگر رعایا کے امور کی باگ ڈور انکے ہاتھ آجائے تو وہ مکمل عدل کے ساتھ حکومت چلائیں گے۔ حالانکہ دعوے اور حقیقت کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔ مامون کو بھی اسی کی شکایت تھی۔ کیونکہ وہ دیکھتا تھا کہ یہ ائمہ لوگوں کی نظروں سے چھپتے پھرتے ہیں، پوشیدہ طور پر گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں لیکن لوگ ان کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ اسی لئے مامون نے بہتر سمجھا کہ ان اماموں کی حقیقت لوگوں پر عیاں ہو جائے اور ان کی لغزشیں آشکار

ہوں۔ یوں لوگ ان کے تقدس کے اس قدر قائل نہ رہیں۔

مامون جانتا تھا کہ اگر یہ حضرات عملی زندگی کے اسٹیج پر ظاہر ہوں اور لوگ ان کے طرزِ حکومت سے آگاہ ہوں اور ان کو معلوم ہو کہ یہ (ائمہ) کس طرح (نعوذ باللہ) محرماتِ الٰہی کا ارتکاب کرتے ہیں تو وہ لوگوں کی نظروں سے گر جائیں گے۔ لیکن اگر وہ یونہی حکومت کے خوف سے چھپ کر تبلیغ کرتے رہیں تو لوگوں کا لگاؤ بدستور ان کے ساتھ رہے گا۔ اسی لئے مامون نے علی الرضاؑ کو اپنے بعد ولی عہد بنانے کا ارادہ کیا۔ ۲۳۔

(احمد امین کے یہ جملے) یارانِ نکتہ داں کے لئے مقامِ تامل ہے۔

(۴) امامؑ کو اپنے حامیوں سے الگ تھلگ رکھنے، آپؑ کو سرکاری مشینری میں ضم کرنے اور ایک مضبوط چار دیواری میں محصور کرکے آپؑ کا رابطہ لوگوں سے منقطع کرنے بالفاظ دیگر عباسی خلافت کے سائے تلے شیعی تحریک کا نام ونشان مٹا دینے کے لئے مامون کی کوششوں میں اس اقدام کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔

----- ☆ -------☆ -----

ائمہؑ کی پالیسیوں کے تیسرے مرحلے کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس مرحلے میں اماموں کو اپنے حامیوں سے دور رکھنے کی کوششیں ہوئیں۔ چنانچہ حکامِ وقت نے امام رضاؑ، امام محمد تقیؑ، امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ کو زیادہ تر اپنے حامیوں سے دور اور سیاسی گوشہ نشینی میں رکھا۔

حکمرانوں کے پاس ائمہؑ کو لوگوں سے علیحدہ رکھنے اور ان کے خطرات سے نجات حاصل کرنے کے دو عام طریقے تھے۔

پہلا طریقہ

یہ کہ ان کو زندانوں میں قید کر کے کسی خاص مقام پر جبراً محصور رکھا جائے (جیسا کہ امام موسیٰ کاظمؑ کے ساتھ ہوا)۔ یا یہ کہ اذیت و دہشت کی فضا میں ان کو وہاں نظر بند رکھا جائے جہاں خلیفہ کا قیام ہو۔ چنانچہ بنی عباس نے ائمہؑ کو مسلسل نگرانی میں رکھا۔

روایت ہے کہ جب امام رضاؑ مدینہ سے فارس تشریف لے جا رہے تھے تو آپؑ کے ساتھ ایک خادم تھا۔ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک دین فروش اور بے ضمیر انسان تھا جو حکام کی طرف سے امامؑ کی نقل و حرکت اور لوگوں کے ساتھ آپؑ کے روابط کی خبر پہنچانے پر مامور تھا۔

امامؑ کو اپنے حامیوں سے دور رکھنے کے لئے مامون اور بھی بہت سے منصوبوں پر عمل کر رہا تھا۔ امامؑ کی حرکات پر کڑی نظر رکھنے اور آپؑ کا رابطہ دنیائے اسلام میں پھیلے ہوئے آپؑ کے وفاداروں سے منقطع کرنے کے لئے مذکورہ خادم نے اہم کردار ادا کیا۔

دوسرا طریقہ

اماموں کو حکومتی مشینری سے منسلک کر کے ان کی سرگرمیوں کا خاتمہ کرنا۔ جیسا کہ امام رضاؑ، امام محمد تقیؑ اور امام علی نقیؑ کے ساتھ ہوا۔

امامؑ کی طرف سے وسیع پیمانے پر سرگرمیوں کے آغاز اور اپنے حامیوں کے ساتھ روابط قائم کرنے کے بعد وقتی طور پر مامون امام رضاؑ کو اپنے حامیوں سے جدا کرنے میں کامیاب ہوا۔

ان جدید حالات کی بناء پر امامؑ اپنے لوگوں سے کسی قسم کا رابطہ برقرار نہ رکھ سکے۔ جب کہ آپؑ کو ان کے ساتھ روابط رکھنے کی اشد ضرورت تھی تاکہ ان کی فکری آگاہی اور مکتبِ علیؑ کے ساتھ ان کے لگاؤ میں اضافہ کر سکیں۔

امامؑ نے کیوں خلافت قبول نہ کی؟

امام رضاؑ کے بارے میں بحث و گفتگو کے آخر میں یہاں یہ سوال ذہن سے گزرتا ہے کہ جب مامون نے خلافت کی پیش کش کی تو امامؑ نے اسے قبول کیوں نہ کیا؟ کیا یہ آپؑ کے پسندیدہ اصولوں اور اقدار کو عملی شکل دینے کا مناسب موقع نہ تھا؟ آپؑ نے کس بناء پر یہ موقع گنوایا؟

اس سوال کا جواب ہم درجِ ذیل نکات کی صورت میں دیں گے۔

☆ جب مامون نے خلافت کی پیش کش کی تو امامؑ کی نظر میں وہ قابلِ اعتماد نہ تھا۔

☆ اگر آپؑ زمامِ خلافت ہاتھ میں لیتے تو آپؑ کے اوپر پورے عالمِ اسلام کے امور کو چلانے کی ذمہ داری عاید ہو جاتی۔ اور اس کام کے لئے ایک آگاہ و بیدار طبقے کی ضرورت تھی۔ جو اسلام کے نظامِ حیات کی تمام جزئیات کو مکمل اخلاص اور امانت داری کے ساتھ نافذ کرنے کا اہل ہوتا۔ امامؑ بھی ایسے ہی لوگوں کا طبقہ تیار کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ ادہر اگرچہ امامؑ کے حامی گرم ترین جذبات سے سرشار تھے لیکن وہ اس درجے کو نہیں پہنچے تھے کہ آپؑ کے مشن سے گہری اور صحیح معنوں میں آگاہی کے حامل کہلائے جا سکتے۔ امامؑ کو (درحقیقت) فقط

ظاہری تبدیلی مقصود نہ تھی بلکہ اصل ضرورت ایسی داخلی تبدیلی اور اصلاح کی تھی جو مخلصانہ آگاہی و بیداری کی بنیادوں پر استوار ہو۔

کیا امامؑ کے لئے یہ ممکن تھا کہ آپ کرپشن اور انحراف کی منہ بولتی تصویر عباسی بیوروکریسی اور سرکاری مشینری کا سہارا لیتے؟ اور ان کے ذریعے احکامِ اسلام کے نفاذ کی امید رکھتے؟

ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال کسی صورت قابلِ قبول اور معقول نہیں ہو سکتی۔

رہا آپؑ کا ولی عہدی قبول کرنے کا مسئلہ تو (جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا) یہ ایک اختیاری کام نہ تھا۔ بلکہ یہ امر جبرو اکراہ اور پُر اسرار سیاسی دباؤ کے تحت آپؑ پر تھونپا گیا۔ امام رضاؑ نہایت کرب اور دکھ کے ساتھ اس مصیبت کو جھیلتے رہے۔ کیونکہ آپؑ کو علم تھا کہ مامون کا مقصد (امامؑ اور آپؑ کے حامیوں کی حمایت حاصل کرکے) پُر آشوب حالات کے ہاتھوں گرتے ہوئے اپنے اقتدار کو دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا کرنا تھا۔ ۲۴۔

ولی عہدی کا کھیل مامون نے بعض سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے کھیلا تھا۔ اس کھیل پر حکومت کے کئی ایک مسائل کا حل موقوف تھا۔ وہ امامؑ کے ساتھ اپنے رویے میں مخلص نہ تھا۔ وہ تو محض ایک وقتی اقدام تھا جسے وہ نہایت ہوشیاری اور ذہانت سے انجام دینا چاہتا تھا تاکہ مطلوبہ مقاصد آسانی سے حاصل کئے جا سکیں۔ ۲۵۔

امام رضاؑ کو وطن سے دوری اور پابندیوں کی تلخیاں جھیلنا پڑیں۔ آپؑ کو ایک خاص قسم کی پابندی اور نظر بندی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ نظر بندی زندان کی

سلاخوں کے پیچھے اس طرح نہ تھی جس طرح ہارون رشید نے امام موسیٰ کاظمؑ کو قید رکھا تھا۔ بلکہ آپؑ پُرشکوہ محلات میں خادموں اور نوکروں کی ایک جماعت کی معیت میں نظر بند تھے جو دراصل مامون کے جاسوس تھے اور تازہ ترین خبروں سے دربارِ خلافت کو مطلع کرتے اور امامؑ کے پیروکاروں کو آپؑ سے ملنے نہیں دیتے تھے۔

امام رضاؑ مامون کے ساتھ نہایت سخت گیر تھے۔ ایک بار آپؑ مامون کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ وہ وضو کر رہا ہے اور ایک نوکر اس کے ہاتھوں پر وضو کا پانی ڈال رہا ہے۔ امامؑ نے اس سے فرمایا۔

"لا تشرک بعبادۃ ربک احدا"

"اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کر۔"

آپؑ مامون کے ساتھ اسی قسم کی بے باکانہ اور دوٹوک روش اپنائے رکھتے اور اس کے بہت سے کاموں پر تنقید فرماتے تھے۔ مامون بھی بظاہر آپؑ کی نصائح کو قبول کرتا تھا۔ لیکن آپؑ کے خلاف کینہ وعداوت اس کے دل میں پوشیدہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب مامون نے مرکزِ خلافت کو "مرو" سے "بغداد" منتقل کرنے کا فیصلہ کیا اور اس ارادے سے بغداد کی طرف روانہ ہوا تو اس دوران امامؑ کو زہرِ دغا سے شہید کردیا۔ اس طرح اس نے عباسیوں کے ساتھ اپنی صلح کی قیمت ادا کی۔ اور امام رضاؑ اسلام کی سربلندی کے لئے ہر قسم کی جدوجہد کرنے کے بعد دارِ فانی سے کوچ فرما گئے۔

مصادر و ماخذ

۱۔ الامام الصادق از رمضان لاوند۔ ص۹۰ بہ نقل از مقاتل الطالبین

۲۔ اعیان الشیعہ۔ ج۳۳۔ ص۷۳

۳۔ عیونِ اخبار الرضا۔ ج۲۔ ص۲۰۸

۴۔ تاریخِ ابنِ اثیر۔ ج۵۔ ص۱۷۵۔۱۷۷ نیز عیونِ اخبار الرضا۔ ج۲۔ ص۲۳۳

۵۔ عیونِ اخبار الرضا۔ ج۲۔ ص۱۴۱

۶۔ عیونِ اخبار الرضا۔ ج۲۔ ص۱۴۱

۷۔ تاریخِ طبری۔ ج۸۔ ص۵۸۵ نیز عیونِ اخبار الرضا۔ ج۶۔ ص۱۰۹

۸۔ الکافی۔ ج۱۔ ص۸۷۔ نیز عیونِ اخبار الرضا اور المناقب اور الارشاد

۹۔ روضۃ الکافی۔ ص۲۵۷

۱۰۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ حدیث سلسلہ الذہب در فصول مہمہ از ابنِ صباغ مالکی

۱۱۔ کتاب الارشاد از شیخ مفید۔ ص۲۹۰ نیز مقاتل الطالبین از اصفہانی۔ ص۲۷۵

۱۲۔ مقاتل الطالبین۔ ص۳۷۵

۱۳۔ علل الشرائع از شیخ صدوق۔ ج۱۔ ص۲۶۶

۱۴۔ عیونِ اخبار الرضا

۱۵۔ علل الشرائع از شیخ صدوق۔ ج۱۔ ص۲۶۶

۱۶۔ عیونِ اخبار الرضا۔ ج۲۔ ص۱۴۱

۱۷۔ علل الشرائع۔ ج۱۔ ص۲۶۶

۱۸۔ مقاتل الطالبین۔۔ ص۳۷۵ نیز کتاب الارشاد۔ ص۲۹۱

۱۹۔ عیونِ اخبار الرضا۔ ج۲۔ ص۱۴۱

۲۰۔ علل الشرائع۔ ج۱۔ ص۲۲۶

۲۱۔ عیونِ اخبار الرضا۔ ج۲۔ ص۱۶۷

۲۲۔ علل الشرائع۔ ج۱۔ ص۲۲۶

۲۳۔ سلسلۂ اقراء المہدی المہدویہ۔ ص۶۱۔۶۲ از احمد امین

۲۴، ۲۵۔ الامام الرضاؑ تاریخ و دراسہ از محمد جواد فضل اللہ۔ ص۱۰۴

امام محمد تقی الجواد علیہ السلام

امام محمد تقی الجوادؑ کی زندگی آپؑ کے والدِ گرامی امام علی رضاؑ کی پالیسیوں کو جاری رکھنے میں گزری۔ اس حقیقت کا اظہار آپؑ کے بارے میں مامون کی ذاتی دلچسپی نیز آپؑ کو دربارِ خلافت سے مربوط رکھنے کی اس کی کوششوں اور سازشوں سے ہوتا ہے۔ مامون نے یہ سازشیں شیعہ تحریک کو ختم کرنے اور نتیجہ کے طور پر امامؑ کو اپنے حامیوں سے جدا کرنے کے لئے جاری رکھیں۔ تاکہ امامؑ اپنے حامیوں کو حرکت میں نہ لا سکیں۔ خاص کر ان حالات میں جب کہ آپؑ ظاہراً مامون کے شاندار محلات میں عزت و اکرام سے زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن درحقیقت محل کے اندر امامؑ کی شدید نگرانی ہو رہی تھی اور آپؑ کی ہر ہر حرکت پر حکومت کی کڑی نظر تھی۔

اسی لئے مامون نے اپنی پرانی چال چلتے ہوئے خود کو امامؑ کا ہمدرد اور محب ظاہر کیا۔ اس نے اپنی بیٹی "ام الفضل" کی شادی امام سے کرادی ۔۱۔ تاکہ امامؑ کی حتمی تائید حاصل کرسکے۔ نیز آپؑ سے دارالخلافہ میں رہنے کی درخواست کی۔ لیکن امام جوادؑ مدینہ واپسی پر مصر رہے تاکہ مامون کی جانب سے اپنی غاصبانہ حکومت کے لئے آپؑ کی تائید حاصل کرنے کی چال کو خاک میں ملادیں۔

امامؑ کا یہ اقدام آپؑ کی طرف سے مامون کی خلافت کا انکار اور دوسروں کے لئے یہ اشارہ تھا کہ مامون کی حکومت ناجائز ہے۔ علاوہ ازایں یہ امر آپؑ کی امامت کا اثبات نیز آپؑ کے اہداف اور حکومت کے مقاصد میں مغایرت و اختلاف کی دلیل تھا۔ اگر امامؑ مامون کے ساتھ دربارِ خلافت میں رہنا قبول فرماتے تو گویا یہ بات دونوں کے لائحہ عمل میں اتحاد و ہم آہنگی سے عبارت ہوتی۔ اور لوگ یہ سمجھتے کہ ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ یوں امامؑ کا لائحہ عمل فکری و نظریاتی سطح پر اپنی امتیازی خصوصیات (جو منحرف حکام کے لائحہ عمل میں موجود نہ تھیں) سے محروم ہو جاتا۔

فکری منصوبہ بندی اور نظریات و عقائد کے حوالے سے لوگوں میں بیداری و آگاہی پیدا کرنے میں آپؑ اپنے والد کی روش پر گامزن رہے۔ چنانچہ مدینہ میں آپؑ کے پاس بغداد اور دیگر شہروں سے فقہاء و علماء جمع ہوتے تھے تاکہ اپنے مسائل آپؑ سے دریافت کریں اور آپؑ سے ہدایت و رہنمائی حاصل کریں۔ چنانچہ جب حج کا موقع آیا تو بغداد اور دیگر مقامات سے اسی (۸۰) علماء و فقہاء جمع ہو کر حج پر گئے اور وہاں سے واپسی پر ابو جعفر (امام محمد تقیؑ) سے ملنے کے لئے مدینہ کا رخ کیا ۔۲۔

امامؑ عوام کے درمیان اپنے حامیوں کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے اپنی عظیم مجاہدانہ ذمہ داریوں پر عمل پیرا تھے۔ یہاں تک کہ خلیفہ معتصم کو بھنک پڑ گئی۔ اس نے امامؑ کو طاقت کے زور پر بغداد بلایا۔ تاکہ زہر دے کر آپؑ کا کام تمام کیا جاسکے۔ چنانچہ ابنِ بابویہ کہتے ہیں کہ آپؑ کو معتصم نے زہر دیا ۔۳۔

امامؑ حکومت کے لئے خطرہ بن گئے تھے۔ کیونکہ آپ حکمران طبقے کی بے راہ

روی اور اسلام سے دوری کو بَرملا فرماتے تھے۔ فقط یہی نہیں بلکہ کم سنی کے باوجود آپؑ کی علمی و فکری برتری اور منزلت کا سب کو علم تھا۔ آپؑ کا اپنے دور کے فقیہوں اور قاضیوں کو چیلنج دینا اس بات کی دلیل ہے کہ آپؑ امت کے فکری و نظریاتی امور کی نگہبانی کررہے تھے اور اس سلسلے میں مصروفِ عمل تھے۔ چنانچہ ایک مجلس میں آپؑ سے تیس ہزار سوالات کئے گئے اور آپؑ نے ان سب کا جواب دیا۔ جب کہ اس وقت آپؑ کی عمر صرف نو سال تھی۔ ۴۔

شیخ مفید کا کہنا ہے۔

"جب مامون نے دیکھا کہ آپؑ علم و فضل، حکمت و ادب اور عقل میں منزلِ کمال پر فائز ہیں اور زمانے میں کوئی آپؑ کی برابری کرنے والا نہیں تو وہ آپؑ کا دلدادہ ہوگیا۔"

طبری نے اعلام الوریٰ میں کہا ہے۔

"آپؑ کم سن ہونے کے باوجود اپنے زمانے میں علم و فضل اور حکمت و ادب کے اس مرتبہ پر فائز ہوچکے تھے جہاں بزرگان و اشراف اور روساء میں سے کوئی فرد پر بھی نہ مار سکتا تھا"۔ ۵۔

امام جوادؑ کی فعالیت اور آپؑ کے لائحہ عمل کے بارے میں ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کیونکہ آپؑ نے جو کردار ادا کیا وہ آپؑ کے والدِ بزرگوار امام رضاؑ کے کردار ہی کی مانند تھا۔

یہاں ہم امامؑ کی زندگی کے ایک معجزانہ پہلو پر بحث کریں گے جس کے بارے میں بہت لے دے ہوئی ہے اور مختلف قسم کے سوالات اور اقوال اس سلسلے میں موجود ہیں اور وہ پہلو ہے کم سنی اور بچپنے میں آپؑ کا امامت و قیادت کی

ذمہ داریاں سنبھالنا جبکہ آپؑ کی عمر صرف آٹھ سال تھی۔

امامؑ کی کم سنی

امام جوادؑ کی کم سنی کا معاملہ آپؑ کے معجزات میں سے ایک ہے۔ اس دور کے حکمرانوں پر اس مسئلے کا زبردست اثر تھا۔ تاریخی ماخذ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب امام جوادؑ کے پدرِ گرامی امام رضاؑ کی رحلت ہوئی تو آپؑ کی عمر آٹھ سال یا بقولے سات سال چار ماہ تھی۔[۶] اور آپؑ نے بچپنے میں ہی امامت کا عہدہ سنبھالا۔

تاریخِ ائمہؑ میں یہ انوکھا مسئلہ پہلی بار امام جوادؑ کے معاملے میں دیکھنے میں آیا۔ یہ امر ظالم حکمرانوں کے لئے ایک کھلا چیلنج اور اہلِ بیتؑ کی امامت و قیادت کے تسلسل کی واضح اور معجزانہ سند تھی۔ اگر ہم "قانونِ احتمالات"★ کے حساب سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ آپؑ کی کم سنی بذاتِ خود آپؑ کی امامت کی اطمینان بخش دلیل ہے۔ وگرنہ تمام نظریاتی و عملی میدانوں میں آپؑ کی جانب سے شیعوں کی قیادت کیسے معقول ہو سکتی ہے؟

ممکن ہے یہ سوال کسی کے ذہن سے گزرے کہ شاید اس کم سن بچے کی امامت کا مسئلہ شیعوں کے لئے اچھی طرح واضح ہی نہیں ہوا۔ نیز ممکن ہے کہ مذکورہ سوال کے ساتھ ساتھ یہ گمان بھی کیا جائے (جیساکہ احمد امین کا کہنا ہے) کہ "شیعوں کے ائمہ لوگوں کی نظروں سے چھپتے پھرتے تھے۔ اور خفیہ تبلیغ و دعوت پر اکتفا کرتے تھے تاکہ لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کر سکیں"۔[۷]

★ کسی چیز کے بارے میں احتمالات کی کثرت کے مطابق مثبت یا منفی فیصلہ کرنے کا اصول۔ (مترجم)

اس بے بنیاد اعتراض کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ امام جوادؑ کی قیادت تمام لوگوں کے سامنے برملا اور اعلانیہ قیادت تھی۔ ہمارے کسی بھی امامؑ کی قیادت ایک لمحے کے لئے بھی پولیس یا فوج کی حفاظت یا سطوتِ سلطانی کے حصار میں محصور قیادت نہیں رہی۔ جس کے تحت قائد اپنے عوام سے پوشیدہ رہے اور نہ ہی انہوں نے صوفیوں اور فاطمیوں کی مانند خفیہ دعوت کا وطیرہ اپناتے ہوئے رہبر کو اس کے حامیوں سے مخفی رکھا۔ بلکہ خاندانِ اہلِ بیتؑ کے ہر امامؑ کی قیادت و امامت بڑی حد تک اعلانیہ ہوتی تھی۔ اور ہر امامؑ کی قیادت پر ایمان رکھنے والوں کا رابطہ اپنے دینی، اجتماعی اور اخلاقی مسائل میں اس امامؑ کے ساتھ برقرار رہتا تھا۔

جب مامون امام محمد تقی الجوادؑ کو دارالخلافہ (بغداد) لے آیا۔ تو آپؑ مدینہ واپسی پر اصرار فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ مامون نے آپؑ کو اجازت دی اور آپؑ کی زندگی کا بیشتر حصہ مدینے میں گزرا ۸۱۔

امام جوادؑ کھلے عام اور تمام مسلمانوں کے سامنے (جن میں آپؑ کے شیعہ بھی شامل تھے) نہایت سرگرمی سے اجتماعی امور کو انجام دیتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ معتصم آپؑ کی سرگرمیوں سے تنگ آچکا تھا۔ بنابرایں اس نے آپؑ کو بغداد طلب کرلیا۔ جب آپؑ عراق پہنچے تو معتصم اور جعفر بن مامون آپؑ کو قتل کرنے کی سازشوں میں مصروف تھے۔ شیخ مفید کہتے ہیں۔

"آپؑ ماہِ محرم کے ختم ہونے سے دو دن قبل ۲۲۰ ہجری میں بغداد پہنچے۔
اور اسی سال ماہِ ذی قعدہ میں رحلت فرماگئے۔"

کتاب روضتہ الواعظین میں ہے کہ۔

"آپؑ کی وفات بغداد میں زہر کے سبب سے ہوئی"۔۹۔

بنابرایں اس اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی کہ امام جوادؑ کی قیادت مسلمانوں خاص کر شیعوں کے درمیان واضح و آشکار نہ تھی۔ یہ اعتراض شروع ہی سے ائمہ اہلِ بیتؑ اور انکے پیروکاروں کے درمیان موجود روابط کے تقاضوں کے بَرخلاف ہے۔ خاص کر اس بات کے پیشِ نظر کہ مامون نے آپؑ کی امامت اور علمیت کو اپنی حرکتوں سے خوب آشکار کیا تھا۔ وہ اس طرح کہ اس نے آپؑ کو شکست دینے اور لوگوں کی حمایت سے محروم کرنے کی غرض سے آزمائشوں میں ڈالا۔ اور عباسیوں کے سامنے آپؑ کا مقابلہ اس دور کے بڑے بڑے علماء کے ساتھ کرایا۔ لیکن کم عمری کے باوجود امام جوادؑ کی علمی و فکری بَرتری پایۂ ثبوت کو پہنچی۔۱۰۔

ایک مرتبہ مامون نے یحییٰ ابنِ اکثم (جو اس دور کے زبردست علماء میں سے تھا) سے کہا کہ وہ امامؑ سے ایسا سوال پوچھے جس کا آپؑ جواب نہ دے سکیں۔ پس یحییٰ نے آپؑ سے عرض کیا۔

"قربان جاؤں ایک سوال پوچھنے کی اجازت ہے؟ ابو جعفر (امام محمد تقیؑ) نے فرمایا۔ چاہو تو پوچھ لو۔ یحییٰ نے پوچھا اگر کوئی حالتِ احرام میں شکار کرے تو اس کا حکم کیا ہے؟

امامؑ نے اس سے فرمایا۔ "اس نے شکار "حل" میں کیا ہے یا "حرم" میں؟ وہ حکم سے آگاہ تھا یا جاہل؟ جان بوجھ کر شکار کیا یا غلطی سے؟ شکاری آزاد تھا یا غلام؟ بچہ تھا یا بڑا؟ یہ اس کا پہلا شکار تھا یا پہلے بھی شکار کرچکا تھا؟ شکار پرندہ تھا یا کچھ اور؟ چھوٹا تھا یا بڑا؟ شکاری اپنے کئے

پر مُصر تھا یا نادم؟ اس نے شکار دن کے وقت مارا یا رات کے وقت؟ اس کا احرام عمرے کا تھا یا حج کا؟

یہ سن کر یحییٰ بن اکثم پر ہیبت طاری ہوگئی۔ اس کے چہرے سے شکست کے آثار ہویدا ہوئے۔ زبان لڑکھڑانے لگی۔ یہاں تک کہ حاضرینِ مجلس اس کی حالت کو بھانپ گئے۔ ۱۱

اس کے علاوہ اس مقام پر (امامؑ کی کم سنی میں امامت کے حوالہ سے) کچھ اور ممکنہ مفروضے ہیں جن کا ہم بترتیب ذکر کرتے ہیں۔

پہلا مفروضہ

"شیعوں کی فکری و علمی سطح ان دنوں اس حد پر تھی کہ ان سے اس مسئلے کے بارے میں غفلت کا امکان تھا۔ بالفاظ دیگر وہ جس فکری، عقلی اور نفسیاتی سطح پر تھے اسی کے باعث ایک بچے کی امامت پر ایمان لے آئے۔ حالانکہ درحقیقت وہ امامؑ نہ تھے۔"

یہ مفروضہ باطل ہے اور تاریخی حقائق اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ کیونکہ ان دنوں شیعوں کے علمی و فقہی معیار کو دیگر مکاتبِ فکر کے نزدیک بھی بلند مقام حاصل تھا۔ وہ عظیم مکتبِ فکر جو امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کی کاوشوں سے پھلا پھولا ان بڑے مکاتبِ فکر میں سے ایک تھا جو اس دور میں معروف ہوئے۔ امام جعفر صادقؑ اور امام موسیٰ کاظمؑ کے شاگردوں پر مشتمل دو نسلیں یکے بعد دیگرے آئیں جو فقہ، تفسیر، کلام، حدیث اور اسلامی تعلیمات کے دیگر شعبوں میں شیعوں کے درمیان سب سے ممتاز حیثیت کی حامل تھیں۔

ان حقائق کی روشنی میں اس مفروضے کی کوئی گنجائش نہیں کہ شیعہ فکری و علمی لحاظ سے اس قدر نچلی سطح پر تھے کہ انہوں نے اس اہم مسئلے سے غفلت برتی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک مذہب کے سارے پیروکار غلطی سے ایک ایسے بچے کو (جو حقیقتاً امام نہ تھا) امام سمجھ بیٹھتے؟ حالانکہ سارے اسلامی مکاتبِ فکر شیعہ مکتبِ فکر کے آگے سر جھکاتے تھے۔ خاص کر ان حالات میں جب کہ امام جوادؑ کی امامت و قیادت ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ بلکہ آپؑ سارے مسلمانوں کے سامنے اعلانیہ اور کھلم کھلا قیادت فرماتے تھے اور کوئی بھی مسلمان اس کو چیلنج کر کے اس کی صداقت کو آزما سکتا تھا۔ خاص کر شیعہ جماعت جسے سب سے بڑے اسلامی مکتبِ فکر کی حیثیت حاصل تھی اور جس کے مدارس کوفہ، قم اور مدینے تک پھیلے ہوئے تھے۔

علاوہ ازایں ان مدارس کا رابطہ امامؑ کے ساتھ برقرار تھا۔ اور امامؑ ان کے شرعی سوالوں کے جواب دیتے تھے نیز یہ لوگ امامؑ کی خدمت میں مختلف علاقوں سے شرعی وجوہات اور اموال بھیجتے رہتے تھے۔ پس یہ کیونکر سوچا جا سکتا ہے کہ یہ بیدار و آگاہ جماعت عظیم مکتبِ فکر ہونے کے باوجود ایک ایسے بچے کو جو دراصل امامؑ نہ تھا پہچان نہ سکی۔

دوسرا مفروضہ

"شیعہ تاریخ میں امامؑ اور امامت کے بارے میں کوئی واضح تصور موجود نہ تھا۔ بلکہ ان کے نزدیک امامؑ فقط وراثتی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ خلاصہ یہ کہ شیعہ حضرات امامؑ اور امامت کی شرائط اور خصوصیات سے

نابلد رہے ہیں۔"

ہمارا کہنا ہے کہ یہ مفروضہ بھی باطل ہے کیونکہ تشیع کی بنیاد ہی امامت کے بارے میں ایک گہرے الٰہی نظریے پر استوار ہے۔ امامت کا نظریہ شیعی نظریات میں سب سے واضح اور بدیہی نظریہ ہے۔ چنانچہ عام شیعی نقطہ نظر سے امامؑ سے مراد وہ انسان ہے جو اپنے علوم، معارف، اقوال، اعمال اور اخلاق کے لحاظ سے تمام انسانوں میں منفرد اور بے مثال ہو۔ امامت کا یہ مفہوم اپنے خدوخال اور حدودِ اربعہ کے لحاظ سے شیعوں کے نزدیک واضح تھا۔ امام علیؑ سے لے کر امام رضاؑ کے دور تک کئی ہزار مرتبہ صریح الفاظ میں اس مفہوم کی مسلسل وضاحت ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ تشیع کی تمام خصوصیات اور تفصیلات شیعوں کے اذہان میں بالکل واضح ہو چکی تھیں۔ اس سلسلے میں ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

"امام رضاؑ کی وفات کے بعد ہم آپؑ کے جانشین امامؑ کا پتہ کرنے مدینہ پہنچے۔ بتایا گیا کہ آپؑ کا جانشین مدینہ کے قریب ایک بستی میں موجود ہے۔ میں اس بستی میں داخل ہوا۔ وہاں امام موسیٰ ابنِ جعفرؑ کا ایک مکان تھا جو اب وراثت میں امام جوادؑ کو مل چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ مکان لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور امام رضاؑ کے ایک بھائی صدرِ مجلس میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ لوگ ان کے بارے میں کہہ رہے تھے "اے رضا کے بھائی" یعنی یہ شخص رضاؑ کے جانشین نہیں کیونکہ انہوں نے اماموں سے سن رکھا تھا کہ حسنینؑ کے بعد دو بھائی امام نہیں بن سکتے"۔[۱۲]

اس روایت سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ تشیع کی تمام تر تفصیلات و خصوصیات اس کے پیروکاروں کے نزدیک روزِ روشن کی طرح واضح تھیں اور یہ

بات بھی اس دوسرے مفروضے کے حامیوں کی تکذیب کرتی ہے۔

تیسرا اور آخری مفروضہ

"مذکورہ مسئلہ شیعوں کی جانب سے ایک بے بنیاد اور باطل نظریے کی اندھی حمایت اور اس پر اڑے رہنے کے سوا کچھ نہیں۔"

جواباً عرض کریں گے کہ یہ مفروضہ بھی باطل ہے۔ ایک تو شیعہ جماعت کے ایمان و تقدس کے پیشِ نظر اور اس کے علاوہ بھی ان مخصوص حالات و مسائل سے اس مفروضے کی نفی ہوتی ہے جو اس مظلوم طبقے (شیعہ) کو احاطہ کئے ہوئے تھے۔ کیونکہ شیعوں کی تاریخ شاہد ہے کہ شیعیت کا راستہ ایک دن کے لئے بھی طاقت' دولت اور اقتدار کا راستہ نہیں رہا۔ بلکہ شیعہ تاریخ میں ہمیشہ ظالموں کے ہاتھوں رنج' تکلیف' محرومی' قید و بند اور قتل و غارت گری کا شکار رہے۔ اس راہ کا راہی ہر وقت خوف و ظلم اور قدم قدم پر کڑی نگرانی کے سائے تلے زندگی گزارتا رہا۔ امام محمد باقر علیہ السلام شیعوں پر نازل ہونے والی تکالیف و آفات کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"ہمارے شیعوں کا ہر شہر میں خون بہایا گیا' ظن و تہمت کی بنیاد پر ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے۔ جس شخص کے بارے میں خبر ملتی کہ وہ ہم سے محبت یا روابط رکھتا ہے اس کو راہیٔ زندان کرتے یا اس کا مال لوٹ لیتے اور اس کے گھر کو نذرِ آتش کرتے تھے"۔ ۱۳۔

ان حقائق کی رو سے شیعوں پر کسی باطل بات کی اندھی حمایت اور اس پر اڑے رہنے کے الزام کا بطلان ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اس امر میں

ان کا مقصد مادی و دنیوی مفاد ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ جب کوئی مادی یا دنیوی مفاد پیشِ نظر نہ تھا تو پھر شیعہ علماء و فقہاء کیونکر ایک باطل قیادت کے پیچھے اس قدر مصر اور کمربستہ رہتے؟ جب کہ امامؑ کی حمایت کا نتیجہ ان کے لئے مادی محرومی اور تکالیف کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

بنابرایں مسئلہ امامت پر شیعوں کے اصرار کی فقط ایک ہی توجیہہ ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس اصرار کی بنیاد امامت کی حقانیت پر ان کا یقین اور اس مسئلے کی شرائط سے ان کی مکمل آگاہی کے علاوہ کچھ نہیں۔

خلاصہ یہ کہ اس بات کو ماننے بغیر چارہ نہیں کہ مذکورہ مفروضے اس شخص کے لئے ہرگز قابلِ قبول نہیں جو شیعوں کی تاریخ اور ان کے مخصوص حالات و مسائل خاص کر امام جوادؑ کی امامت کو درپیش حالات و مسائل سے صحیح آگاہی رکھتا ہو۔ ان مفروضوں اور ان کے جوابات کا جائزہ لینے کے بعد اب ایک ہی راہ باقی رہتی ہے جو حقیقت کے عین مطابق ہے اور وہ یہ کہ حضرت امام محمد تقی الجوادؑ امامِ برحق تھے۔

مصادر و ماخذ

۱۔ بحارالانوار ۔ ج ۵۰ ۔ ص ۷۳

۲۔ بحارالانوار ۔ ج ۵۰ ۔ ص ۱۰

۳۔ دائرۃ المعارفِ الاسلامیہ الشیعہ ۔ ج ۲ ۔ ص ۹۲

۴۔ بحارالانوار ۔ ج ۵۰ ۔ ص ۸۶

۵۔ دائرۃ المعارف۔ ج۲۔ ص۹۲
۶۔ ایضاً۔ ص۹۲
۷۔ المہدی والمہدویہ۔ ص۶۱۔ ۶۲
۸۔ الموسوعہ۔ ج۲۔ ص۹۲
۹۔ دائرۃ المعارف۔ ص۹۲
۱۰۔ ایضاً (نقل از ارشاد شیخ مفید)
۱۱۔ تذکرۃ الخواص۔ ص۳۶۸ اور ص۳۷۲ نیز تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تحف العقول عن آل الرسول از ابنِ صغبہ۔ ص۳۳۵
۱۲۔ بحارالانوار۔ ج۵۰۔ ص۹۰
۱۳۔ شرح نہج البلاغہ از ابنِ ابی الحدید۔ ج۳۔ ص۱۵

امام علی نقی الھادی علیہ السلام

امام علی نقی الھادی علیہ السلام کو اپنے پدرِ بزرگوار کے بعد سخت اور تلخ حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ آپؑ کے دور میں "متوکل" کی حکومت رہی، امامؑ کے ساتھ اس کی عداوت معروف تھی۔ وہ آپؑ کے اصحاب اور حامیوں (جن کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا) کا پیچھا پکڑنے اور ان پر تشدد کرنے میں مشہور تھا۔ امامؑ کے حلقۂ اثر میں اس اضافے کا اثر حکمران ٹولے پر پڑنے لگا۔ یہاں تک کہ متوکل کو اس مسئلے کی سنگینی کا احساس ہوا اور اس نے مزید خطرات سے بچنے کے لئے بیک وقت دو راہیں اپنائیں جو یہ ہیں۔

- امامؑ کے حامیوں اور اصحاب کا قلع قمع کرنے اور ان کو دبانے کے لئے کارروائی نیز ان کی مزید تذلیل و تخویف اور ہر قسم کے شیعی آثار کو محو کرنے کے لئے اقدام۔ یہاں تک کہ متوکل نے قبرِ حسینؑ پر ہل چلوا کر اس کے آثار مٹا دیئے۔[۱]
- امامؑ کو ان کے حامیوں سے جدا رکھنا تاکہ ان کا شیرازہ بکھر جائے اور وہ اپنی کامیابی سے مایوس ہو جائیں اور اس طرح یہ مسئلہ ہی ختم ہو جائے۔

متوکل نے دیکھا کہ امامؑ کا اس کی نظروں سے دور (مدینے میں) رہنا باعثِ خطر ہے۔ اس بات کے پیشِ نظر اس نے آپؑ کو سامراء لانے کا حکم دیا تاکہ امامؑ کو ان کے حامیوں اور وفاداروں کی نظروں سے دور اپنی نگرانی میں رکھے اور آپؑ کی حرکات پر کڑی نظر رکھے۔

چنانچہ متوکل نے امامؑ کو ایک خط لکھا جس میں آپؑ کو سامراء تشریف لانے کی دعوت دی اور اجازت دی کہ اپنے اہلِ خاندان اور چاہنے والوں میں سے جسے چاہیں ساتھ لے آئیں۔۲۔

اس نے اس طرح ایک ایسی روش اختیار کی کہ امت اس کے خلاف اٹھ کھڑی نہ ہو۔ یہ وہی رَوش تھی جس کو سابقہ خلفاء نے بھی اپنایا تھا اور جس کا مظاہرہ مامون نے امام رضاؑ اور امام محمد تقی الجوادؑ کے معاملے میں کیا تھا۔ مقصد ان دونوں اماموں کو حکمرانؔ ٹولے میں ضم کر کے دربارِ خلافت کی نگرانی میں رکھنا تھا۔

متوکل نے اپنی فوج کے ایک سردار یحییٰ بن ہرثمہ کے ہاتھ مدینہ خط ارسال کیا اور سپاہیوں کی ایک جماعت اس کے ساتھ روانہ کی۔ متوکل نے اسے حکم دیا کہ وہ امامؑ کو سامراء بلانے سے پہلے آپؑ کے گھر کی تلاشی لے اور کوئی ایسی دستاویز تلاش کرے جس کے ذریعے امامؑ کو حکومت کے خلاف اقدام اور سازش کرنے کے الزام میں پھنسایا جا سکے۔

جب اہلِ مدینہ کو واقعے کی خبر ملی تو انہوں نے ابنِ ہرثمہ کے اقدام کی مذمت میں آواز بلند کی۔ یہاں تک کہ اس نے لوگوں کو خاموش کرنے کی کوششیں شروع کر دیں اور قسمیں کھائیں کہ وہ آپؑ کو کسی قسم کا گزند پہنچانے

پر مامور نہیں ۔۳۔

یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ اہلِ مدینہ امامؑ کے خلاف حکمرانوں کی بدنیتی سے آگاہ تھے۔

ابنِ ہرثمہ کا بیان ہے کہ میں نے اس کے بعد امامؑ کے گھر کی تلاشی لی لیکن میں نے وہاں مصاحف، دعاؤں اور علمی کتابوں کے علاوہ کچھ نہ پایا۔۴۔

امام علی نقیؑ اپنے فرزند امام حسن عسکریؑ (جو ابھی بچے تھے) کو ساتھ لے کر ابنِ ہرثمہ کی ہمراہی میں سامراء تشریف لے گئے وہاں پہنچنے کے ایک دن بعد متوکل نے آپؑ کو بلایا۔

متوکل کے ندیموں نے آپؑ کا استقبال کیا۔ جب آپؑ اس کے پاس پہنچے تو اس نے آپؑ کی تعظیم کی۔ پھر آپؑ کو ایک گھر میں منتقل کیا جسے پہلے ہی سے آپؑ کے لئے تیار و آراستہ کیا جا چکا تھا۔

متوکل نے اپنی اس پُرفریب روش کے ذریعے اپنے سیاسی منصوبے اور امامؑ کے خلاف اپنی اندرونی عداوت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ اس نے امامؑ کو بلا کر آپؑ پر جبری رہائش ٹھونسی اور آپؑ کو دربارِ خلافت کی نگرانی میں رکھا۔ تاکہ آپؑ کی ہر حرکت کی کڑی نگرانی ہو جو بعد میں آپؑ کے خلاف کام آسکے۔

امامؑ کی نگرانی

پہلے ذکر ہوا کہ متوکل کا امامؑ کو سامراء بلانے کا مقصد آپؑ کو ممکنہ حد تک دربارِ خلافت کے ساتھ مربوط رکھنا تھا۔ تاکہ امامؑ ان کی نظروں کے سامنے ہوں اور آپؑ کے پاس آنے جانے والا کوئی فرد ان کی نگاہوں سے مخفی نہ رہے۔

امامؑ بھی ایسا ظاہر کرتے تھے کہ گویا آپؑ عباسی حکومت کے سلوک اور طرزِ عمل سے راضی ہیں۔ آپؑ ان کی دعوتوں اور مجالس میں شرکت فرماتے تھے اور ان کی معیت میں باہر نکلتے تھے۔۵۔ لیکن آپؑ کی یہ پالیسی حکومت کے آگے اپنے اصولوں سے دست برداری اور چشم پوشی کی بناء پر نہ تھی۔ کیونکہ امامؑ جیسے بااصول انسان سے یہ کام ممکن نہ تھا۔ اگر آپؑ اپنے اصولوں کے مسئلے میں کسی قسم کی چشم پوشی یا نرمی کا مظاہرہ کرتے تو یہ عالمِ اسلام کے عظیم مفادات کے خلاف اقدام محسوب ہوتا۔ نیز اگر حکومت دیکھتی کہ امامؑ نے اپنے موقف سے دستبرداری اختیار کی ہے تو آپؑ کو ان کے نزدیک عظیم جاہ و مقام حاصل ہوتا۔ آپؑ کی شدید نگرانی نہ ہوتی اور آپؑ پر جبری رہائش نہ ٹھونسی جاتی۔

جب کہ ہم جانتے ہیں کہ امامؑ کے خلاف بنی عباس کی ظالمانہ روش میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ متوکل نے اپنی حکومت کے آخری ایام میں امامؑ کے خلاف ہونے والی شکایتوں اور چغل خوریوں کے نتیجے میں آپؑ کو زندان میں ڈال دیا۔ کیونکہ یہ شکایتیں امامؑ کے خلاف متوکل کے شکوک و شبہات کی تقویت کا سبب بنی تھیں اور اس کے احساسِ خوف کو ہوا دیتی تھیں۔ ان خبروں کے نتیجے میں وہ امامؑ کے گھر پر چھاپے مارنے کا حکم دیا کرتا تھا تاکہ ان شکایتوں کی صحت و سقم کا اندازہ ہو سکے۔

چغل خوروں کی ناکامی

امامؑ کے گھر پر اچانک چھاپوں کے سلسلے میں درجِ ذیل دو باتیں قابلِ غور ہیں۔

☆ امامؑ کے خلاف تمام شکایتیں ہمیشہ ناکام رہتی تھیں اور آپؑ کی سرگرمیوں کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں ہوتی تھی۔ خلیفہ کے جاسوس ہر بار یہی خبر لاتے تھے کہ امامؑ کے ہاں کوئی خطرے والی چیز پائی نہیں گئی۔ یوں متوکل دوبارہ سکون کی سانس لیتا اور بظاہر امامؑ کے احترام و اکرام کا سلسلہ جاری رکھتا تھا۔

جب بھی امامؑ کے گھر کی تلاشی ہوتی تو آپؑ حکومت کی نظر میں خود کو مشکوک بنانے والی چیزوں کو پوشیدہ رکھنے میں کامیاب رہتے۔ حالانکہ آپؑ کے پاس مختلف جگہوں سے اموال اور خطوط کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور لوگوں سے آپؑ کے خفیہ روابط بھی تھے۔ جب آپؑ حکومت کی نظر میں ممنوع کسی امر کے بارے میں بات کرنا چاہتے تو رموز و اشاروں پر مشتمل ایک مخصوص اور خفیہ طریقہ تفہیم اپناتے تھے۔٦٠

☆ جب آپؑ کے گھر پر چھاپہ لگتا تو آپؑ ایسی روش اختیار کرتے جس سے بے پروائی، سکون اور اپنی بے گناہی پر اطمینان کا اظہار ہوتا۔ آپؑ تلاشی لینے والے اہلکاروں کی مدد بھی فرماتے تھے۔ مثلاً آپؑ ان کے لئے چراغ کی روشنی فراہم کرتے اور گھر کے کمرے ان کو دکھاتے اور اس طرح حکومت کو یہ باور کراتے کہ آپؑ کسی غیر معمولی سرگرمی میں ملوث نہیں۔

اگر امامؑ اس طریقہ کی بجائے کوئی اور روش اپناتے تو اس سے آپؑ کی سرگرمیوں کے بارے میں حکام کے شکوک میں اضافہ ہوتا اور آپؑ کو ایسا کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔

امامؑ کے گھر پر کئی بار چھاپے مارے گئے۔ ایک بار متوکل کے پاس آپؑ کے خلاف "بطحانی" کی شکایت اور بدگوئی کے نتیجے میں چھاپہ لگا۔ اس نے متوکل کو بتایا کہ آپؑ کے گھر میں دولت اور اسلحہ موجود ہے۔ متوکل نے فوری طور پر "سعید" نامی حاجب کو رات کے وقت آپؑ کے گھر پر چھاپہ مارنے اور اسلحہ و دولت کو ضبط کرکے اس کے پاس پہنچانے کا حکم دیا۔

"سعید" ایک سیڑھی لے کر امامؑ کے گھر کی طرف چلا، سڑک کی طرف سے گھر کی چھت پر چڑھا اور تاریکی میں اترا لیکن راستہ نہ دیکھ سکا۔ اتنے میں امامؑ نے نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ اسے آواز دی۔ اے سعید ٹھہرو میں تمہارے لئے چراغ منگواتا ہوں۔ سعید کا کہنا ہے کہ اتنے میں میرے پاس ایک چراغ لایا گیا، میں اس کی روشنی میں نیچے اترا۔ پھر میں نے دیکھا کہ آپؑ ایک اونی جبہ اور ٹوپی پہنے ہوئے ہیں۔ ایک چٹائی پر آپؑ کا سجادہ بچھا ہوا ہے اور آپؑ قبلہ رخ بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپؑ نے مجھ سے کہا یہ رہے کمرے۔ پس میں ان کمروں میں داخل ہوا اور ان کی تلاشی لی لیکن مجھے وہاں کوئی چیز نہ ملی۔

سعید نے امامؑ سے عذر خواہی کی اور حکم کے آگے مجبور ہونے کا بہانہ تراشا لیکن امامؑ نے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

"وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون"[۲۷]

"اور عنقریب ظالمین کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس جگہ پلٹا دیئے جائیں گے۔" (سورہ شعراء ۲۶۔ آیت ۲۲۷)

ایک اور موقع پر متوکل کو خبر ملی کہ امامؑ کے پاس قم (جو امامؑ کے وفاداروں کا ایک مرکز تھا) سے مال پہنچا ہے۔ متوکل نے اپنے وزیر "فتح بن خاقان" کو

حالات پر نظر رکھنے اور نتائج سے باخبر کرنے کا حکم دیا وزیر نے اپنے ایک ملازم کو جس کا نام "ابو موسیٰ" تھا امامؑ کے پاس بھیجا تاکہ وہ حالات کا قریب سے جائزہ لے۔۸۰

جدید حالات و مسائل اور امامؑ کا لائحہ عمل

امامؑ نے ان دشوار حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کی جن کا آپؑ کو سامراء میں قیام کے دوران متوکل اور اس کے جاسوسوں کی طرف سے شب و روز ہونے والی کڑی نگرانی میں سامنا کرنا پڑا۔ آپؑ نے ان پُر آشوب حالات کے باوجود اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھنا تھا۔ ساتھ ہی آپؑ اور آپؑ کے اصحاب پر عائد ہونے والی پابندیوں اور نگرانیوں کے خلاف (حتیٰ المقدور) ٹکراؤ سے پرہیز بھی کرنا تھا۔ ان مشکلات کے باوجود آپؑ نے اپنا کردار ادا کرنے کے لئے دو منصوبوں پر عمل کیا۔

☆ پہلا منصوبہ امت کو بیدار کرنا اور علمی منصوبوں پر عملدر آمد تھا۔ اس سلسلے میں آپؑ نے ان سوالات اور اعتراضات کا جواب دینے کے لئے اقدام فرمایا جو (آپؑ کو لوگوں کی نظروں سے گرانے کے لئے) خلیفہ کی کوششوں سے بطورِ چیلنج کئے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک مرتبہ متوکل نے "ابنِ سکیت" سے کہا کہ وہ اس کی موجودگی میں امامؑ سے پیچیدہ سوالات پوچھے۔ "ابنِ سکیت" نے آپؑ سے چند ایسے سوالات کئے جو اس کی دانست میں مشکل اور پیچیدہ تھے۔ لیکن امامؑ اس چیلنج میں کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔

بات یہاں تک پہنچی کہ "یحییٰ بن اکثم" نے متوکل سے کہا "میرے خیال میں میرے سوالوں کے بعد اس شخص سے مزید سوال نہ کریں تو بہتر ہے کیونکہ میرے سوالات کے بعد جو بھی سوالات ہوں گے وہ ان سے آسان ہی ہوں گے اور اس شخص (امامؑ) کی علمی صلاحیتوں کے مظاہرے سے رافضیوں کو تقویت ملے گی" ۔ ۹۔

امامؑ لوگوں کے سوالات کا جواب دیا کرتے تھے اور اس دور کے ملحدین کی طرف سے کئے جانے والے اعتراضات کو دلائل کے ذریعے باطل ثابت کرتے تھے ۔ ۱۰۔

☆ دوسرا منصوبہ شیعوں کے ہمہ پہلو اور سب سے عظیم قائد کی حیثیت سے ان (شیعوں) کی حمایت و سرپرستی کرنا، ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مدد دینا، ان کی فکری و علمی تربیت کرنا اور اپنے اوپر ان کے اعتماد کو مضبوط بنانا تھا۔ امامؑ نے ان کی اجتماعی سرگرمیوں کو زندہ رکھنے کے سلسلہ میں مسلسل کوشش جاری رکھی۔ آپؑ ہر ممکن طریقے سے اپنے وفاداروں کی مدد فرماتے تاکہ وہ پامردی سے مشکلات اور رکاوٹوں کا مقابلہ کر سکیں۔

امامؑ اپنے معتقدین سے ممکنہ حد تک خفیہ و اعلانیہ طریقوں سے کثیر مقدار میں زکات، خمس اور خراج وغیرہ وصول فرماتے تھے اور اسے حکمرانوں کی نظروں سے چھپا کر راہِ خدا میں خرچ کرتے تھے تاکہ آپؑ کی تحریک کو تقویت حاصل ہو ۔ ۱۱

امامؑ کی منصوبہ بندی کے مقابلے میں بنی عباس کا موقف

عباسی حکام نے امامؑ کے اقدامات کو ناکام بنانے، آپؑ کے منصوبوں کو کنٹرول کرنے اور آپؑ کی مخالفت کا سدباب کرنے کے لئے منصوبہ بندی کی اور درجِ ذیل راستے اپنائے۔

☆ علمی میدان میں امامؑ کا مقابلہ کرکے آپؑ کو شکست دینے کی کوشش کی۔ لیکن امامؑ نے ان سوالات اور چیلنجوں کا جواب دے کر یہ کوشش ناکام بنادی۔

☆ امامؑ کو رام کرنا اور آپؑ کو دربارِ خلافت سے منسلک کرنا تاکہ آپؑ کے لائحہ عمل کو نقش بر آب اور آپؑ کو اپنے حامیوں سے جدا کیا جاسکے۔

رہا یہ سوال کہ امامؑ نے متوکل کی دعوت پر سامراء تشریف لانا اور اس کے ساتھ رہنا کیوں قبول کیا؟ تو اس سلسلے میں امامؑ کے موقف کی درجِ ذیل وجوہات کی صورت میں تفسیر کی جاسکتی ہے۔

(الف) امامؑ کو زبردست دباؤ اور جبر کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ آپؑ کو قتل کی دھمکی دی گئی۔ پس اگر امامؑ متوکل کے پاس جانے سے صاف انکار فرماتے تو یہ حکومت کو اپنے خلاف بھڑکانے اور اس کی مخالفت کا اظہار کرنے کے مترادف تھا۔

خلاصہ یہ کہ اس قسم کی روش آپؑ کی اس حکمتِ عملی کے برخلاف ہوتی جسے آپؑ نے حکومت کے معاملے میں اپنایا ہوا تھا۔

(ب) امامؑ بعض جاسوسوں کی شکایتوں کو ناکام بنانا چاہتے تھے جو آپؑ کو مصیبت

میں مبتلا کرنے کے درپے تھے۔ چنانچہ عبداللہ بن محمد نے جو مدینہ میں نماز اور جنگ سے متعلق امور کا ذمہ دار تھا آپؑ کی چغل خوری کی اور متوکل کی توجہ آپؑ کے خطرے اور مدینے میں آپؑ کی سرگرمیوں کی طرف مبذول کروائی اور انہیں امن و امان کے خلاف اقدام قرار دیا۔ اور یہ خبر بھی پھیلائی کہ امامؑ کے گھر میں اسلحہ اور مکتوبات موجود ہیں۔۱۲۔ اسی بناء پر امامؑ نے حکام کے سامنے ایسے موقف کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی جس سے حکام کے شکوک و شبہات کو تقویت نہ ملے۔ اس طرح آپؑ کو کسی دوسرے موقع پر نئے سرے سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کا موقع مل سکتا تھا۔

(ج) ممکن ہے امامؑ کے پیشِ نظر یہ بات ہو کہ حکمران طبقے کے درمیان آپؑ کی موجودگی ان تک حق کا پیغام پہنچانے اور اپنے عادلانہ موقف کا دفاع کرنے کے لئے ایک اچھا موقع ثابت ہوگی۔ کیونکہ ذاتی طور پر امامؑ کو ان کے نزدیک احترام حاصل تھا اور وہ آپؑ کے علم و نسب کی عزت کرتے تھے۔ اس طرح آپؑ اونچے پیمانے پر سرکاری طبقے کو متاثر کرتے ہوئے ان کے دلوں میں اپنے لئے نرم گوشہ پیدا کرسکتے تھے۔

(د) امامؑ اس وقت دیکھ رہے تھے کہ عباسی اقتدار کی بنیاد ہی حسب و نسب، ذاتی مفادات اور ذاتی تعلقات پر استوار ہے۔ بنا برایں امامؑ دیکھ رہے تھے کہ اس صورتِ حال سے اسلامی مفادات کے لئے استفادہ کیا جاسکتا ہے اور اپنے حامیوں پر ہونے والے ظلم و ستم کو ختم نہیں تو کم کرنا نیز ان کو خطرات سے بچانا ممکن ہے۔

علوی تحریکیں اور "الرضا من آلِ محمدؐ" کی طرف دعوت

علویوں کی بغاوتیں اور تحریکیں بھی عباسی حکمرانوں کے لئے خطرے کا باعث بن چکی تھیں۔ لہٰذا انہوں نے ان کے خلاف سخت پالیسی اپنائی۔ بنی عباس ان کو مزید پنپنے اور اپنے لئے دردِ سر بننے سے پہلے ہی ختم کرنے پر کمربستہ ہوگئے۔ نیز ان کے بچے کھچے افراد کو منتشر کرنے، ان کا قلع قمع کرنے اور ان سے گلوخلاصی حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کے وحشیانہ طریقوں سے ان کا پیچھا کرنے لگے۔

علویوں کے خلاف کینہ وعداوت میں خلیفہ، وزیر، سردار اور ترک وغلامان (جن سے عباسی دارالخلافہ سامراء بھرا پڑا تھا) اور مراعات یافتہ طبقہ (جو ہر قسم کے طبقاتی امتیازات سے بہرہ مند تھے اور جن میں ایسے سردار اور بااثر لوگ بھی تھے جو صلح وجنگ کا فیصلہ کرتے تھے) غرض سب کے سب متفق الخیال تھے۔

ان ایام میں عباسی حکومت اپنی ظالمانہ سیاست کی بناء پر افتراق اور ناتوانی سے دوچار تھی اور انہیں علویوں کی معمولی سی حرکت سے بھی خوف محسوس ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے سائے سے بھی ڈرتے تھے۔ اسی بناء پر عباسی حکومت نے علویوں کے خلاف بہت سخت پالیسی اختیار کی اور علوی باغیوں کے لئے سخت ترین سزائیں تجویز کیں۔

علوی باغیوں کو جب بھی طاقت اور عوامی حمایت کا احساس ہوتا تو وہ منحرف اور ظالم حکمرانوں کے خلاف بغاوت اور خروج کے لئے منصوبہ بندی کو ضروری سمجھتے تھے۔ ان کی اکثر تحریکیں "الرضا من آل محمدؐ" کے علامتی نام پر دعوت دیتی تھیں۔ اس نام سے ان کا مقصود وہ شخص ہوتا تھا جو آلِ محمدؐ میں سب سے افضل ہو۔ اور ظاہر ہے اس دور میں ان کی نظر میں وہ فرد امام علی نقی الہادیؑ

کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔

وسیع مفہوم پر مشتمل اس علامتی نام کے انتخاب میں ان انقلابیوں کی ایک سیاسی اور جنگی چال پوشیدہ تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ امامؑ کا نام مخفی رہے تاکہ انقلاب ناکام ہونے کی صورت میں امامؑ حکمران طبقے کی طرف سے کسی الزام یا مصیبت میں مبتلا نہ ہوں۔ ان کو علم تھا کہ حکومت امامؑ پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے اور حکومت کے خلاف بغاوت یا نافرمانی پر اکسانے کا الزام لگنے کی صورت میں حکومت آپؑ کو قتل کر سکتی ہے۔

ہم پہلے بھی کئی جگہوں پر اس حقیقت کا ذکر کر چکے ہیں کہ ائمہؑ نے امت کے ضمیر و ارادے کو بیدار کرتے ہوئے اسے انحراف سے بچانے کے لئے براہِ راست مسلحانہ جدوجہد اور تصادم کا عمل علویوں پر چھوڑ دیا تھا۔ علویوں نے اپنی مسلسل جانفشانیوں کے ذریعے مسلمانوں کے ضمیر اور قوتِ ارادی کو زوال سے بچانے کی کوششیں کیں۔ ائمہؑ بھی اپنی بساط کے مطابق ان میں سے مخلص افراد کی پشت پناہی فرماتے رہے۔ خواہ وہ براہِ راست مدد کی صورت میں ہو یا اپنی ان تعلیمات کے ذریعے جو ان کے حامیوں کے دلوں کو گرماتی تھیں۔ اس طرح وہ حکومت کے خلاف اعلانیہ بغاوت پر اتر آتے تھے۔

اپنی بحث میں احتیاط اور باریک بینی کے پیشِ نظر ہم یہ دعویٰ کرنے سے گریز کریں گے کہ انقلابی تحریکوں میں حصہ لینے والے سارے علوی اسلامی احکام کے نفاذ کے لئے امامِ معصومؑ کی قیادت میں اسلامی تعلیمات سے مکمل آگاہی کے ساتھ جدوجہد کر رہے تھے یا نہیں۔ لیکن ہمارے نظریے کے مطابق اکثر انقلابیوں کا مطمع نظر یہی تھا۔ ۱۳

مصادر و ماخذ

۱۔ الکامل۔ ج۵۔ ص۳۰۴
۲۔ کتاب الارشاد۔ ص۳۱۳
۳۔ مروج الذہب از مسعودی۔ ج۳۔ ص۸۴
۴۔ تذکرۃ الخواص از ابنِ جوزی اور دائرۃ المعارف۔ ص۹۳
۵۔ تاریخ الغیبہ از محمد صدر۔ ص۱۴۲
۶۔ تاریخ الغیبہ۔ ص۱۴۹
۷۔ کتاب الارشاد۔ ص۳۱۰ اور الفصول المھمہ از ابنِ صباغ مالکی۔ ص۲۹۸
۸۔ المناقب۔ ص۵۱۵ کی طرف رجوع ہو۔
۹۔ المناقب۔ ج۳۔ ص۵۰۷
۱۰۔ الاحتجاج۔ ج۲۔ ص۲۵۱-۲۶۰
۱۱۔ المناقب۔ ج۳۔ ص۵۱۲
۱۲۔ کتاب الارشاد۔ ص۳۱۳
۱۳۔ علویوں کی تحریکوں اور بغاوتوں سے مزید آگاہی کے لئے رجوع ہو بہ تاریخ الغیبہ از صدر۔ ص۸۰ اور مقاتل الطالبین

امام حسن عسکری علیہ السلام

امام حسن عسکری علیہ السلام نے اپنے پدرِ بزرگوار امام علی نقی (الھادیؑ) کے ساتھ مل کر مشکلات کا مقابلہ کیا۔ آپؑ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ عباسی دارالحکومت میں گزارا اور اپنے پدرِ بزرگوار کو پیش آنے والے تمام حالات و مسائل میں ان کا ساتھ دیا۔ ان کے بعد جب آپؑ نے امامت کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو اس وقت آپ کی عمر ۲۲ سال تھی۔

اپنے ساتھیوں اور ماننے والوں کے فکری و روحانی قائد، نیز ان کے نظریاتی و سماجی مفادات کے محافظ ہونے کی حیثیت سے آپؑ کی پالیسیاں آپؑ کے والدِ گرامی کی پالیسیوں کے مطابق رہیں۔

علاوہ ازایں آپؑ کو مستقبل میں اپنے فرزندِ دلبند حضرت حجتہ ابن الحسن (مہدیؑ) کے پردۂ غیبت میں تشریف لے جانے کے حوالے سے منصوبہ بندی اور فضا ہموار کرنی تھی۔

امام حسن عسکریؑ کے دور میں نئے نئے حالات اور مسائل پیش آئے جن کی بنا پر عباسی اقتدار میں اس قدر کمزوری آئی کہ حکومت کی باگ ڈور غلاموں اور ترکوں کے ہاتھ میں آگئی۔ حکومت کی کمزوری کے پیشِ نظر اس بات کی توقع

تھی کہ امامؑ اور آپؑ کے ساتھیوں کے خلاف ڈراؤ، دھمکاؤ اور دباؤ کی پالیسی میں کمی آئے گی لیکن یہ توقع پوری نہ ہوئی بلکہ اس کے برعکس ڈرانے اور دبانے کی پالیسی سخت تر ہوگئی اور خلیفہ معتمد کے زمانے میں اپنے اوج پر جا پہنچی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امامؑ کی سرگرمیوں سے نہ صرف خلیفہ خائف اور پریشان تھا بلکہ وسیع سطح پر لوگوں کا ایک خاص طبقہ بھی اس خوف میں اس کے ساتھ تھا۔

اس وسیع طبقے نے امامؑ اور آپؑ کے فکری و سیاسی لائحہ عمل کی ہمیشہ مخالفت کی۔ کیونکہ آپؑ کا لائحہ عمل خلیفہ (جو اس ہمہ گیر منحرف شدہ اور مراعات یافتہ طبقے کی عملی تصویر تھا) کی پالیسیوں سے بالکل مختلف اور ان کی ضد تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان دو متضاد پالیسیوں کے درمیان ہمیشہ کشمکش رہی اور حکمرانوں کی کوشش رہی کہ امامؑ کی قیادت اور آپؑ کے لائحہ عمل کو سیاسی اور اجتماعی میدان سے حذف کیا جائے اور معمولی سی حرکت یا سرگرمی کا بھی محاسبہ کیا جائے۔ یہاں تک کہ بے بنیاد شکایتوں اور معمولی خبروں کی بنیاد پر بھی مواخذہ ہوتا تھا۔

متوکل نے آپؑ کو قید کیا لیکن اس کی وجہ نہ بتائی۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ حسد و عداوت اور چغل خوروں کی شکایتوں کے علاوہ کیا ہو سکتی تھی۔ اس سے قبل بھی متوکل اور اس کے آباء و اجداد کے ہاتھوں امامؑ کے آباء و اجداد کو جلاوطنی، قید و بند، قتل اور دیگر مظالم کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ روایت ہے کہ آپؑ معتمد کے ہاتھوں زہر سے شہید ہوئے[۱۰]۔

ان حقائق کی روشنی میں گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ظلم اور دباؤ کی شدت میں کمی کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ بلکہ اس کے برعکس تاریخ ہمیں

بتاتی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مظالم میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ درحقیقت امامؑ کے ساتھ روز افزوں دشمنی اور مخالفت ہی امام مہدی (اروحنا فداہ) کے پردۂ غیبت میں چلے جانے کا بنیادی سبب ہے۔(انشاء اللہ آگے اس کی مزید وضاحت ہوگی۔)

حالات کے مقابلے کے لئے آپؑ کا موقف

جدید حالات و مسائل کے مقابلے میں آپؑ نے درجِ ذیل پالیسیاں اپنائیں۔

پہلی پالیسی (حکومت اور حکمرانوں سے برتاؤ کے لحاظ سے)

ائمہؑ کے بارے میں عباسیوں کی سیاست اور روش امام رضاؑ کے دور سے ہی واضح تھی۔ ان کا مقصد اماموں کو دربارِ خلافت کے ساتھ منسلک رکھنا، ان کی مسلسل نگرانی کو یقینی بنانا اور اس طرح ان کا رابطہ اپنے حامیوں اور پیروکاروں سے قطع کرنا تھا۔

مکرو فریب کی یہ سیاست امام حسن عسکریؑ کے ساتھ بھی روا رکھی گئی کیونکہ حکومت کے بہت سے مفادات اس کارروائی سے وابستہ تھے۔ چنانچہ امام حسن عسکریؑ کو بھی اپنے پدرِ بزرگوار کی طرح سامراء میں ٹھہرنے نیز ہر سوموار اور جمعرات کو دربارِ خلافت میں حاضر ہونے پر مجبور کیا گیا۔۲

لیکن امامؑ نے اپنے آباء طاہرینؑ کی طرح حکام کے ساتھ حکومت کے معاملے میں ایک محتاط طریقہ اختیار کیا۔ حکمران ٹولے کے جذبات کو بھڑکنے اور اپنی حقیقت کو ان پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ حکومت کے ساتھ آپؑ کے روابط حسبِ

معمول رہے اور عباسی حکومت کے حوالے سے آپؑ اپنے آباء طاہرینؑ کی روش پر کاربند رہے۔

احتیاط و گریز کی اس پالیسی نے آپؑ کو حکام کے سامنے عزت و احترام کا رفیع مقام دیا۔ اس حقیقت کا مشاہدہ اس دور کے وزراء کے ساتھ آپؑ کے روابط سے ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہو جب کہ امامؑ نے اپنی شخصیت اور عظمت کی دھاک اہلِ بیتؑ کے سخت ترین دشمن پر بھی بٹھادی تھی۔ یہ شخص خلیفہ کا وزیر "عبیداللہ بن یحییٰ بن خاقان" تھا۔ یہ شخص امامؑ کے بارے میں کہتا تھا :

"میں نے سامراء میں حسن بن علی بن محمد بن علی الرضاؑ کی مانند کسی علوی کو نہیں پایا جو وقار و سنجیدگی، عفت و نجابت نیز بنی ہاشم اور اہلِ بیتؑ کے نزدیک عزت و جلالت اور احترام کے لحاظ سے آپؑ کا ہم پلہ ہو۔ آپؑ کے اہلِ خاندان آپؑ کو اپنے عمر رسیدہ بزرگوں اور صاحبِ حیثیت ہستیوں پر ترجیح دیتے تھے"۔ ۳۔

مذکورہ وزیر کے اس کلام سے اس کی نظر میں امامؑ کے احترام و اکرام کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ امامؑ نے اس سے ملاقات کی اور ایک مختصر سی نشست میں اس سے روبرو ہوئے ۴۔ یہ اس مقصد سے تھا تاکہ لوگوں کو یہ سمجھائیں کہ آپؑ کا وزیر کے پاس کھڑا ہونا حکمرانوں کے مظالم پر تنقید کرنے کی غرض سے ہے اور آپؑ کا مقصد فقط اور فقط حق کی حمایت ہے، خواہ جہاں بھی ہو۔ کیونکہ آپؑ کے نزدیک مسئلہ ایک امت اور ایک دین کا تھا۔ جس کے مقابلے میں ذاتی عداوتوں اور اختلافات کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ ممکن ہے کہ آپ کا مقصد ان کو یہ تاثر دینا ہو کہ آپؑ ان کی حکومت کے خلاف خروج اور

مقابلے کا ارادہ نہیں رکھتے اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ شاید آپؑ کا یہ اقدام آپؑ کے ساتھیوں پر ہونے والے ظلم و تشدد میں حکمرانوں کی طرف سے تخفیف کا باعث ہو۔

ایک بار امامؑ نے مجلسِ عام میں وزیر سے ملنے کا ارادہ فرمایا۔ وزیر کی مجلس سجی ہوئی تھی کہ اس کے دربان نے اسے خبر دی کہ "ابو محمد ابن الرضاؑ" دروازے پر موجود ہیں۔ وزیر نے اس اطلاع کو خاص اہمیت دی۔ اس کے بیٹے احمد کا بیان ہے کہ "مجھے ان کی گفتگو اور میرے باپ کی موجودگی میں دربان کا کنیت★ کے ساتھ امامؑ کا نام لینے سے تعجب ہوا کیونکہ میرے باپ کے پاس خلیفہ اور ولی عہد کے علاوہ کسی کی کنیت کا ذکر نہ ہوتا تھا۔ اتنے میں ایک خوش ہیکل، خوبصورت اور جوان شخص اندر داخل ہوا جو جلالت اور حسن کا پیکر تھا۔ میرا باپ اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا، چند قدم آگے بڑھ کر اس کو گلے لگایا، اس کے چہرے اور سینے کو چوما، پھر اس کو اپنی مسند پر بٹھایا اور خود اس کے پہلو میں اس کی طرف رخ کر کے بیٹھ گیا اور اس سے گفتگو کے دوران کہنے لگا۔ میری جان آپؑ پر نچھاور ہو۔"

"احمد بن عبداللہ" اپنے باپ اور امامؑ کے معاملے کو نہ سمجھ سکا اور حیرت میں ڈوبا رہا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ اس نے اپنے باپ سے سوال پوچھنے کی اجازت چاہی اور کہا کہ : اے پدر وہ شخص کون تھا جس کی آپ صبح اس قدر عزت و تکریم بجا لا رہے تھے۔ اس نے جواب دیا اے بیٹے! وہ رافضیوں کا امام

★ کنیت کا استعمال تعظیم یا احترام کے لئے ہوتا ہے اور اب - ام - ابنِ - بنتِ سے شروع ہوتا ہے مثلاً ابوالحسن - امِ ہانی - بنتِ فلان وغیرہ۔ (مترجم)

حسن بن علیؑ تھا۔ (احمد کہتا ہے کہ) پھر وہ خاموش ہو گیا اور میں بھی چپ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ یوں گویا ہوا۔ اے بیٹے! اگر خلافت بنی عباس کے ہاتھوں سے چلی جائے تو فضل، پاکدامنی، پرہیزگاری، زہد، عبادت، حسنِ اخلاق اور صلاحیتوں کی رو سے بنی ہاشم میں اس شخص کے علاوہ کوئی اور خلافت کا اہل نہ ہوگا"۔ ۵۔

یہ امر لوگوں کے نزدیک امامؑ کی محبت و تعظیم نیز ان کے نزدیک آپؑ کی حقانیت اور آپؑ کے استحقاقِ حکومت کے ادراک کی دلیل ہے۔

امام حسن عسکریؑ بعض مسائل کے بارے میں خاموش رہنے کی پالیسی اختیار کرتے تھے۔ صراحت کے ساتھ کسی بھی مثبت یا منفی ردِّ عمل کا اظہار نہ فرماتے تھے جیسا کہ "زنگی تحریک" کے قائد کے ساتھ آپؑ کا رویّہ رہا۔ یہ شخص امام علی علیہ السلام سے منسوب ہونے کا دعویدار تھا لیکن اس کی تحریک اہلِ بیتؑ کی پالیسیوں کا مظہر نہ تھی۔ کیونکہ اس تحریک کے ہاتھوں بہت سے لوگوں کا قتلِ عام ہوا، اموال لوٹے گئے، شہر جلائے گئے اور خواتین کی اسیری عمل میں آئی۔ یہ سارے اقدامات اسلامی تعلیمات کے برخلاف تھے۔

بنابرایں اس تحریک کی روش کے بارے میں امامؑ کا موقف ان کی رد اور مذمت پر مبنی تھا کیونکہ اس تحریک کے ہاتھوں احکامِ اسلام کے منافی کردار و افعال کا مظاہرہ ہوا تھا لیکن امامؑ نے سکوت اور خاموشی کا مظاہرہ کیا اور ان کے افعال کی مذمت نہ کی اور نہ تفصیلات کو چھیڑا۔ اگر آپؑ ایسا کرتے تو آپؑ کے اس ردِّ عمل سے حکومتِ وقت کی تائید ہوتی۔

اپنے متعدد منفی پہلوؤں کے باوجود زنگیوں کی تحریک کا مقصد بھی امامؑ کے ہدف کی طرح عباسیوں کے اقتدار کو کمزور کرنا اور ان کی طاقت کو توڑنا تھا۔

بنابرایں امامؑ کو (اپنی تحریک اور سرگرمیوں کے حق میں) اس امر سے استفادہ کرنا چاہئے تھا کیونکہ حکومت کے مخالفین کا آپس میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو مقصد تو دونوں کا مشترکہ دشمن (یعنی حکومتِ وقت) کا مقابلہ کرنا تھا۔

خلاصہ یہ کہ امامؑ (خاموش رہ کر) زنگی تحریک سے استفادہ کررہے تھے کیونکہ یہ تحریک حکومت کو کمزور بنانے کا باعث تھی۔ نتیجہ کے طور پر حکومت کے لئے دو محاذوں پر لڑنا یا دونوں پر مطلوبہ توجہ دینا ممکن نہ ہوتا۔ یہ امر بڑی حد تک امامؑ والے محاذ پر دباؤ میں کمی کا باعث بن سکتا تھا۔ اگرچہ حکومت کو معلوم تھا کہ امامؑ کی سرگرمیاں زنگی تحریک کے مقابلے میں زیادہ خطرناک اور دوررس اثرات کی حامل تھیں۔ زنگی تحریک کے بانی کی بغاوت ایک وقتی مسئلہ تھی جس نے جلد ہی دم توڑ دینا تھا۔

دوسری پالیسی (علمی، فکری و نظریاتی تربیت کے نقطہ نظر سے)

اپنی علمی پالیسیوں کے عملی اظہار کا ثبوت دیتے ہوئے امامؑ نے الحادی نظریات اور اعتراضات کے دندان شکن جوابات دیئے۔ آپؑ نے گفتگوؤں، مناظروں اور علمی بحثوں کی صورت میں اظہارِ حق فرمایا۔ ساتھ ساتھ آپؑ نے علمی بیانات اور کتابوں کی تالیف وغیرہ کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اپنی اس کوشش کے ذریعے آپؑ نے ایک طرف سے امت کے نظریاتی اور فکری تشخص اور مقام کو برقرار رکھنے کا بندوبست کیا اور دوسری جانب سے ان فکری لہروں کا مقابلہ کیا جو مکتبِ اسلام کے لئے خطرے کا باعث بن چکی تھیں۔ یوں ان کا شروع ہی میں قلع قمع فرمایا۔

امامؑ اپنے وسیع اور ہمہ گیر علم کی بناء پر جدید مشکلات و مسائل اور ان کی اہمیت و افزائش کو بخوبی محسوس کر سکتے تھے۔ نیز انکے خاتمے کے لئے منصوبہ بندی پر بھی قادر تھے۔ امام حسن عسکریؑ کے قیامِ مدینہ کے دوران جب اس زمانے کے عراق کے معروف فلسفی "ابو یوسف یعقوب بن اسحاق کندی" نے قرآنی تعلیمات کے اندر تضاد اور متناقضات کو ثابت کرنے کے لئے ایک کتاب لکھی تو آپؑ نے اپنے مثبت موقف کا ثبوت دیتے ہوئے اس مسئلے پر توجہ دی۔ چنانچہ آپؑ نے اپنے کسی شاگرد کے ذریعے اس سے رابطہ کیا۔ اور اس کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ نیز کندی سے اس کے نظریات کی غلطی کو تسلیم کرایا۔ ۶۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے توبہ کی اور اپنی کتاب جلا ڈالی۔۷۔ آپؑ نے قرآن کے مخلوق ہونے یا نہ ہونے کے موضوع پر ابو ہاشم جعفری کے لئے عالمانہ گفتگو فرمائی ہے۔۸۔ اسی طرح تفسیرِ قرآن کے موضوع پر بھی۔۹

تیسری پالیسی (حامی عناصر کی سرپرستی اور بیداری کے سلسلے میں)

آپؑ کا تیسرا موقف اپنے حامی عناصر کی سرپرستی و حمایت کرنا، ان کی فکری بیداری میں اضافہ کرنا نیز ان کو استحکام و ترقی کی اس منزل پر پہنچانا تھا کہ کارزارِ حیات میں ایک باایمان ہراول دستے کی شکل اختیار کر لیں۔ امامؑ اکثر و بیشتر ان کو خبردار فرماتے تھے کہ وہ عباسیوں کے جال میں نہ پھنسیں۔ اس کے علاوہ حکمرانوں کے ظالمانہ رویے کی بنا پر پیش آنے والی اقتصادی و معاشرتی مشکلات و مسائل میں ان کی دستگیری فرماتے تھے۔ آپؑ نے محمد بن علی سمری (جو آپؑ کے خاص ساتھی اور غیبتِ صغریٰ کے دوران آپؑ کے فرزند مہدیؑ کے چوتھے نائب

تھے) کو خبردار کرنے کے لئے ایک خط لکھا جس میں فرمایا "فتنة تضلکم------ فکونوا علی اھبة" (یہ ایک گمراہ کن آزمائش ہے لہٰذا تم ہوشیار رہنا۔)[۱۰]

امامؑ اپنے اصحاب کو اس وقت تک تقیہ اختیار کرنے اور تند و تیز سرگرمیوں سے بچنے کی تلقین کرتے تھے جب تک حالات سازگار نہ ہوں۔ آپؑ ان کو زندان کے اندر بھی احتیاط برتنے کا حکم دیتے تھے۔ ایک مرتبہ آپؑ کے کئی اصحاب گرفتار ہوئے اور "صالح بن وصیف" کی نگرانی میں رکھے گئے۔ گرفتار ہونے والے ابوہاشم جعفری، داؤد بن قاسم، حسن بن محمد عقیقی، محمد بن ابراہیم عمری وغیرہ تھے۔ امامؑ نے ان کو زندان کے اندر موجود ایک شخص سے محتاط رہنے کا پیغام دیا جو خود کو علوی ظاہر کرتا تھا لیکن درحقیقت علوی نہ تھا۔ آپؑ نے ان کو خبر دی کہ اس شخص کے لباس میں ایک تحریر پوشیدہ ہے جو اس نے خلیفہ کو لکھی ہے تاکہ اسے ان کے درمیان ہونے والی باتوں سے آگاہ کرے۔ چنانچہ جب انہوں نے اس شخص کی تلاشی لی تو وہ تحریر مل گئی[۱۱]۔

اپنے اصحاب کے بارے میں آپؑ کی پالیسیوں میں سے ایک ان کی (عام مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے) مالی مدد کرنا تھی۔ امامؑ کے پاس مختلف مسلمان مناطق سے (جہاں آپؑ کے عقیدت مند پائے جاتے تھے) بہت سی دولت پہنچتی تھی۔ یہ کام ان علاقوں میں پھیلے ہوئے آپؑ کے وکلاء کے ذریعے انجام پاتا تھا۔ اس امر کو حکومت سے مکمل طور پر مخفی رکھنے کے لئے امامؑ بھرپور کوشش کرتے اور مختلف طریقے اختیار فرماتے تھے۔

یہاں ہم مشاہدہ کرسکتے ہیں کہ پابندیوں اور نگرانیوں کے باوجود امامؑ کس

طرح اموال کو جمع کرنے اور ان کو اپنی صوابدید کے مطابق مناسب امور میں خرچ کرنے میں کامیاب ہوتے تھے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ حکومت اپنی پوری کوشش کے باوجود ان سرگرمیوں کے بارے میں کچھ نہ جان سکی تھی۔ اگر ان اموال میں سے کچھ کے بارے میں حکومت کو سراغ ملا بھی تو ایسا بعض لوگوں کی بے احتیاطی کی بناء پر ہوا۔ ۱۲۔

عباسی حکومت نے امامؑ کے اصحاب اور حامیوں کے معاملے میں نہایت سخت موقف اختیار کیا۔ عباسیوں نے آپؑ کے لائحہ عمل کو ناکام بنانے اور آپ کے ساتھیوں کو متفرق کرنے کے لئے زبردست کوشش کی۔ اسکے علاوہ کثیر مال و دولت اور اسبابِ تعیش کے ذریعے ضمیروں کا سودا کرنے لگے۔

ان کوششوں کے مقابلے میں امامؑ نے اپنے اصحاب کے معاملے میں پندو نصیحت اور راہنمائی کی راہ اپنائی۔ اور ان سے فرمایا۔

"وہ نادار جو ہمارا ساتھ دے اس تونگر سے بہتر ہے جو ہمارے مخالفین کا ساتھی ہو۔ ہمارے اعداء کے ساتھ زندہ رہنے سے ہمارا ساتھ دیتے ہوئے قتل ہو جانا غنیمت ہے۔ ہم ان لوگوں کی پناہ گاہ ہیں جو ہمارے پاس پناہ ڈھونڈیں اور ان لوگوں کے لئے ہدایت کے چراغ ہیں جو ہم سے راہنمائی حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں۔ جو لوگ ہمارے ذریعے حفاظت تلاش کریں ہم ان کے محافظ ہیں۔ جو ہم سے محبت کرے وہ جنت کے بلند درجات میں ہمارے ساتھ ہو گا اور جو ہم سے منحرف ہو اس کی منزل جہنم ہے"۔ ۱۳۔

چوتھی پالیسی (غیبت کی تیاری کے سلسلے میں)

امام حسن عسکریؑ کو بخوبی علم تھا کہ آپؑ کا فرزند خدا کے حکم سے زمین پر نظامِ حکومتِ الٰہیہ قائم کرکے اسے پورے عالم میں نافذ کرنے، کمزوروں اور محروموں کی مدد کرنے اور ان کے خوف کو سکون میں بدل کر فقط خدائے یگانہ کی پرستش کو باقی رکھنے کے لئے پردۂ غیبت میں چلا جائے گا۔ بنابرایں آپؑ اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے کہ اپنے بیٹے (امام مہدیؑ) کی غیبت کے لئے فضا ہموار کریں۔ کیونکہ لوگ ظاہری اور حسّیاتی معرفت و ادراک کے عادی ہوچکے تھے۔ لہٰذا محسوسات کے عادی افراد کا وسعتِ فکری سے ہمکنار ہونا ایک مشکل کام تھا۔

امامؑ کے دور کا معاشرہ فکری و روحانی انحراف و زوال کے باعث ایمان کی گہرائی اور فکری بلندی کے اس مقام تک پہنچنے سے عاجز تھا۔ خاص کر ان حالات میں جب کہ امامؑ کی غیبت کا مسئلہ امت کی تاریخ میں ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ امام مہدیؑ کے بارے میں گزشتہ پیش گوئیاں نیز تعدد و تسلسل کے ساتھ مروی صحیح اور متواتر احادیث کا سلسلہ نبی اکرمؐ پر ختم ہوتا تھا۔ ان کو صحاح کے مولفین نے بھی نقل کیا ہے جو اس دور یا اس سے بھی گزشتہ ادوار کے لوگ تھے اور ان میں بخاری، مسلم، احمد بن حنبل وغیرہ بھی شامل تھے۔

نظریہ انتظارِ مہدیؑ کو عام لوگوں کے دلوں میں راسخ کرنے میں ان احادیث کو بڑا دخل حاصل رہا تھا۔ علاوہ ازایں ان احادیث پر لوگوں کا عقیدہ بھی ان کے ایمان کی گہرائی، فکری وسعت اور مذہبی اعتقاد کے مطابق تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ روایات فقط اسی حد تک امامؑ کے لئے ممد و معاون تھیں کہ ایک طرف سے لوگوں کو نظریہ غیبت کو ماننے پر آمادہ کرتی تھیں اور دوسری

طرف اس بات کو واضح کرتی تھیں کہ وہ صاحبِ غیبت ہستی آپؑ کے فرزند حضرت مہدیؑ ہیں۔

امام حسن عسکریؑ کی سب سے مشکل ذمہ داری (جو امام مہدیؑ کے والد ہونے کی حیثیت سے آپؑ نے اٹھائی) لوگوں سے یہ منوانا تھا کہ غیبت کا مرحلہ آچکا ہے اور اس کے مظہر آپؑ کے فرزند حضرت مہدیؑ ہیں۔ عام لوگوں کے حوالے سے یہ ایک کٹھن مرحلہ تھا۔ کیونکہ اس بات سے غیبت کے بارے میں ان کے ایمان اور نظریات کو اچانک دھچکا لگنے والا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی عام شخص کا ایک چیز پر غیر معینہ مدت کے لئے ایمان رکھنا (جب کہ اس کی زندگی میں اس کے اثرات مرتب نہ ہوں) اور بات ہے لیکن کسی ایسے غیبی امر پر ایمان رکھنا جس نے (اس کے اعتقاد کے مطابق) اس کی زندگی میں عملی جامہ پہننا ہو' دوسری بات۔ اس نکتے کی توضیح درجِ ذیل مفروضے سے ہوسکتی ہے۔

"اگر کوئی شخص (جس کی صداقت میں بھی شک نہ ہو) قیامت یا ہماری موت کے قریب ہونے کی خبر دے تو اس سے قیامت یا موت پر ہمارا اعتقاد متزلزل ہوگا۔ کیونکہ اس غیبی امر کے جلد وقوع کا تعین حاصل کرنے کے لئے ایمان و ارادے کی غیر معمولی طاقت درکار ہوگی اور ہمیں روحانی و ایمانی قوتوں کو یکجا کرنا ہوگا۔"

یہ نفسیاتی مسئلہ اس بات کا متقاضی تھا کہ امامؑ (اس فکری بحران اور ذہنی دھچکے کی شدت کو کم کرتے ہوئے) بغیر کسی شک و تردید کے لوگوں کو مذکورہ امر قبول کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے حتی المقدور کوشش فرماتے۔ نیز اپنے اصحاب اور حامیوں کو اس حقیقت سے وابستہ رہنے کا خوگر بناتے۔ خاص کر ان حالات

میں جب کہ آپؑ ایک ایسی بیدار نسل کی تربیت کے خواہاں تھے جو آنے والی نسلوں کی تربیت کے لئے بنیادی کردار ادا کرتی۔ اور اپنی کوششوں سے غیبتِ صغریٰ اور غیبتِ کبریٰ کی تاریخ رقم کرتی۔

جب ہم ان مسائل پر مستزاد ان سنگین حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں جن کا آپؑ اور آپؑ کے اصحاب کو حکومت کی طرف سے سامنا کرنا پڑا۔ نیز مہدویت کے انقلابی نظریے کی ترویج (جو حکام کی نظر میں ان کے وجود کے لئے خطرناک اور ان کی حکومت کے خلاف بغاوت و نافرمانی سے عبارت تھا) کی اہمیت کو مدِّ نظر رکھتے ہیں تو یہ بات مکمل طور پر واضح ہوتی ہے کہ امامؑ کو کس قدر باریک بینی کے ساتھ منصوبہ بندی کرتے ہوئے اپنی ذمہ داری نبھانے کی ضرورت تھی۔ نیز یہ کہ آپؑ کے فرزند مہدیؑ کی امامت و غیبت کے نظریے کی طرف دعوت دینے کا کام کس قدر مشکل تھا۔

امام حسن عسکریؑ
اپنے بیٹے کی غیبت کے لئے راہ ہموار کرتے ہیں

اس ہدف کے حصول کے لئے امام حسن عسکریؑ نے اپنی سرگرمیوں کا محور ان دو کاموں کو قرار دیا۔

- چند خاص افراد کے علاوہ باقی لوگوں کی نظروں سے امام مہدیؑ کو پوشیدہ رکھنا۔
- نظریہ غیبت سے لوگوں کو آگاہ کرنا، ان کو اس سلسلے میں اپنی شرعی ذمہ داریوں سے باخبر بنانا اور غیبت کے تقاضوں کا آشنا اور خوگر بنانا۔

اس دوسرے کام کے حوالے سے امام حسن عسکریؑ نے (مہدیؑ کے بارے میں) اپنے فرمودات اور بیانات سے لوگوں کو مستفید کیا۔ یہ اقدام ان فرمودات اور تعلیمات کے سلسلے کی ایک کڑی تھا جن کے ذریعے رسولِ اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ نے بشارتیں دی تھیں۔ علاوہ ازایں امام حسن عسکریؑ نے اپنے فرزند (مہدیؑ) کا ذکر مزید تاکید اور خصوصیت کے ساتھ کیا۔

اس بارے میں امام حسن عسکریؑ کے بیانات تین طرح کے ہیں۔

(الف) عام بیان۔ مثلاً امام مہدیؑ کے ظہور اور آپؑ کی عالمگیر حکومت کے قیام کے بعد آپؑ کی صفات و خصوصیات کا ذکر۔ جیساکہ آپؑ نے ظہورِ مہدیؑ کے بارے میں اپنے ایک ساتھی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

"جب وہ قیام کریں گے تو اپنے علم (علمِ لدنی) کی بناء پر لوگوں کے درمیان فیصلے کریں گے جس طرح داؤدؑ فیصلے کرتے تھے اور انہیں گواہوں کی ضرورت نہ ہوگی"۔ ۱۴۔

(ب) اس حقیقت کی نشاندہی کہ نظریہ مہدویت کا تقاضا حالات کو بدلنا ہے۔ اس سلسلے میں آپؑ نے فرمایا۔

"جب مہدیؑ خروج کریں گے تو وہ مساجد کے اندر تعمیر شدہ خصوصی منبروں اور حفاظتی محرابوں کو گرانے کا حکم دیں گے۔"

واضح رہے کہ اس قسم کے محراب خلفاء کی حفاظت اور لوگوں پر ان کے رعب و دبدبے میں اضافے کے لئے بنائے جاتے تھے۔ ۱۵۔

(ج) اپنے اصحاب اور حامیوں کی عام رہنمائی کرنا تاکہ ان کو نظریہ غیبت کے مختلف پہلوؤں سے آشنا کیا جائے۔ نیز معاشرتی لحاظ سے ان کو اس طرح سے

ڈھالنا کہ وہ مستقبل میں امامؑ کی غیبت و جدائی سے پیدا ہونے والے تلخ حالات کا سامنا کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اس سلسلے میں امامؑ نے ابنِ بابویہ کے نام ایک خط میں لکھا۔

"تمہارے اوپر لازم ہے کہ صبر کے ساتھ قیامِ مہدیؑ کا انتظار کرو۔ کیونکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ "میری امت کا سب سے بہترین عمل انتظارِ فرج ہے۔" ہمارے شیعہ پیہم غم و اندوہ کا شکار رہیں گے یہاں تک کہ میرے بیٹے کا ظہور ہوگا۔ (جس کے بارے میں نبیؐ نے بشارت دی ہے) اور وہ زمین کو عدل و انصاف سے اسی طرح بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے پُر ہو چکی ہوگی۔ اے ہمارے بزرگ ابوالحسن بن علی صبر کا مظاہرہ کرنا اور ہمارے تمام شیعوں کو بھی صبر کرنے کا حکم دینا کیونکہ بتحقیق زمین اللہ کی ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس پر مسلط کرتا ہے۔ اور عاقبت تقویٰ والوں کے لئے ہے"۔۱۶

☆ امام حسن عسکریؑ نے غیبت کی تیاری کے سلسلے میں ایک اور قدم اٹھاتے ہوئے سوائے اپنے بعض خاص اصحاب کے باقی لوگوں کی نظروں سے خود کو مخفی رکھنا شروع کیا۔ اور اپنے احکام و تعالیم کی تبلیغ کی ذمہ داری چند برگزیدہ افراد کے سپرد فرمائی۔ آپؑ اس سلسلے میں خط و کتابت اور مہر شدہ تحریروں سے استفادہ فرماتے تھے۔

اس اقدام سے آپؑ کا مقصد اس اسلوب کے لئے فضا کو سازگار بنانا تھا جسے بعد میں آپؑ کے بیٹے مہدیؑ نے غیبتِ صغریٰ کے دوران پردۂ غیبت میں رہ کر اپنی تعلیمات پہنچانے کے لئے اپنانا تھا۔

اگر پیشگی تیاری کے بغیر غیبت واقع ہوتی تو یہ امر لوگوں کے لئے ایک غیر متوقع بحران پیدا کرتا۔ لہٰذا امام حسن عسکریؑ نے امت کو ذہنی طور پر آمادہ و بیدار کرنے کے لئے ایک خاص طریقہ کار اپنایا تاکہ لوگ مذکورہ اسلوب کو بغیر کسی تعجب کے آسانی سے قبول کریں اور اس سلسلے میں غیر مناسب اعتراضات نہ کریں۔

اس نظریے کے لئے تیاری اور منصوبہ بندی کی ابتداء امام علی نقی الہادیؑ کے دور میں شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ آپؑ نے اپنے اکثر معتقدین سے فقط خطوط اور دستخط شدہ تحریروں کے ذریعے رابطہ رکھنا شروع کیا تھا۔۱۷ اور ان کی نظروں سے پوشیدہ رہنے لگے تھے تاکہ یوں اپنے شیعوں کو (لوگوں کے ذہنوں میں موجود عام تصور کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے) بتدریج مذکورہ روش کا عادی بنائیں۔ اس طرح عملی طور پر آپؑ کے اصحاب اور معتقدین کو خط و کتابت کے ذریعے رابطہ برقرار کرنے اور سوالات پوچھنے کی عادت ہو گئی۔۱۸

اسی طرح امام حسن عسکریؑ کا اپنے حامیوں کے امور کو اپنے نمائندوں اور وکیلوں کے ذریعے چلانا بھی نظریہ غیبت کے لئے فضا ساز گار کرنے کا ایک طریقہ تھا۔

جب شیعہ حضرات اپنے اوپر واجب اموال امامؑ کی خدمت میں پہنچانا چاہتے تو "عثمان بن سعید العمری السمان" کے پاس پہنچتے جو امامؑ سے مربوط سرگرمیوں کو چھپانے کے لئے گھی کا کاروبار کرتے تھے۔

چنانچہ وہ لوگوں سے وصول شدہ شرعی اموال کو گھی کے برتنوں اور مشکوں میں مخفی کر دیتے تھے اور حکام کی نظروں سے چھپا کر ان اموال کو امامؑ کی خدمت

میں پہنچا دیتے تھے۔ کیونکہ اگر ان کو پتہ چلتا تو وہ یہ مال ضبط کر لیتے۔۱۹

آنے والے صفحات میں ہم مطالعہ کریں گے کہ لوگوں کی نظروں سے دور رہ کر وکیلوں کے توسط سے کام چلانے کے نظام پر غیبتِ صغریٰ کے دوران عمل ہوتا رہا۔ کیونکہ اس سے قبل امام حسن عسکریؑ اور امام علی نقیؑ (خاص کر امام حسن عسکریؑ) کی روش کی بدولت لوگ اس کے عادی ہو چکے تھے۔

ہم آنے والی بحث میں اس بات کی مزید تشریح کریں گے۔ انشاءاللہ۔

مصادر و ماخذ

۱۔ الموسوعہ - ص ۹۴
۲۔ المناقب - ج ۳ - ص ۵۳۳
۳۔ کتاب الارشاد - ص ۳۱۸ اور اعلام الوریٰ - ص ۳۵۷
۴۔ المناقب - ج ۳ - ص ۵۲۶
۵۔ کتاب الارشاد - ص ۳۱۸
۶۔ دور الائمہ از شہید صدر
۷۔ المناقب - ج ۳ - ص ۵۲۶
۸۔ المناقب - ج ۳ - ص ۵۳۵
۹۔ الاحتجاج - ج ۲ - ص ۲۵۰
۱۰۔ کشف الغمہ - ج ۳ - ص ۴۰۷
۱۱۔ کشف الغمہ - ج ۳ - ص ۲۲۲ نیز اعلام الوریٰ - ص ۳۵۴
۱۲۔ مزید معلومات کے لئے رجوع ہو بہ تاریخ الغیبہ از محمد صدر - ص ۲۰۶
۱۳۔ کشف الغمہ - ج ۳ - ص ۲۱۱

۱۴؎ کتاب الارشاد - ص ۳۲۳
۱۵؎ المناقب - ج ۳ - ص ۵۳۶
۱۶؎ المناقب - ج ۳ - ص ۵۲۷
۱۷؎ اثبات الوصیہ - ص ۲۶۲
۱۸؎ کتاب الارشاد - ص ۳۲۳ نیز کشف الغمہ - ج ۳ - ص ۲۰۷
۱۹؎ الغیبہ (شیخ طوسی) - ص ۲۱۵-۲۱۹

امام مہدی علیہ السلام

گزشتہ باتوں سے ہمیں ائمہ معصومینؑ کے بارے میں عباسیوں کی سیاست اور پالیسی کا پتہ چل گیا۔ اور معلوم ہوا کہ وہ ائمہؑ کو سرکاری مشینری میں ضم کرنا چاہتے تھے تاکہ اس طریقے سے ائمہؑ کے لائحہ عمل کو ناکام بنائیں۔ اور ان کے حامیوں سے ان کا رابطہ قطع کردیں۔ عباسیوں کی ظالمانہ سیاست کے نتیجے میں ان کو قہرو غضب اور فقرو مصائب سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔

ظلم و دہشت اور دباؤ کی سیاست نے ائمہؑ کو اپنی سرگرمیاں مخفی رکھنے اور قولی و عملی سرگرمیوں میں خفیہ اشاروں یا رموز سے کام لینے پر مجبور کیا۔ یوں ائمہؑ اپنے دائرۂ اثر میں توسیع کے مرحلے کو چھوڑ کر اپنے وجود کی حفاظت اور مخلص اصحاب کے ساتھ بلاواسطہ روابط قائم کرنے کے مرحلے پر اتر آئے۔ ان لوگوں کے ساتھ براہِ راست روابط سے پہلے ائمہؑ ان کی قوتِ ارادی اور مشکل حالات کے مقابلے میں ان کی پائیداری و ثابت قدمی کو آزماتے تھے۔

یہ مرحلہ (نظریۂ مہدویت کے سائے میں) شیعوں کے دلوں میں انقلابی ارمانوں کی آتش تیز کرنے اور انحرافات کے تھپیڑوں سے اسلام کو بچانے کے لئے مضبوط بنیادوں پر جدوجہد جاری رکھنے کا مرحلہ تھا۔ وہ بھی اس طرح سے کہ

یہ جدوجہد حکومت کے حوالے سے ان کی معقول و متناسب سیاسی اور تحریکی پالیسیوں کے منافی نہ ہو۔

اس موثر اور مثبت کردار کی بدولت حکام وقت ائمہؑ اور ان کے اصحابؓ کے قول و فعل سے ہر وقت سہمے رہتے تھے۔ نتیجہ کے طور پر ائمہؑ کے حامیوں کو متفرق کرنے اور انکو اپنے قائد و رہبر (یعنی امامؑ) سے دور رکھنے کے لئے قید و بند، ظلم و تشدد اور دہشت گردی جیسے وسائل کا سہارا لیتے رہے۔ اکثر و بیشتر ان کا واسطہ زندانوں سے پڑتا اور امامؑ بھی گرفتار کر لئے جاتے۔ یوں کچھ عرصہ زندانوں کی تاریکیوں میں گزارنے کے بعد آپؑ آزاد ہوتے اور کچھ ہی عرصے بعد وہ آپؑ کو دوبارہ گرفتار کر لیتے تھے۔

پابندی، دباؤ اور نگرانی کی سیاست سے ہمیشہ روبرو ہونے کے باوجود امام علی نقی الہادیؑ اور امام حسن عسکریؑ اپنی سرگرمیوں کو خفیہ طور پر جاری رکھنے، پوشیدہ طریقے سے اموال تقسیم کرنے اور اپنی ہدایات و تعلیمات لوگوں تک پہنچانے میں کامیاب رہے۔

ائمہ معصومینؑ کی سرگرمیوں کے خلاف کینہ و عداوت سے لبریز اس ماحول میں عباسی حکومت کو بخوبی معلوم تھا کہ اسے ان نظریات و افکار کے مقابلے میں کیا کرنا چاہئے جن سے مسلمانوں خاص کر محبانِ ائمہؑ کے اذہان لبریز تھے۔ یہ نظریات حضرت مہدیؑ کے بارے میں پیغمبرؐ کے دور سے لے کر امام حسن عسکریؑ کے زمانے تک مسلسل طریقے سے روایت ہونے والی متواتر احادیث کی پیداوار تھے۔ حکمرانوں کو اجمالی طور پر یہ تو معلوم تھا کہ حضرت مہدیؑ کا دور قریب ہے لیکن ان کو آپؑ کی تاریخِ ولادت کا علم نہ تھا کیونکہ آپؑ کی ولادت کو چھپانے کے

لئے مکمل احتیاط اور رازداری سے کام لیا گیا تھا۔ اسی بناء پر امام حسن عسکریؑ کی شہادت کے ایام میں حکمران طبقے کی جانب سے اس خیال سے کہ شاید حضرت مہدیؑ امام حسن عسکریؑ کی کسی زوجہ کے بطن میں موجود ہوں حاملہ عورتوں کی نگرانی کے احکام صادر ہوئے۔

امام مہدیؑ کی ولادت کن حالات میں ہوئی؟

امام حسن عسکریؑ نے اسلامی فتوحات کے دوران اسیر ہو کر آنے والی ایک خاتون سے شادی کی۔ آپؑ نے اس خاتون کے مختلف نام رکھے تھے۔۱۔ بار بار ناموں کی تبدیلی کے پیچھے ایک خاص مقصد کار فرما تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ امام حسن عسکریؑ جانتے تھے کہ یہ خاتون امام مہدیؑ کی ماں بننے والی ہیں۔ نیز یہ کہ ان کو کچھ مدت کے لئے حکام کی طرف سے ظلم و تعدی اور قید و بند کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بنابرایں امامؑ نے ان کی اور ان کے فرزند مہدیؑ کی زیادہ سے زیادہ حفاظت کے پیشِ نظر احتیاطی تدابیر اختیار کیں۔ آپؑ کی کوشش یہ تھی کہ حکامِ وقت کی آنکھوں میں دھول جھونکیں۔ تاکہ انہیں معلوم نہ ہو کہ جسے انہوں نے قید کر رکھا ہے اس کا نام ان ناموں میں سے کونسا ہے۔ ان میں سے کون حاملہ ہے اور کون حضرت (مہدیؑ) کی ماں ہے؟ کیونکہ حکام کا یہی خیال تھا کہ یہ مختلف نام مختلف خواتین کے ہیں۔ وہ اس بات سے غافل تھے کہ ایک ہی خاتون کے کئی مختلف نام ہو سکتے ہیں۔

آپؑ کی ولادت

امام مہدیؑ ۱۵/ شعبان ۲۵۵ ہجری کو متولد ہوئے۔۲۔ پانچ سال تک اپنے

والد (امام حسن عسکریؑ) کا دور دیکھا۔ اس دوران آپؑ کے پدرِ بزرگوار کی سرگرمیوں کے دو محور تھے۔

☆ حکمران طبقے کے حوالے سے مکمل احتیاط اور بچاؤ کی روش اختیار کرنا۔

☆ قریبی افراد اور خواص کو امام مہدیؑ سے روشناس کرانا۔

امام مہدیؑ نے ۵ سال کی عمر میں (۲۶۰ ہجری میں) امامت کی ذمہ داری سنبھالی۔

آپؑ کی کم عمری کوئی تعجب خیز بات نہیں جیساکہ ہم نے امام محمد تقیؑ کے حالات میں اس بات کی وضاحت کردی ہے۔ کیونکہ امامت ایک غیر معمولی خدائی عطیہ ہے جسے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے عطا کرتا ہے۔ پس جو شخص امامت کی شرائط کا حامل ہو خدا اسے منصبِ امامت سے سرفراز فرماتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح حضرت یحییٰؑ کو بچپنے میں نبوت عطا ہوئی۔

(سورہ مریم ۱۹۔ آیت ۱۲)

امام مہدیؑ کے بارے میں امام حسن عسکریؑ کی ذمہ داری

امام مہدیؑ کی ولادت کے بعد آپؑ کے والد (امام حسن عسکریؑ) کو بیٹے کے بارے میں دو قسم کی ذمہ داریوں کا سامنا ہوا۔

(۱) مہدیؑ کے وجود کو تاریخ، امتِ مسلمہ اور اپنے حامیوں کے لئے ثابت کرنا : اس سلسلے میں آپؑ حکومتِ وقت سے محتاط رہے لیکن اس حد تک بھی نہیں کہ مہدیؑ کا وجود مکمل طور سے مجہول ہوجائے اور آپؑ کا نام ہی باقی نہ

رہے۔ اور نتیجہ کے طور پر لوگ آپؑ کے وجود ہی سے انکار کردیں۔ بلکہ آپؑ نے مسلمانوں خاص کر اپنے معتقدین کے لئے مہدیؑ کے وجود کو ثابت کیا تاکہ اس قسم کے خیالات کی نفی کی جائے کہ مہدیؑ کا کوئی وجود ہی نہ تھا یا یہ کہ امام عسکریؑ کا کوئی بیٹا نہیں۔

(۲) امام مہدیؑ کی حفاظت کے لئے اقدامات : کیونکہ حکومت آپؑ کو قتل و تشدد کا نشانہ بنانے کے لئے بہت تگ و دو کا مظاہرہ کررہی تھی۔ حکومت نے پوری قوت کے ساتھ اپنے کارندوں اور جاسوسوں کو چوکس کردیا تھا۔ کیونکہ امام مہدیؑ کی ولادت ان کی حکومتوں کے لئے موت کا پروانہ تھی۔ نیز ان کی سازشوں اور احکامِ اسلام سے ان کی دوری کے بَرملا ہونے کا باعث تھی۔

ان دونوں اہداف کے حصول اور اپنے بیٹے سے متعلق ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے امام حسن عسکریؑ کے اختیار کردہ موقف میں مزید پیچیدگی اور مشکلات حکومت کی طرف سے آپؑ کی مسلسل نگرانی کے باعث پیدا ہوئیں۔ کیونکہ مسلمانوں کے ایک وسیع طبقے کے مذہبی قائد اور حکومت مخالف محاذ کی نمایاں شخصیت ہونے کی حیثیت سے آپؑ کے اوپر حکومت کی کڑی نظر تھی۔

ان حالات کے پیشِ نظر امام حسن عسکریؑ نے اس مشکل مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کے لئے یہ منصوبہ بنایا کہ امام مہدیؑ کی ولادت کا اعلان نہ کیا جائے اور ایسا ظاہر کیا جائے کہ گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ یہاں تک کہ امام حسن عسکریؑ کے گھریلو خادم تک کو اس بات کی بھنک نہ پڑی ۔[۳]

حضرت امام مہدیؑ کی ولادت کو پوشیدہ رکھنے میں امام حسن عسکریؑ کی کامیابی کی ایک وجہ یہ تھی کہ آپؑ نے اپنے اصحاب سے بالمشافہ ملنا ترک کردیا

تھا اور فقط خط و کتابت کے ذریعے رابطہ رکھتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ امامؑ کے حامی عناصر آپؑ کے پردۂ غیبت میں رہ کر اپنے نمائندوں کے ذریعے لوگوں سے روابط رکھنے کے طریقے کے عادی ہوگئے تھے۔

علاوہ ازایں حکومت اور سرکاری مشینری کی توجہ کا صاحبِ زنج کی تحریک ۔۴ (سال ۲۵۵ھ) میں مشغول رہنا بھی آپؑ کی کامیابی کی ایک وجہ تھی۔

خلاصہ یہ کہ امام حسن عسکریؑ اپنے نورِ چشم کو حکامِ وقت اور ان کے چیلوں کے شر سے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ امامؑ ہر اس شخص کو جو آپؑ کے فرزند مہدیؑ کی ولادت سے آگاہ ہو اس امر کو مخفی رکھنے کا حکم دیتے تھے۔ آپؑ نے احمد بن اسحاق کے نام ایک خط میں لکھا کہ۔

"ہمارے ہاں ایک فرزند متولد ہوا ہے۔ یہ خبر تیرے دل میں پوشیدہ رہے اور تمام لوگوں سے مخفی" ۔۵۔

آپؑ لفظ "مہدی" سے کسی کو مطلع کرنے سے سختی سے منع فرماتے رہے۔

"عثمان بن سعید عمری" امامؑ کا نام پوچھنے والوں کو یہ جواب دیتے تھے۔ "اس مسئلے میں جستجو سے پرہیز کرو" ۔۶۔

امام حسن عسکریؑ آپؑ کا واضح نام لینے سے انتہائی گریز کرتے تھے۔ اور اتنا کہنے پر اکتفا کرتے تھے کہ "ھذا صاحبکم" یعنی "یہ تمہارا امامؑ ہے۔" آپؑ نے امام مہدیؑ کا اصلی نام اپنے بہت ہی قلیل ساتھیوں کے سامنے لیا۔

امام حسن عسکریؑ جانتے تھے کہ کسی امامؑ کے نام سے واقفیت اتنی ضروری بات نہیں بلکہ لوگوں کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اپنے مسائل و مشکلات کے سلسلے میں رجوع کرنے کے لئے انہیں کسی امامؑ کی موجودگی کا یقین ہو۔ جب امامؑ کی

ذات کی معرفت ہو جائے اور اس کے وکیلوں کے ذریعے اس سے رابطہ برقرار کرنا ممکن ہو تو پھر اس امامؑ کے نام سے واقف ہونے کی اتنی ضرورت نہیں۔

اپنے ساتھیوں کے درمیان امام مہدیؑ کی ولادت کے بارے میں امام حسن عسکریؑ کا سب سے بڑا اعلان وہ تھا جو آپؑ نے اپنی وفات سے چند ہی دن قبل کیا تھا۔ اس اعلان کے وقت آپؑ کی محفل میں چالیس مخلص افراد موجود تھے۔ ان میں محمد بن عثمان، معاویہ بن حکیم اور محمد بن ایوب وغیرہ بھی شامل تھے۔

آپؑ نے اس محفل میں اپنے فرزند کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا۔

"یہ میرے بعد تمہارے امامؑ اور میرے جانشین ہیں۔ یہ وہی قائم ہیں جن کے انتظار میں لوگ اپنی گردنیں لمبی کئے رہتے ہیں۔

جب زمین ظلم و ستم سے بھر جائے گی تو یہ خروج کرے گا اور اسے عدل و انصاف سے پُر کر دے گا" ۷۔

جعفر بن علی کی مخبری

جعفر امام علی نقیؑ کا بیٹا تھا۔ تاریخی کتابوں میں اس کی زندگی کے حالات کا کچھ یوں تذکرہ ہوا ہے۔ "جب وہ جوان ہوا تو اسلامی تعلیمات سے بیگانہ اور منحرف تھا۔ اس نے لہو و لعب، شراب نوشی اور بے حیائی کا راستہ اپنایا۔"

جعفر کے پدرِ بزرگوار (امام علی نقیؑ) اپنے اصحاب کو اس سے دور رہنے کی تلقین فرماتے اور اس کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کرتے تھے۔ "وہ میرے لئے اسی طرح ہے جس طرح نمرود نوحؑ کے لئے۔ خداوندِ عالم نے اس کے بارے میں فرمایا ہے۔ "نوح نے کہا خدایا میرا بیٹا میرے گھرانے سے ہے۔ خدا نے

جواب دیا اے نوح اس کا تعلق تیرے گھرانے سے نہیں وہ تو بدکاری کا ایک نمونہ ہے"۔۸۔

روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جعفر نے امام مہدیؑ کے خلاف تین قسم کے معاندانہ اقدامات کئے جو یہ ہیں۔

- ☆ اپنے بھائی امام حسن عسکریؑ کے بعد امامت کا دعویٰ کیا۔
- ☆ یہ دعویٰ کیا کہ امام حسن عسکریؑ کا کوئی شرعی وارث نہیں اور وہ خود امامؑ کے ترکے کا حقدار ہے۔
- ☆ جب امام مہدیؑ نے اپنے حق پر دلیل قائم کی تو اس نے حکامِ وقت کو آپؑ کی موجودگی کا احتمال دیا۔ چنانچہ پکڑ دھکڑ، تشدد اور وسیع تلاش کا سلسلہ شروع ہوا۔ یوں امامؑ کا خاندان ظلم و تشدد کا نشانہ بنا۔ لیکن آخرکار وہ امام مہدیؑ کا کھوج لگانے میں ناکام ہوئے۔

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جب جعفر نے خلیفہ "معتمد" کو امام مہدیؑ کے خفیہ طور پر موجود ہونے کی اطلاع دی تو اس نے فوری طور پر اپنے کارندوں اور سواروں کو امام حسن عسکری علیہ السلام کے گھر کی تلاشی لینے کے لئے بھیج دیا۔ گھر کے کونے کونے کی تلاشی لی گئی لیکن کچھ حاصل نہ ہوسکا۔ واپس لوٹتے وقت انہوں نے گھر کا سامان لوٹنے کی ٹھانی۔ جب وہ سامان لوٹنے میں مشغول تھے تو امام مہدیؑ موقع پاکر باہر نکل گئے لیکن کوئی آپؑ کو نہ دیکھ سکا۔ یوں آپؑ ان کی نظروں سے مخفی ہوگئے۔ اس وقت آپؑ کی عمر چھ سال تھی۔۹۔

حکومت کے چیلوں کو کچھ پتہ ہی نہ تھا کہ وہ کسے تلاش کررہے ہیں اور کسے پائیں گے۔ امامؑ کے بارے میں ان کا تصور مبہم تھا اسی لئے بعید نہیں کہ وہ لوٹ

کھسوٹ میں مگن ہونے کی وجہ سے اس بچے کی موجودگی کی طرف متوجہ ہی نہ ہو سکے ہوں اور آپؑ ان کی موجودگی میں نہایت سادگی اور سکون کے ساتھ باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

آخرکار انہوں نے حضرت مہدیؑ کی والدہ "صقیل" کو گرفتار کرلیا اور مزید تحقیق کے لئے متعلقہ افراد کے پاس بھیج دیا۔ تاکہ وہ ان سے اس بچے کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ لیکن آپ نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے کوئی بچہ نہیں جنا اور اس بات پر ثابت قدم رہیں کہ کسی طرح بھی راز فاش نہ ہونے پائے۔ اس طرح آپ کا فرزند ظلم و تعدی سے محفوظ رہا۔

امام مہدیؑ کی والدہ نے نہایت ثابت قدمی اور اخلاص کے ساتھ ظلم و تشدد کی مختلف شکلیں برداشت کیں اور کوشش کی کہ تحقیق کرنے والے حکام کو دھوکہ دیں۔ چنانچہ آپ نے حاملہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ حکام سوچ میں پڑ گئے اور یہ احتمال دینے لگے کہ جس حمل کا آپ دعویٰ کر رہی ہیں شاید مطلوبہ بچہ وہی ہو۔ خاص کر ان حالات میں جب کہ حکومت کو امام حسن عسکریؑ کے زمانے سے ہی حضرت مہدیؑ کی ولادت کا انتظار ہونے کے باوجود آپؑ کی زندگی کے بعد بھی کوئی بچہ دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ اور چونکہ ان کو آپؑ کے پیدا ہو چکنے کا یقین نہ تھا اس لئے انہوں نے بچہ جننے تک اس کنیز کی نگرانی کرنے پر اکتفا کیا تاکہ جو ہستی متولد ہو اس سے نمٹا اور نجات حاصل کی جائے۔

حکام نے فوراً اس خاتون کی کڑی اور مسلسل نگرانی شروع کردی۔ انہوں نے ان کو معتمد، موفق اور قاضی ابن ابی الشوراب کی خواتین کے ساتھ رکھا اور ایک لمحے کے لئے بھی ان سے غافل نہ رہے۔ یہاں تک کہ طویل عرصہ گزر گیا

لیکن کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوا۔ آپ دو سال اسی حالت میں مقید رہیں۔ آخر کار حکومت مختلف مشکلات اور کئی محاذوں پر جنگوں میں پھنس جانے کی وجہ سے اس مسئلے کو بھول گئی۔ یوں آپ ان سے بعافیت جان چھڑا کر نکلنے میں کامیاب ہوئیں ۔۱۰۔

غیبتِ صغریٰ

غیبتِ صغریٰ کی ابتداء ۲۶۰ھ میں ہوئی اور ۳۲۹ھ تک جاری رہی۔

امامؑ کی غیبت سے مراد یہ نہیں کہ آپؑ نے لوگوں اور ان کے مسائل و مشکلات سے دوری اختیار کرلی تھی۔ بلکہ امامؑ اسلام کے مفادات اور حالات کے تقاضوں کے عین مطابق ایک بے مثل رہنما کی حیثیت سے اپنی تیزبین فکرو نظر کے ساتھ امت اور اپنے حامیوں کے ہم و غم اور آرزوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ فکری و عملی میدانوں میں ان کے ساتھ آپؑ کا رابطہ برقرار تھا۔

امامؑ اپنے بعض برگزیدہ اصحاب کے ساتھ براہِ راست ملتے تھے اور ان کو اس بات کی نصیحت فرماتے تھے کہ جو کچھ انہوں نے دیکھا ہے اسے لوگوں سے بیان کریں۔ البتہ جگہ اور اس قسم کی دیگر خصوصیات کا ذکر نہ کریں جن سے حکمرانوں کو آپؑ کا سراغ لگانے میں مدد مل سکے۔ آپؑ اپنے قابلِ اعتماد وکیلوں اور نمائندوں کے ذریعے اپنی خدمت میں پہنچنے والے اکثر مسائل کا جواب دیتے تھے۔ آپؑ کے نمائندوں کے علاوہ دیگر افراد کی آپؑ تک رسائی ممکن نہ تھی۔ سوائے ان لوگوں کے جن کے بارے میں یہ ثابت ہو کہ وہ مخلص اور اسرار کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

آپؑ ان کو حکم دیتے تھے کہ آپؑ کا اصلی نام نہ لیں۔ بلکہ اس کے بدلے القاب وغیرہ (مثلاً القائم، العزیم، الحجہ، صاحب الزمان اور اسی طرح کے دیگر الفاظ) سے یاد کریں۔ کیونکہ اگر حکام کو نام کا علم ہوتا تو اس کی تشہیر کرتے اور اگر جگہ کا علم ہوتا تو اس کی نشاندہی کرتے۔ امامؑ مسلسل اپنی اقامت گاہ بدلتے رہتے تھے لیکن کسی کو اس کی خبر ہونے نہ دیتے۔

حکام کی طرف سے امامؑ کی تلاش

امامؑ کی گرفتاری حکومت کے بڑے اہداف میں شامل تھی۔ کیونکہ امامؑ کا وجود حکام کی نظر میں ان کی حکومت کے لئے خطرناک تھا۔ اسی لئے امامؑ کے خطرے سے حکومت کو بچانے کے لئے زبردست تگ و دو اور آپؑ کو گرفتار کرنے کے لئے کارروائیوں کا سلسلہ شروع کیا۔ عباسی حکام نے امامؑ کی گرفتاری کے لئے تین مرتبہ دہشت آمیز کارروائیاں کیں اور آپؑ کے گھر پر چھاپے مار کر مکمل تلاشی لینے کا حکم دیا۔

تمام حکام کی مستقل سیاست یہ رہی کہ امامؑ کی خفیہ اقامت گاہ کا کھوج لگانے اور آپؑ کو گرفتار کرنے کے لئے مسلسل جستجو اور غیر معمولی احتیاط سے کام لیا جائے۔ لیکن انیس سال تک ایک طرف سے آپؑ کے نمائندوں کی سرگرمیوں اور دوسری جانب سے حکومت کی مسلسل جستجو آمیز کوششوں کے نتیجے میں ایک نئی چیز سامنے آئی اور وہ تھی (امامؑ کی) سفارت (نیابت) کا مسئلہ واضح ہو کر حکومت کے سامنے آنا۔ اور یہ بات ثابت ہوگئی کہ امامؑ کے نائبین خفیہ طور پر امامؑ کے لئے اموال جمع کرنے میں مصروف ہیں۔ علاوہ ازایں حکومت کو

اس بات کا بھی یقین ہوگیا کہ شیعوں کی نگہبانی اور رہنمائی کرنے اور ان سے اموال وصول کرنے والی ایک آگاہ قیادت بھی موجود ہے۔ اس اہم اور جدید حقیقت کے پیشِ نظر خلیفہ معتضد خلافت سنبھالتے ہی اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کی سب سے بڑی ذمہ داری امامؑ کی گرفتاری کے لئے فوری طور پر نئے سرے سے چھاپوں کا سلسلہ شروع کرنا ہے۔ چنانچہ حکومت کے کارندوں اور جاسوسوں نے ایک مکمل پلان تیار کیا تاکہ معتضد کو امامؑ کے گھر اور آپؑ کے وہاں مخفی ہونے سے باخبر کریں۔ معتضد نے تین افراد کو بلایا اور ان کو حکم دیا کہ وہ نہایت سادگی کے ساتھ سامراء کا سفر کریں اور اپنے ساتھ کوئی چیز نہ لے جائیں (سوائے ایک سواری کے گھوڑے کے)۔ یہ بھی حکم ملا کہ وہ الگ الگ سفر کریں۔ خلیفہ نے ان کو سامراء میں ایک محلے اور گھر کی نشاندہی کی اور کہا کہ "جب وہاں پہنچو گے تو دروازے پر ایک سیاہ فام غلام کو پاؤ گے پس اس گھر پر چھاپہ مارو اور جو بھی اس گھر میں ملے اس کا سر لے کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ" ۔۱۱

معتضد نے ان تینوں کو اصل مقصد سے آگاہ نہ کیا اور انہیں نہیں بتایا کہ در حقیقت وہ امام مہدیؑ کی گرفتاری پر مامور ہیں تاکہ اس کی حکومت پر بدنامی کا داغ نہ لگے اور دوسروں کو اس کی خبر نہ ہو۔ تاکہ اسے اس کے بُرے نتائج کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہ بات اتنی اہم تھی کہ اس کے فاش ہونے کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی۔

بہرحال معتضد کے حکم کے مطابق کارروائی شروع ہوئی۔ انہوں نے سامراء جاکر مطلوبہ گھر پر ہلہ بول دیا اور اس کا چپہ چپہ چھان مارا۔ امامؑ اسی گھر میں موجود تھے لیکن سرکاری کارندے آپؑ کی طرف متوجہ نہ ہوئے اور آپؑ ان

سے بچ نکلے جو ایک معجزہ تھا۔ اس واقعے کا تاریخ میں مزید تفصیل کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ ۱۲؎

معتضد نے یہ سوچا کہ یہ چھاپہ سپاہیوں کی کم تعداد اور نہایت خفیہ ہونے کی بناء پر ناکامی سے دوچار ہوا ہے۔ اس لئے اس نے ایک وسیع تر حملے کا منصوبہ بنایا۔

بحار الانوار کے مولف نے اس واقعے کو یوں بیان کیا ہے۔

"اس کے بعد انہوں نے مزید سپاہی بھیجے۔ جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو تہہ خانے سے تلاوتِ قرآن کی آواز آئی۔ پس وہ تہہ خانے کے دروازے پر جمع ہوگئے اور پہرہ دینے لگے تاکہ نہ کوئی تہہ خانے میں داخل ہوسکے اور نہ وہاں سے خارج ہوسکے۔ لشکر کا سردار اس انتظار میں کھڑا رہا کہ پورا لشکر پہنچ جائے۔ اسی دوران امامؑ اس راہ گزر کے ذریعے باہر آئے جو تہہ خانے کے دروازے پر موجود تھی۔ آپؑ ان کے سامنے سے گزرے اور جب ان کی نظروں سے اوجھل ہوئے تو سردار نے کہا نیچے اترو۔ سپاہی بولے کیا وہ تمہارے سامنے سے نہیں گزرا؟ بولا میں نے تو نہیں دیکھا۔ لیکن تم نے اسے کیوں چھوڑا؟ بولے ہم نے سمجھا تھا کہ آپ نے اسے دیکھا ہے۔"

لطف کی بات یہ ہے کہ ان سپاہیوں نے امامؑ کو پکڑنے کے لئے کوئی بروقت اقدام نہ کیا بلکہ الٹے دروازے پر آپؑ کی محافظت کرتے رہے۔ وہ آپؑ کے سامنے آنے سے کتراتے تھے اور بغداد سے مزید کمک پہنچنے کے منتظر تھے۔ اس انتظار کے دوران امامؑ کو محاصرے سے نکلنے کا بہترین موقع فراہم ہوا۔ یہ وہ لحظہ

تھا جس میں ہم امامؑ کی زیرکی، بروقت اقدام کی صلاحیت، حسنِ تدبیر اور الطافِ الٰہی کے جلوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ عین وہی لحظہ تھا جب سردارِ لشکر امامؑ کی نگرانی سے غافل ہوچکا تھا۔ اسے مدد کا انتظار تھا اور ابھی تک کارروائی کا حکم صادر نہیں ہوا تھا۔ اگر امامؑ سے مزید چند لمحوں کی تاخیر ہوجاتی تو آپؑ لامحالہ ان کے ہاتھوں گرفتار ہوجاتے۔

امامؑ اور ٹھوس تنظیمی عمل

احادیث اور تاریخی حوالوں کے مجموعی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ اپنے پیروکاروں اور حامیوں کے ساتھ روابط کے سلسلے میں ایک ٹھوس درجہ بندی شدہ اور منظم تنظیمی ڈھانچے سے استفادہ فرماتے تھے۔ امامؑ بذاتِ خود اس تنظیم کے سربراہ تھے اور اپنی سرگرمیاں خفیہ طریقے سے انجام دیتے تھے۔ آپؑ اپنے نائبین کے لئے براہِ راست احکام و فرامین صادر فرماتے اور ان کو اپنی تعلیمات سے نوازتے تھے۔ یہ نائبین آپؑ کے اور دور دراز علاقوں میں آپؑ کے دیگر نمائندوں کے درمیان رابطہ برقرار کرنے کا ذریعہ تھے۔ گویا یہ نمائندے مذکورہ نائبین اور امامؑ کے حامی وسیع عوامی حلقوں کے درمیان رابطے کے لئے پُل کی حیثیت رکھتے تھے۔

امامؑ نمائندوں کے ساتھ اپنے روابط کو مبہم رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے ساتھ آپؑ کے تعلقات ہر خاص و عام کے لئے مکمل طور پر مبہم اور غیر مشخص تھے۔ سوائے آپؑ کے سفیر (نائبِ خاص) کے جو براہِ راست رابطے کے ذمہ دار تھے۔ ممکن ہے کہ سفیر (نائبِ خاص) کو امامؑ نے اس امر کا ذکر ہر ایک کے پاس

کرنے سے منع کر رکھا ہو۔

امامؑ کسی شخص کو اپنا نائبِ خاص (سفیر) مقرر کرتے وقت اس کے اندر اخلاص کی گہرائی اور قوتِ برداشت کی مضبوطی کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ تاکہ وہ حکام کے ہاتھوں گرفتار ہونے کی صورت میں ثابت قدم رہیں۔ امامؑ یہ شرط نہیں رکھتے تھے کہ آپؑ کا سفیر (نائبِ خاص) علم و فقاہت کے لحاظ سے سب سے آگے ہو۔ کیونکہ سفارت و نیابت آپؑ کے احکام کو آگے پہنچانے کے لئے ایک وسیلے اور ذریعے کا نام تھا۔ اسی لئے علم و فقاہت کے لحاظ سے افضل فرد کی موجودگی کے باوجود یہ عہدہ کسی مفضول (کمتر درجے کے حامل فرد) کو دینا صحیح تھا۔ بشرطیکہ اس میں اخلاص اور قوتِ ارادی زیادہ ہو۔

ایک مرتبہ بعض لوگ اس سلسلے میں "ابو سہل نوبختی" کے پاس اعتراض کرنے آئے اور کہا۔ کیونکر امامؑ کی نیابت "شیخ ابوالقاسم حسین بن روح" کو ملی اور تمہیں نہ ملی؟ نوبختی نے کہا وہ (امامؑ) بہتر جانتے ہیں کہ ان کو کیا کرنا چاہیے۔ میں ایسا شخص ہوں جو مخالفین سے روبرو ہوا کرتا ہوں اور ان سے بحث کرتا ہوں۔ اگر "ابوالقاسم" کی طرح مجھے پتہ ہوتا کہ امامؑ کہاں ہیں اور حکومت مجھ پر دباؤ ڈالتی تو شاید میں ان کو آپؑ کا پتہ بتا دیتا۔ لیکن "ابوالقاسم" وہ ہستی ہیں کہ اگر "حضرتِ حجتؑ" اس کے دامن کے نیچے بھی پوشیدہ ہوں تب بھی وہ آپؑ کے بارے میں کچھ نہ بتائے گا۔ اگرچہ قینچی سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ ۱۳؎

اس تنظیم کے اندر امامؑ کے سفیروں (نائبینِ خاص) کی ذمہ داری کا دائرہ وسیع اور ہمہ گیر تھا۔ لیکن دیگر وکیلوں کا دائرۂ کار اپنے علاقوں تک محدود تھا۔ ان

کی ذمہ داری سفیر (نائبِ خاص) کے امور میں آسانی پیدا کرنا اور انہیں توسیع دینا تھی۔ خاص کر ان حالات میں جب کہ زیرِ زمین اور خفیہ سرگرمیوں کی راہ میں موجود مشکلات کی بناء پر آزادی کے ساتھ جدوجہد نہیں ہو سکتی تھی اور نہ ہی عوام کے درمیان موجود حامی عناصر (جو مختلف اسلامی خطوں میں پھیلے ہوئے تھے) کے ساتھ براہِ راست اور آزاد روابط برقرار رکھے جاسکتے تھے۔ بنابرایں امامؑ کے حامیوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد تک آپؑ کی تعلیمات اور ہدایات پہنچانے کے لئے ان نمائندوں کی سرگرمیاں سب سے زیادہ موثر تھیں۔

اس مختلف درجات و مدارج پر مشتمل تنظیمی ڈھانچے کے اندر نمائندوں (وکیلوں) کی موجودگی کے نظریے نے سفیر اور اس کے نام کو خفیہ و پوشیدہ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بنابرایں جو شخص امامؑ کے وفادار حلقوں سے ملحق ہوتا (اور "نظریہ سفارت" سے آگاہ بھی ہوتا) وہ آپؑ کے عام نمائندوں میں سے کسی ایک ہی کے ساتھ رابطہ برقرار کر سکتا تھا۔ اسے امامؑ کے نائبِ خاص (سفیر) کے نام، اس کے کاموں اور اس کی جگہ کا کوئی علم نہ ہو سکتا تھا۔ ۱۴

لوگوں کے شرعی وجوہات اور اموال امامؑ کی خدمت میں پہنچتے تھے جو اولاً تو سفیروں کے ذریعے، ثانیاً دیگر وکیلوں کے توسط سے مناسب مصارف میں خرچ ہوتے تھے۔ ان اموال کا کچھ حصہ براہِ راست امامؑ کے پاس پہنچتا تھا اور کچھ حصہ وکیل حضرات اسلامی احکام اور اصولوں کے مطابق اپنی صوابدید سے مناسب امور میں خرچ کرتے تھے۔ امام کے سفیروں (نواب) کی ایک ذمہ داری امامؑ اور لوگوں کے درمیان سوال و جواب کے تبادلے کا کام انجام دینا بھی تھی۔ ان سوالوں میں فقہ اور عقائد سے متعلق سوالات کے علاوہ امامؑ کی خدمت میں

پیش ہونے والے دیگر مسائل بھی شامل تھے۔

نوابِ اربعہ کا تذکرہ

نوابِ اربعہ یا سفراء اربعہ سے مراد وہ چار ہستیاں ہیں جو غیبتِ صغریٰ کے دوران امامؑ کے نائبینِ خاص کی حیثیت سے کام کرتی رہیں۔ ان چار حضرات کے نام تاریخی تسلسل اور ترتیب کے لحاظ سے یہ ہیں۔

(۱) عثمان بن سعید العمری (۲) محمد بن عثمان العمری (۳) حسین بن روح نوبختی
(۴) علی بن محمد سمری۔ ۱۵۰

ان چاروں کی زندگی کے بعد غیبتِ صغریٰ کا دور بھی ۳۲۹ھ میں ختم اور غیبتِ کبریٰ کا زمانہ شروع ہوا۔ ان نائبین نے امامؑ کی قیادت میں آپؑ کے حامیوں کی فکری و عملی رہنمائی، ان کے درمیان پیغام رسانی، آپؑ کے خطوط پہنچانے اور شیعوں کی مشکلات حل کرنے کے سلسلے میں تن دہی سے اپنی ذمہ داریاں انجام دیں۔ وہ اپنی سرگرمیاں نہایت خفیہ طریقے سے انجام دیتے ہوئے حکام کو ان کی بھنک بھی پڑنے نہیں دیتے تھے تاکہ ظلم و تشدد اور پوچھ گچھ سے روبرو ہوئے بغیر امامؑ کی قیادت میں کام کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع پا سکیں۔

جن اسباب کی بناء پر ان نائبین نے مذکورہ طریقہ اپنایا وہ درجِ ذیل امور ہو سکتے ہیں۔

(۱) حکومت کا علویوں کے خوف کی بناء پر ان کے رؤساء اور بزرگوں کی ایک بڑی تعداد کو ظلم و تعدی کا نشانہ بنانا۔ نمونے کے لئے علویوں کی وہ معتدبہ تعداد کافی ہے جو حکمرانوں کے ہاتھوں تہہ تیغ ہوئی۔ ان کا ذکر ابوالفرج اصفہانی نے

"مقاتل الطالبین" میں کیا ہے۔ ۱۶

طوسی "کتاب الغیبہ" میں رقم طراز ہیں۔

"معتضد کی تلوار خون آشام تھی" ۔۱۷۔ "اس کا دور ظلم و جور اور خون ریزی سے عبارت تھا" ۔۱۸۔

(۲) گھٹن اور بے چینی کا وہ ماحول جس کا امامؑ کے حامیوں خاص کر نوابِ اربعہ کو سامنا کرنا پڑا : نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ امامؑ کے پہلے نائبِ خاص "عثمان بن سعید" اموال کو گھی کے مشکوں میں چھپا کر منتقل کیا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ حکومت کی سخت گیری سے واقف تھے۔ اور جانتے تھے کہ اگر حکومت کو علم ہوا اور کوئی ثبوت ہاتھ لگا تو کس قدر سخت سزا بھگتنی پڑے گی۔

(۳) امام مہدیؑ کی غیر معمولی اور مسلسل تلاش، آپؑ کو گرفتار کرنے کی جدوجہد اور آپؑ کے گھر پر منظم چھاپے : پس جب امامؑ کے ساتھ حکومت کا رویہ یہ تھا تو پھر آپؑ کے معتقدین اور حامیوں کی بات ہی اور تھی۔

امامؑ کے نائبین ان اموال کی وصولی اور تقسیم میں رابطہ کا کام انجام دیتے تھے جو امامؑ کے معتقدین مختلف علاقوں سے آپؑ کی خدمت میں ارسال کرتے تھے۔ مختلف علاقوں سے وفود اموال اور سوالات لے کر سفیر کے پاس پہنچتے اور اموال کو ان کے حوالے کرتے۔ پھر اپنے سوالات کا جواب اور مشکلات کا حل حاصل کر کے واپس چلے جاتے تھے۔

بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیبت کے ابتدائی برسوں میں لوگ اموال کو سامراء لے جاتے تھے جہاں ان کو وصول کر کے امامؑ تک پہنچانے کے لئے کوئی ذمہ دار فرد موجود ہوتا تھا۔ یہ کام سفیر کی رہنمائی میں ہوتا تھا۔ جیسا کہ

"ابو جعفر عمری" اور "دینور" کے واقعے سے ظاہر ہے۔۱۹۔

اس کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا اور سفیر خود اموال کو وصول کرکے رسید دیتے رہے۔۲۰۔

اموال کی وصولی اور تقسیم کا کام حکومت کی نظروں سے چھپا کر انجام پاتا تھا۔ اس کا اظہار بہت ہی کم موقعوں پر ہوتا تھا۔ عام طور پر تقسیم کا عمل تجارت کی شکل میں ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر جس شخص تک کوئی مال پہنچانا مقصود ہوتا اس کو قرض خواہ ظاہر کیا جاتا۔ اس طرزِ عمل کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کے شکوک میں اضافہ نہ ہونے پائے۔ امامؑ کے نمائندے متعدد موقعوں پر چغل خوروں کے ساتھ دلچسپ اور مختلف طریقوں سے نمٹتے تھے۔

مثلاً ایک بار "عبداللہ بن سلیمان" (وزیر) کو اطلاعات موصول ہوئیں کہ امام مہدیؑ کے نمائندے بغداد اور دیگر مقامات پر امامؑ کے لئے کام کررہے ہیں۔ وزیر کو مشورہ دیا گیا کہ وہ ہر نمائندے کے پاس کسی کو بھیجے جو یہ ظاہر کرے کہ اس کے پاس امامؑ کی خدمت میں بھیجنے کے لئے کچھ مال موجود ہے۔ پس جو نمائندہ اس مال کو وصول کرے یہ اس کے خلاف ثبوت متصور ہو اس طرح وہ رنگے ہاتھوں گرفتار ہوجائے گا۔ وزیر نے اس سازش کو عملی جامہ پہنایا۔ لیکن اس سے قبل امامؑ کی ہدایات آپؑ کے وکیلوں کو مل چکی تھیں۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک نے سرکاری کارندوں کے سامنے نمائندگی سے لاتعلقی کا اظہار کیا۔ اور انجان بن بیٹھے۔ یوں وزیر کی سازش ناکام ہوئی اور امامؑ کے نمائندے حکام کی سازش کے جال میں نہ پھنس سکے۔۲۱۔

امامؑ کے نائبینِ خاص کی دیگر سرگرمیوں میں مشکل علمی مسائل کو حل کرنا

اور نظریاتی بحثوں میں حصہ لینا بھی شامل تھا۔ اس کا مقصد اپنے ہم فکروں کی رہنمائی کرنا یا غیر اسلامی نظریات اور اعتراضات کو دلیلوں سے باطل ثابت کرکے اسلام کا دفاع کرنا تھا۔ ۲۲۔

سفارت (نیابتِ خاص) کے اہداف

امام مہدی علیہ السلام کی نیابت کے مطالعے سے دو مقاصد کی نشاندہی ہوتی ہے۔

(۱) غیبتِ کبریٰ کے تصور سے لوگوں کو آشنا کرنے کے لئے ذہنی آمادگی پیدا کرنا اور ان کو غیبت کا عادی بنانا تاکہ پیشگی اقدامات کے بغیر اچانک غیبتِ کبریٰ کے وقوع کا دھچکا نہ لگے۔ اگر پیشگی تیاریوں کے بغیر غیبتِ کبریٰ واقع ہوتی تو شاید یہ امر امام مہدیؑ کے وجود سے انکار کا باعث ہوتا۔

اسی بات کے پیشِ نظر امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ نے امت کی نظروں سے بتدریج غائب رہنے کی پالیسی اپنائی تھی۔ امام حسن عسکریؑ نے اس عمل کی شرح میں اضافہ کیا (یعنی زیادہ عرصہ لوگوں کی نظروں سے غائب رہے) اسی طرح امام مہدیؑ نے بھی اس امر میں تدریجاً مزید اضافہ کیا۔ آپؑ کی خصوصی نیابت کا زمانہ بھی اس مرحلہ وار اور تدریجی پالیسی کی ایک کڑی تھا جس کا مقصد لوگوں کے اندر آہستہ آہستہ ذہنی آمادگی پیدا کرنا تھا۔

(۲) نمائندوں سے امامؑ کے حامی عوامی حلقوں کی دیکھ بھال اور ان کے درمیان ارتباط کا کام لینا تاکہ امام علیہ السلام کی غیبتِ کبریٰ کے بعد ان کے مفادات محفوظ رہیں اور ان کے امور بدستور چلتے رہیں۔

آپؑ کے نائبینِ خاص نے اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کو بطریقِ احسن نبھایا۔ کیونکہ انہوں نے امامؑ کے حامیوں کے مفادات محفوظ رکھنے کے لئے پیچیدہ ترین سیاسی و سماجی ماحول میں تن دہی سے کام کیا۔

امام مہدیؑ کی سفارت (خصوصی نیابت) کا سلسلہ انہتر سال چھ ماہ اور پندرہ دن کے عرصے تک جاری رہا۔ یہی غیبتِ صغریٰ کا عرصہ ہے۔ اس پوری مدت میں پہلے نائبِ خاص "عثمان بن سعید" کی مدتِ نیابت پانچ سال، دوسرے نائب "محمد بن عثمان" کی مدت چالیس سال اور تیسرے سفیر "حسین بن روح" کی اکیس سال تھی۔ ان کے بعد آخری اور چوتھے سفیر "علی بن محمد سمری" تین سال تک نیابت و سفارت کی ذمہ داری نبھاتے رہے۔

جب ۳۲۹ھ میں غیبتِ صغریٰ کا دور ختم ہوا تو اس وقت امامؑ کی عمر چوہتر سال تھی جن میں سے ساڑھے چار سال آپؑ نے اپنے پدرِ بزرگوار کے ساتھ گزارے اور انہتر سال چھ ماہ پندرہ دن غیبتِ صغریٰ کی صورت میں گزارے۔ اس کے بعد غیبتِ کبریٰ کا دور شروع ہوا اور یہ سلسلہ اس دن تک جاری رہے گا جب خداوندِ عالم آپؑ کو خروج کی اجازت عنایت فرمائے گا۔ تاکہ آپؑ زمین کو عدل و انصاف سے اسی طرح پُر کردیں جس طرح وہ ظلم و جور سے پُر ہو چکی ہوگی۔

❑ ❋ ❑

مصادر و ماخذ

۱۔ آپؑ کے ناموں اور مزید معلومات کے لئے رجوع ہو بہ طرف "تاریخ الغیبہ" از محمد صدر اس بحث میں ہم نے ان کے متعدد نظریات سے استفادہ کیا ہے۔

۲ـ کتاب الارشاد - ص۳۲۶ اور اعلام الوریٰ - ص ۲۹۳

۳ـ تاریخ الغیبہ از محمد صدر نقل از اکمال الدین - ص ۲۷۳

۴ـ یعنی زنگیوں کی بغاوت

۵ـ تاریخ الغیبہ از محمد صدر نقل از اکمال الدین - ص۲۷۶

۶ـ تاریخ الغیبہ از محمد صدر نقل از اکمال الدین - ص۲۷۸

۷ـ تاریخ الغیبہ از محمد صدر نقل از اکمال الدین - ص ۲۸۳

۸ـ تاریخِ سامراء - ج۲ - ص۲۵۱ نقل از کتاب مدینۃ المعاجز

۹ـ الخرائج والجرائح - ص ۱۶۴

۱۰ـ الکامل - ج۶ - ص۱۵ نیز تاریخ طبری

۱۱ـ الغیبہ - (طوسی) - ص۱۴۹ نیز بحار الانوار - ج ۱۲ - ص۸

۱۲ـ الخرائج والجرائح - ص۶۷

۱۳ـ الغیبہ (طوسی) - ص۲۴۰ نیز بحار الانوار - ج ۱۳ - ص۹۸

۱۴ـ منتہی المقال - ج۱ - ص۲۴۱

۱۵ـ ان کی زندگی کے حالات کے مطالعے کے لئے رجوع ہو بہ کتاب الغیبہ (طوسی)

۱۶ـ المقاتل از اصفہانی

۱۷ـ الغیبہ (طوسی) - ص۱۷۹

۱۸ـ عقیدۃ الشیعہ - ص۲۵۷ از رونلڈسن

۱۹ـ بحار الانوار - ج ۱۳ - ص۷۹

۲۰ـ کتاب الارشاد - ص۳۳۵

۲۱ـ اعلام الوریٰ - ص۴۲۱

۲۲ـ الغیبہ (طوسی) - ص۲۳۹ نیز الاحتجاج - ص۲۸۸

اختتامیہ

خلاصہء بحث

ہماری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جب سے اسلام کا عملی تجربہ انحراف کا شکار ہوا اور امتِ مسلمہ قیادت سے محروم ہوئی ائمہء معصومینؑ نے اسلام کو درپیش مسائل و مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک مشترکہ کردار ادا کیا۔

ائمہؑ کی درخشندہ تاریخ کے اس مطالعے سے معلوم ہوا کہ تغیر و اصلاح کا اسلامی اسلوب ایک بے لچک اور یکسانیت پر مبنی اسلوب نہیں جس کے بارے میں غور و فکر کی ضرورت ہی نہ ہو بلکہ ہمیں ہردم اپنے عملی اسالیب کو معصومینؑ کے عملی تجربات کی روشنی میں پروان چڑھاتے رہنا چاہئے کیونکہ عملی اسالیب بھی دعوت و مذہب کو درپیش خارجی حالات کے تبدل و اختلاف کے مطابق مسلسل ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر اصلاحی اور انقلابی تحریکوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے گرد و پیش کے حالات اور مواقف کو مدِّنظر رکھیں اور ان کی روشنی میں کوئی لائحہء عمل اپنائیں۔ نیز ائمہؑ کے عملی تجربات سے راہنمائی حاصل کریں اور

کسی خاص مسئلے میں ائمہؑ کے کسی خاص اقدام سے چمٹ کر جمود کا شکار نہ ہوں۔ ★

بلکہ درپیش حالات اور حقائق کے تقاضوں اور جدید ضرورتوں کو پیشِ نظر رکھ کوئی لائحہ عمل اختیار کریں۔ یوں ہر اس جائز اسلوب سے استفادہ کیا جائے جو ہمارے جامع اسلامی و اصلاحی عمل سے ہم آہنگ ہو۔

ہم نے اپنی بحث میں ان خود ساختہ اور کھوکھلے اسالیب سے گریز کیا ہے جن کا سارا زور ائمہؑ کے فضائل و مناقب پر ہی اکتفا کرنا ہے۔ یا ائمہؑ کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور اعلیٰ پالیسیوں میں تحریف کرنا ہے۔ جیسا کہ ہم اکثر و بیشتر سنتے اور پڑھتے رہتے ہیں۔ بلکہ ہم نے ان مجاہدانہ کارناموں سے استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے جن کو انہوں نے اپنے پاک خون، اپنی صبر آزما جدوجہد اور کامیاب عملی پالیسیوں سے رونق بخشی ہے۔

ائمہ معصومینؑ کی کارکردگی کے جامع مطالعے کی بدولت ہم انقلابی و اصلاحی عمل کی انجام دہی کے بارے میں ایک اہم نتیجے پر پہنچے اور وہ یہ کہ ہر قسم کی انفرادی اور غیر مربوط جدوجہد جو کسی منظم اصلاحی منصوبے کی کڑی نہ ہو ناکامی سے دوچار ہوتی ہے۔ بلکہ یہاں ایسے بیدار و آگاہ اور برگزیدہ مبلغین کی ضرورت ہے جو اسلام کے عظیم اصلاحی پروگرام کے لئے امت کو تیار کریں۔ ہاں اس سے پہلے خارجی حقائق کا ملاحظہ نیز عقلی، فکری، نفسیاتی اور معاشرتی حالات و

★ یعنی یہ کہ معصومینؑ کے کسی خاص اقدام کو بہانہ بنا کر ہر قسم کے حالات اور ماحول میں فقط اسی قسم کے عمل پر ڈٹ جانا درست نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ جن حالات اور تقاضوں کے مدِ نظر کسی معصومؑ نے وہ اقدام کیا تھا وہ حالات اور ان کے تقاضے اب موجود نہ ہوں بلکہ جدید حالات کے تقاضے کچھ اور ہوں۔ (مترجم)

مسائل کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ ان کی روشنی میں عملی کام شروع کیا جائے۔ رہا عوام کے گرم جذبات پر ہی اکتفا کرنا اور ایک مربوط و ہمہ گیر جدوجہد کی بجائے انفرادی حیثیت سے لوگوں کے درمیان فکری کام کرنا تو بدیہی بات ہے کہ اس قسم کے جزئی اعمال کا نتیجہ ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

بنابراین ائمہؑ کی اصلاحی و انقلاب آفرین جدوجہد کبھی بھی جذباتیت کے حامل لوگوں کی کثرت کے بل بوتے پر قائم نہیں رہی، جو تقریروں سے جوش میں آتے ہیں، لیکن مشکلات اور تلخ تجربات کے آگے قربانی کے جذبے کو خیرباد کہہ کر ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ پس ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے ان لوگوں کی نظریاتی بنیادوں کو مستحکم کیا جائے تاکہ وہ خدا کی خوشنودی کے پیشِ نظر نظریہ توحید کی سربلندی اور فلاحِ انسانی کے لئے فداکاری و اخلاص کے جذبہ کے ساتھ سرگرمِ عمل ہوں۔ ان حقائق کی رو سے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ خدا اور اس کے ابدی پیغام کی طرف دعوت دینے کے سلسلے میں ہم اپنے لائحہ عمل پر نظرِ ثانی کریں۔

حکمتِ عملی کا اسلامی نظریہ

واضح رہے کہ جب ہم طریقہ کار اور حکمتِ عملی میں تبدیلی اور تجدیدِ نظر کی بات کرتے ہیں تو اس سے یہ مراد نہیں کہ ہم ساتھ ساتھ خدا کی طرف سے عطا شدہ نظریہ اسلام میں بھی تبدیلی کے خواہاں ہوں۔ لہٰذا یہاں اسلامی نظریے اور اس نظریے کی طرف دعوت کے اسالیب کے درمیان موجود فرق کو سمجھنے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ نظریے سے مراد خود اسلام ہے جو ایک اٹل اور ناقابلِ تغیر حقیقت ہے اس کے بارے میں یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ اسے کسی اصلاح و

تجدید کی ضرورت ہوگی۔★ کیونکہ اسلام (جیسا کہ ہمارا عقیدہ ہے) اعلیٰ ترین آسمانی پیغام اور خاتم الادیان ہے جسے خداوندِ عالم نے ہر قسم کے زمان و مکان میں انسان کے لئے ایک جامع نظامِ حیات کی حیثیت سے پسند فرمایا ہے۔ اس الٰہی نقطہء نظر سے اسلام زمان و مکان سے مافوق حقیقت ہے' ایک ایسا ابدی اصول ہے جس میں تغیر و تبدل کی گنجائش نہیں۔

رہا اسلام کے اس ابدی اصول کی طرف دعوت دینے کا طریقہء کار تو اس سلسلے میں زمان و مکان کے تقاضوں کے مطابق تجدد و تبدل اور بہتر سے بہتر راستوں کو اپنانا ضروری ہے۔ اور اس بات کی گنجائش نہیں کہ ہم فکری و عملی لحاظ سے فقط گزشتہ کو ملحوظ رکھیں یعنی لکیر کے فقیر بنے رہیں اور بہتر سے بہتر راہوں کو تلاش نہ کریں۔ ماضی کے حصار میں بند رہنے کی یہ روش ان اہم اسباب میں سے ہے جن کی بناء پر ہم اسلام کے حوالے سے اپنی اصلاحی ذمہ داریوں کو جاری رکھنے کے قابل نہ رہے۔

خلاصہ یہ کہ دعوت کے عملی اسالیب کا خارجی سماجی عوامل اور حالات کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے لہٰذا ان اسالیب کو خارجی حالات و عوامل کے تقاضوں کے مطابق ہونا چاہئے۔

دعوت کے اسالیب کا خارجی ماحول اور اس معاشرے کے ساتھ گہرا رابطہ ہے جس کے درمیان رہ کر ہم اپنی سرگرمیاں انجام دینا چاہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ معاشرہ ایک ہی حالت پر برقرار نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے ہم اس کے بارے

★ یہاں محمد محمد حسین کی کتاب "حصوننا مهددة من الداخل" کا مطالعہ سود مند ہے۔ کیونکہ موصوف نے عالمِ اسلام کی تعمیرِ نو اور ترقی کی دعوت دیتے ہوئے ان استعماری کوششوں پر روشنی ڈالی ہے جن کا مقصد اسلام کے بنیادی اصولوں کو ختم کرنا ہے۔

میں ایک ہی قسم کا غیر لچکدار طریقۂ کار اختیار نہیں کرسکتے۔

پس ہماری بحث کا بنیادی نکتہ یہ ہوا کہ امت اور معاشرہ قابلِ تغیر ہے لیکن اسلام قابلِ تغیر نہیں۔

آج کا معاشرہ اپنی فکری و اخلاقی سطح کے لحاظ سے نیز ذاتی و اجتماعی خواہشات' اقتصادی صورتِ حال اور دیگر تفصیلی حالات کی رو سے یقیناً کل والے معاشرے سے مختلف ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں ایک داعی و مبلغ کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ آج کے لوگوں کے ساتھ وہ رویّہ رکھے جو کل والوں کے ساتھ رکھتا تھا۔ بلکہ اسے ان تمام حالات اور تبدیلیوں کو مدّ نظر رکھنا ہوگا جو امت کو گھیرے ہوئے ہوں۔ کیونکہ ان ہی تغیرات اور تبدیلیوں کی بنیادوں پر امت کی تخلیقی صلاحیتوں کو پہچانتے ہوئے ایک کامیاب لائحہ عمل مرتب کیا جاسکتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ عملی اسالیب اپنانے کے مسئلے میں جمود کو ترک کیا جائے اور گزشتہ لوگوں کے اسالیبِ عمل پر اڑے رہنے سے احتراز کیا جائے کیونکہ ان کا دور گزر چکا اور وہ حالات و مسائل اب بدل چکے جن کا انہیں سامنا تھا۔

اسالیبِ عمل کے بنیادی محور

ہم اس لئے علم حاصل کرتے ہیں تاکہ اسے عملی جامہ پہنا سکیں' اس لئے نہیں کہ اسے اپنے سینوں میں محفوظ رکھیں یا ذہنی معلومات حاصل کرکے اپنی علمی اہلیت کا ثبوت دیں۔

انبیاء علیہم السلام پہلے عمل کرکے دکھاتے تھے پھر اپنے علم کا ثبوت دیتے تھے ان کے علم کا مقصد عمل ہوتا تھا۔ وہ عالمِ بے عمل نہ تھے۔ اس واضح حقیقت

کی روشنی میں ہم بعض سوالات اور ان کے جوابات پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ (سوالات یہ ہیں)

عمل سے کیا مراد ہے؟

ہم کیسے عمل کریں؟

عمل کے طریقے کیا ہیں؟

زمانے اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کے مطابق ہم ان عملی طریقوں میں کیسے تبدیلی لا سکتے ہیں؟

ممکن ہے ابتداء میں ان سوالات کا جواب دینا مشکل ہو۔ اور ہم اس فکری تربیت، پختگی اور زود فہمی کے حامل نہ ہوں جن کی بدولت ان سوالات کے جوابات سے آگاہ ہو سکیں۔ لیکن ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم عملی اسالیب میں تغیر و تبدل کے مسئلے پر غور کریں اور ان سوالات کا بہتر سے بہتر جواب ڈھونڈنے میں ہمیشہ مشغول رہیں تاکہ معلوم ہو کہ سب سے بہتر اور سب سے زیادہ جامع اسلوبِ عمل کونسا ہے؟ اس اہم سوال کا جواب دینے کی فکری کوشش اور بہتر عملی اسالیب پر غور کے دوران ہمیں چاہئے کہ خالص ریاضیاتی طرزِ فکر سے کام نہ لیں بلکہ لازم ہے کہ ہم ریاضیاتی سوچ اور اجتماعی و معاشرتی طرزِ فکر (جو مذکورہ سوال کا جواب پانے کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے) کے درمیان فرق کو خوب اچھی طرح سمجھ لیں۔ پس اس مقام پر ہم دو قسم کے طرزِ فکر سے آشنا ہوئے۔

ایک معاشرتی طرزِ فکر اور دوسرا ریاضیاتی طرزِ فکر۔

ریاضیاتی طرزِ فکر سے مراد وہ طرزِ فکر ہے جو کسی حقیقت کو اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک اس کے تمام پہلو محکم اور ناقابلِ تردید دلائل و براہین

کے ساتھ ثابت نہ ہو جائیں تاکہ شک اور بحث کی گنجائش ہی نہ رہے۔

مثلاً جب ریاضی کے کسی مسئلے کا نتیجہ ۲×۲=۴ کے فارمولے کی بنیاد پر واضح ہو جائے تو یہ ایک ریاضیاتی حقیقت کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے گا لیکن اگر اس کی صحت پر واضح دلیل قائم نہ ہو سکے تو اس کو ریاضی دانوں کے نزدیک مسلمہ حیثیت حاصل نہ ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ ریاضیاتی سوچ ذاتی طور پر ایک ایسا علم ہے جس میں شک و تردید اور بحث کی گنجائش نہ ہو اور اس کے تمام پہلو واضح و روشن ہوں۔ لیکن معاشرتی طرزِ فکر اس سے بالکل مختلف ہے اس میں ریاضی کے فارمولوں کی طرح اٹل اور ناقابلِ شکست و ناقابلِ اختلاف فارمولوں کے ساتھ کسی اصول کو ثابت کرنا مشکل ہے اس سلسلے میں ہم درجِ ذیل مثال پیش کرتے ہیں۔

"جب کورس کی کسی کتاب کو بدل کر دوسری کتاب کو پڑھانا مقصود ہو تو ہم ریاضی کے فارمولوں کے تحت اس بات کی اٹل دلیل طلب نہیں کر سکتے کہ اگر یہ کتاب نہ پڑھائی جائے تو (بقول اہلِ منطق) اجتماع نقیضین (امرِ محال) لازم آئے گا۔ لیکن اگر پڑھائی جائے تو نہیں۔"

پس ریاضی کے فارمولے معاشرتی امور کو ثابت کرنے کے لئے کارگر نہیں ہو سکتے کیونکہ معاشرتی امور کی بنیادیں تخمینے پر استوار ہوتی ہیں۔ دنیا اور اس کے مسائل کے بارے میں آگاہی، تجربے اور معلومات سے اس قسم کے تخمینے کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر معاشرتی اصلاح کا عمل دنیا اور اس کے حالات سے آگاہی نیز تجربات کے حصول کی دعوت دیتا ہے۔ اسالیبِ عمل کے بارے میں غور و فکر کے لئے وہ طریقہ اور فارمولا کارگر نہیں جسے ہم ریاضی کے

ایک پیچیدہ مسئلے کو حل کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

بنابرایں یہ ممکن نہیں کہ ہم کمرے میں بیٹھ کر آنکھیں بند کرکے معاشرے میں کام کرنے کے اسالیب کا فیصلہ کریں۔ ہاں یہ طریقہ ریاضی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے بہترین راہ ہے کیونکہ ریاضی کے اصولوں کی صحت باہر کی دنیا پر موقوف نہیں لیکن اجتماعی سرگرمیاں (عام طور پر) لوگوں کے باہمی روابط' دنیا میں رونما ہونے والے حالات و مسائل اور دوسروں کے تجربات سے آگاہی نیز اپنے حالات کا دوسرے لوگوں کے حالات سے موازنہ کرنے کے نتیجے میں وجود میں آتی ہیں۔ یوں ہمارے اندر معاشرتی امور کا تخمینہ لگانے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ معاشرتی امور میں صحیح لائحہ عمل کی پہچان کے لئے ضروری ہے کہ ہم ریاضی دانوں والی سوچ سے کام نہ لیں بلکہ سماجی تخمینے کی صلاحیت سے استفادہ کریں اور معلومات و تجربات میں افزائش کے ذریعے اذہان میں تخمینے کی طاقت پیدا کرنے کے بارے میں غور و فکر کریں۔

یادداشت

786/1 2685

یادداشت

یادداشت

ہماری مطبوعات

- درسِ قرآن
- مکتبِ تشیع اور قرآن
- اسرارِ نہج البلاغہ
- نہج البلاغہ سے چند منتخب نصیحتیں
- مذہب اہلِ بیتؑ
- شیعیت کا آغاز کب اور کیسے
- فلسفۂ امامت
- اہلِ بیتؑ آیۂ تطہیر کی روشنی میں
- ائمہ سیریز (مختصر سیرتِ معصومینؑ)
- سوانح حیات حضرت فاطمۃ الزہراؑ
- اہلِ بیتؑ کی زندگی مقاصد کی ہم آہنگی زمانہ کی نیرنگی
- فدک تاریخ کی روشنی میں
- آمریت کے خلاف ائمۂ طاہرینؑ کی جدوجہد
- صدائے حضرتِ سجادؑ
- سوانح حیات حضرت امام حسینؑ
- تفسیرِ سیاسیِ قیامِ امام حسینؑ
- اثباتِ وجودِ خدا
- ۲۰ر جواب
- آسان عقائد (دو جلدیں)
- تعلیمِ دین سادہ زبان میں (دو جلدیں)
- حسینؑ شناسی
- انقلابِ حسینؑ پر محققانہ نظر
- فکرِ حسینؑ کی الف ب

- تفسیرِ عاشورا
- عزاداری کیوں؟
- عاشورا اور خواتین
- پیامِ شہیداں
- ہمارا پیام
- آزمائش
- درسِ انقلاب
- اسلامی تحریک قرآن وسنّت کی روشنی میں
- شناختِ استکبار
- عوامی حکومت یا ولایت فقیہ
- کتاب المومن
- خاندان کا اخلاق
- اِزدواج دراسلام
- اسلام میں خواتین کے حقوق
- آسان مسائل
- عورت پردہ کی آغوش میں
- اسلامی اتحاد مسلکِ اہلِ بیتؑ کی روشنی میں
- مادیت و کمیونزم
- خاک پر سجدہ مقصد، اہمیت، حقیقت
- مسجد، مقصد، تقاضہ، ذمّہ داریاں
- عظیم لوگوں کی کامیابی کے راز
- دعائے افتتاح — دعائے ندبہ
- زیارتِ جامعہ

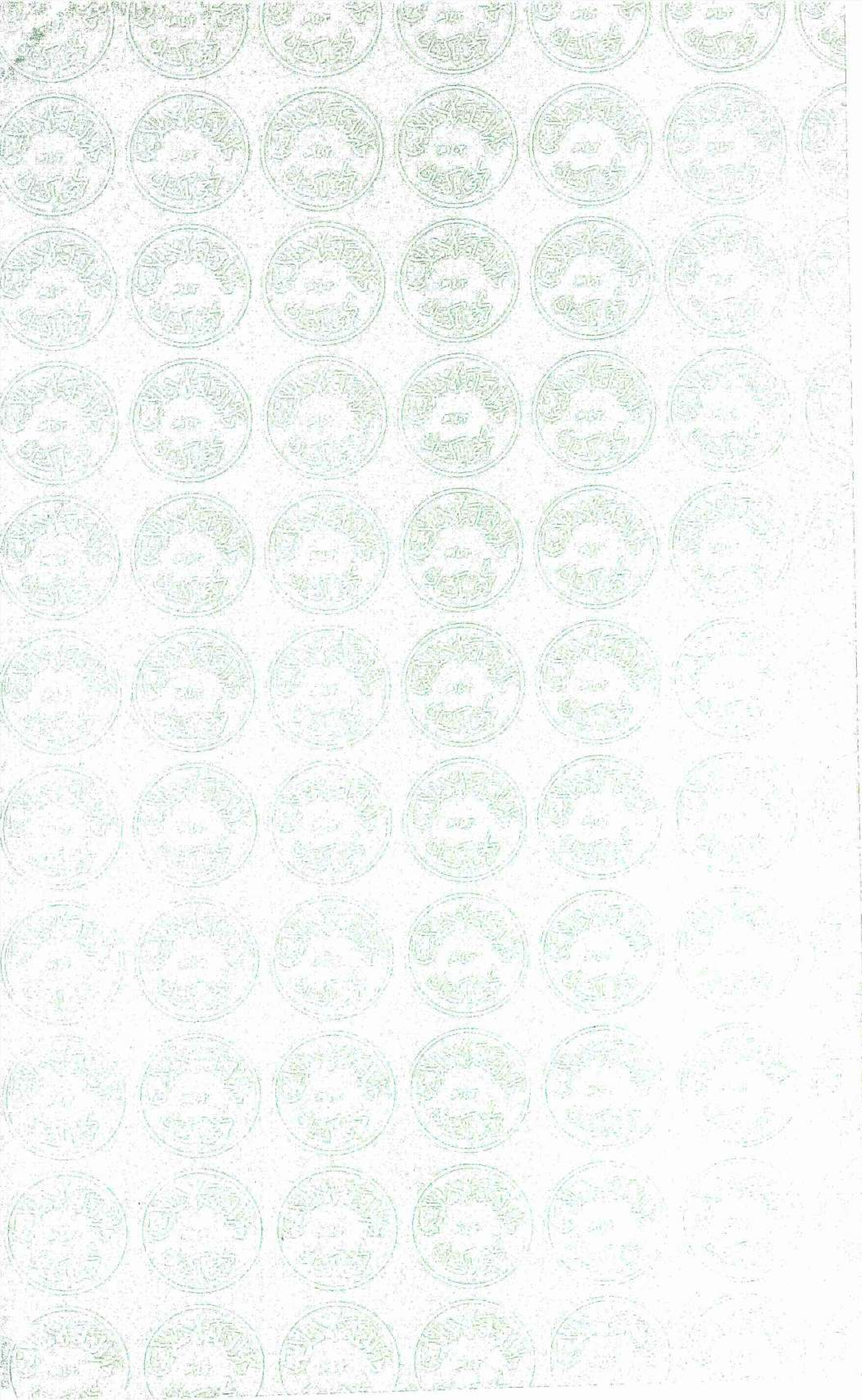

قیام و شخصیت حضرت ابی عبداللہ الحسینؑ سے متعلق گرانقدر مطبوعات

قیام عاشورا	امام خمینیؒ
مجالس امام حسینؑ	آیۃ اللہ العظمیٰ شیخ جعفر شوستری
فلسفۂ عزاداری و قیام امام حسینؑ	آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای
رسالۂ خواص	آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای
مقتل بحر العلوم	آیۃ اللہ العظمیٰ سید محمد تقی بحر العلوم (زیر طبع)
قیام امام حسینؑ اجتماعی اور سیاسی تجزیہ	آیۃ اللہ العظمیٰ سید محمد حسین فضل اللہ (زیر طبع)
حسینؑ شناسی	آیۃ اللہ محمد یزدی
آداب اہل منبر	آیۃ اللہ العظمیٰ مرزا حسین
انقلاب حسینؑ	آیۃ اللہ مہدی شمس الدین
حماسۂ حسینیؑ	استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ
معجم کتب مؤلفین مقالہ نگاران قیام امام حسینؑ	سید علی شرف الدین موسوی
عزاداری کیوں ؟	سید علی شرف الدین موسوی
قیام امام حسینؑ کا جغرافیائی جائزہ	سید علی شرف الدین موسوی
اصول عزاداری	سید علی شرف الدین موسوی
تفسیر عاشورا	سید علی شرف الدین موسوی
مثالی عزاداری	سید علی شرف الدین موسوی
اسرار قیام امام حسینؑ اور ہماری ذمہ داریاں	سید علی شرف الدین موسوی
تاریخ امام حسینؑ	بقلم محقق علامہ ہاشم معروف حسنی
صحیفۂ کربلا	حجۃ الاسلام والمسلمین علی نظری منفرد
قیام امام حسینؑ غیر مسلم دانشوروں کی نظر میں	تنظیم و ترتیب دار الثقافۃ الاسلامیۃ
حیات امام حسینؑ	محمد باقر شریف قریشی
امام حسینؑ اور انکا قیام	اسد حیدر
زندگانی حضرت امام حسینؑ	رسول محلاتی
قیام امام حسین۔ اسباب و نتائج	سید علی اکبر قرشی